باسمہٖ تعالیٰ

سلسلۂ معارف القرآن کی آخری کڑی

جس میں

مکافاتِ عمل، موت، قبر، برزخ، حشر، نشر، قیامت، دوزخ اور جنت سے متعلق قرآنی حقائق کو سامنے لایا گیا ہے!

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب ———— جہان فردا

مصنف ———— علامہ غلام احمد پرویز

ناشر ———— طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور (۵۴۶۶۰)

طابع ———— دوست ایسوسی ایٹس

مطبع ———— ایچ۔ وائی پرنٹرز، لاہور

ایڈیشن ———— اول، اکتوبر ۱۹۶۰ء
دوم، اگست ۱۹۷۵ء
سوم، دسمبر ۱۹۸۷ء
چہارم، نومبر ۱۹۹۴ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی شائع کردہ کتب کی جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولاتِ جہانِ فردا

ساتواں باب ۷

یومِ الدّین

آٹھواں باب

عذاب ۔ یعنی ہلاکت وتباہی

نواں باب

دنیاوی زندگی میں اعمال کی جزا اور سزا

دسواں باب

دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب

گیارھواں باب

ثواب ـــــــ نجات

بارھواں باب

آخرت کا تصوّر

ایمان بالآخرت

قیامت

پندرہواں باب

برزخ

سولہواں باب

انقلابِ عظیم کی تفصیلات

سترہواں باب

شفاعت

اٹھارہواں باب

اُخروی عذاب کا تعارف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

پیش لفظ

میری زندگی کا مقصد و منتہیٰ، قرآنِ کریم کو سمجھنا، اور جو کچھ میں سمجھ سکوں اُسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔ سلسلۂ "معارف القرآن" میری اسی کوشش کا ایک گوشہ ہے جسے میں نے، آج سے تیس سال پہلے شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی اس وقت تک حسبِ ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) من و یزداں ــــ خدا کا قرآنی تصور۔ خدا اور بندے کا تعلق۔

(۲) ابلیس و آدم ــــ آدم، انسان، ابلیس، ملائکہ، وحی و رسالت کے متعلق قرآنی تصورات۔

(۳) جوئے نور ــــ حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرامؑ کا تذکرۂ جلیلہ۔

(۴) برقِ طور ــــ صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور مستبد قوتوں کے نمائندوں کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل۔

(۵) شعلۂ مستور ــــ حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات۔

(۶) معراجِ انسانیت ــ صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کی سیرتِ طیبہ، قرآن کے آئینے میں۔

(۷) انسان نے کیا سوچا؟ ــــ وحی کی روشنی کے بغیر، تنہا عقلِ انسانی نے، زندگی کے اہم مسائل کے متعلق کیا سوچا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

(۸) اسلام کیا ہے ــــ قرآنِ کریم کے تجویز کردہ دین کا عملی نظام۔

ان کے علاوہ کتاب التقدیر، لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں سمجھنا چاہیئے جو میرے نزدیک، مطالبِ فرقان کو براہِ راست سمجھنے کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی کا تعلق حیاتِ آخرت سے تھا۔ اس کی اہمیت کا مجھے خود بھی احساس تھا اور میری قرآنی فکر سے وابستگی رکھنے والے احباب کے پیہم تقاضے اس احساس کو اور بھی شدید کئے جاتے تھے۔ لِلّٰہِ الحمد کہ میں اس فریضہ کی ادائیگی سے بھی سبکدوش ہو رہا ہوں۔ وَذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ!

جیسا کہ ظاہر ہے، اُخروی زندگی اور اس کے تضمنات کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے، اس کی کنہ و حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر، عالمِ محسوسات کے مظاہر کی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ قرآنِ کریم نے ان حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کیا ہے ــــ اور اسی انداز سے یہ بیان بھی کئے جا سکتے تھے۔ تشبیہات کو انسانی علم کی عام سطح اور ان پر غور کرنے والے کی فکری صلاحیت کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جن حقائق کو اس طرح سمجھا جائے ان کے مفہوم کو نہ تو حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کے لئے سند و حجت بن سکتے ہیں۔ میں نے قرآنِ کریم میں بیان کردہ مجرّد حقائق کو اسی انداز سے سمجھا ہے اور میری قرآنی فکر کی وہی حیثیت ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی قرآنی فکر کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے قریب آئیں اور اس پر از خود غور و فکر کریں۔ وہ اس طرح تدبّر فی القرآن سے اگر کسی ایسے نتیجہ پر پہنچیں جو میری فکر سے مختلف ہے تو نہ صرف یہ کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ میں ان حقائق پر دوبارہ غور کروں گا۔

مبدا رفطرت کی فیض گستری نے 'قرآنی فکر کے عام کرنے میں' میری کوششوں کو جس قدر بار آور کیا ہے' اس کے لئے میں ہر سانس میں بدرگاہِ ربّ العزّت سجدہ ریز ہوں۔ جب میں نے اس آواز کو پہلے پہل بلند کیا ہے تو مجھے کہیں' کوئی' اپنا ہم نوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور آج 'بفضل ایزدی' شاید ہی کوئی قریہ یا دیار ایسا ہو جہاں اس فکر کے ہمنوا موجود نہ ہوں۔ اسی کا اثر ہے کہ ہمارا مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ 'علیٰ وجہ البصیرت' قرآنی حقائق کے قریب تر آرہا ہے۔ یہ سب خدا کی اس کتابِ عظیم کا اعجاز ہے۔

میں اب زندگی کی ندی میں اس مقام پر پہنچ رہا ہوں جہاں اگلا کنارہ نزدیک تر نظر آرہا ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن بھی اسی مقصد کی تکمیل میں گذر جائیں جسے میں نے اپنا مقصودِ حیات قرار دے رکھا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

وَالسَّلَام!

پرویز

۲۵ بی' گلبرگ ۲۔ لاہور

اکتوبر ۱۹۶۹ء

باب اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قانون مکافات عمل

دین کا سارا نظام، قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے — اور حقیقت تو یہ ہے کہ سارا نظامِ کائنات ہی اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ:۔

(۱) خدا نے ہر کام کا ایک متعین نتیجہ مقرر کر رکھا ہے۔ مثلاً اگر آگ پر پانی کی دیگچی رکھ دی جائے تو کچھ وقت کے بعد پانی گرم ہو جائے گا اور پھر کھولنے لگے گا یا اگر ایک خاص مقدار میں سنکھیا کھا لیا جائے تو انسان مر جائے گا۔ یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔

(۲) انسان کا ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔

یہ قانون اٹل ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۴۸/۲۳ ؛ ۱۷/۷۷؛ ۳۵/۴۳)۔ اسی کو قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸) کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ پیمانے۔ انہی پیمانوں کو عام اصطلاح میں قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے۔

جب یہ کہا جائے کہ خدا کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی تو عام ذہنی سطح کے لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس سے خدا کے قادرِ مطلق ہونے کی نفی ہوتی ہے۔ وہ اسی صورت میں قادرِ مطلق قرار پا سکتا ہے جب یہ سمجھا جائے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن جب اس نے خود اپنی مشیت اور اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ قوانین وضع کر دیئے اور اس کے بعد کہہ دیا کہ یہ قوانین اٹل ہیں ہم ان کے خلاف نہیں کریں گے، تو اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف نہیں آتا۔ اس نے خود اپنے اوپر ایک پابندی عائد کی ہے جسے وہ توڑ تو سکتا ہے لیکن وہ اسے توڑتا نہیں۔ اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف اس صورت میں آسکتا تھا کہ کوئی دوسرا اُس پر کوئی پابندی عائد کر دیتا۔ خود عائد کردہ پابندی کا نہ توڑنا تو اصول پرستی کہلاتا ہے۔ اسی کو خدا نے "اپنے وعدے" سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۲۸/۱۳) خدا کا وعدہ حق ہے۔ اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳/۸) خدا وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا حتیٰ کہ اس نے بعض مقامات پر اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندی کو اس قسم کے الفاظ میں بھی بیان کیا ہے کہ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۱۲) اس نے اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے یا مثلاً كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۱۰۳) مومنین کو تباہی سے محفوظ رکھنا ہم پر فرض ہے۔ مقصد ہمارے کہنے کا یہ ہے کہ جو پابندیاں خدا نے خود اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں، ان سے اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف نہیں آتا بلکہ یہ تو خود اس کے قادرِ مطلق ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے جو قوانین اس نے مقرر کر رکھے ہیں، ان کے غیر متبدل ہونے سے خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف نہیں آتا۔ اس کے اپنے مقرر کردہ قوانین ہیں جن میں وہ تبدیلی نہیں کرتا — قانونِ مکافاتِ عمل بھی اس کا مقرر کردہ اٹل قانون ہے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر ایک کو اس کے کام کا نتیجہ مل جائے (۴۵/۲۲ ؛ ۵۳/۳۱)۔

طبیعی کائنات میں قانون کی کارفرمائی

طبیعی کائنات کا یہ محیر العقول نظام، اسی قانونِ مکافات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ انہیں علم اصطلاح میں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ کائنات کی کسی شے کو ان قوانین کی اطاعت سے مجالِ سرتابی نہیں (۴۹ — ۱۶/۵۰)۔ چونکہ یہ سوال ہمارے زیرِ نظر موضوع سے متعلق نہیں — ہمارا موضوع صرف انسانی دنیا سے متعلق ہے — اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔

انسانی دُنیا میں قانونِ مکافات

انسانی زندگی کے دو حصّے ہیں ـــ ایک حصّہ اس کی طبیعی زندگی کا ہے جو خدا کے مقرر کردہ طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ اس میں انسان اور حیوان ایک سطح پر ہوتے ہیں ـــ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت، بیماری اور بالآخر موت۔ سب طبیعی قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اس میں انسان کے اختیار و ارادہ اور علم کی بھی شرط نہیں۔ (مثلاً) ایک شخص آگ میں انگلی ڈالتا ہے اس کی انگلی جل جائے گی اور اسے سخت تکلیف ہوگی۔ اس کے لئے:

(۱) یہ ضروری نہیں کہ انسان کو اس کا علم ہو کہ آگ میں انگلی جل جاتی ہے تو انگلی جلے اور اگر اس کو اس کا علم نہ ہو تو انگلی نہ جلے۔

(۲) نہ ہی یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے ارادے اور فیصلے سے انگلی ڈالے تو انگلی جلے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس کی انگلی زبردستی آگ میں ڈال دے تو انگلی نہ جلے۔

اور یہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ انگلی میری جلے اور درد کسی کو ہونے لگے۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی میرے درد میں سے کچھ حصّہ لے لے اور میری تکلیف میں تخفیف ہو جائے۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کسی کی سفارش پر درد مٹ جائے یا میں رشوت دے کر نجات حاصل کر لوں۔ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے وہ جل جاتی ہے اُسی نے یہ قانون بھی مقرر کر دیا ہے کہ جلی ہوئی انگلی پر فلاں دوائی لگائی جائے تو اسے آرام آجائے گا۔ یعنی جس نے خدا کے ایک قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنی انگلی جلالی ہے اب اسے خدا کے دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ (اسے انابت الی اللہ کہا جاتا ہے)۔ پہلے قانون کی خلاف ورزی کے نتیجے میں درد کا پیدا ہونا اگر عدل ہے تو خدا کا دوسرا قانون جس کی اطاعت سے اس درد سے نجات مل سکتی ہے اس کی رحمت ہے۔ (رحم MERCY) کا یہی تصوّر قرآنی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عدل اور رحمت سے متعلق یہ دونوں قوانین ہر انسان کے لئے یکساں ہیں۔ ان میں مومن و کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ اس باب میں تو بلکہ انسان اور حیوان میں بھی کوئی تفریق نہیں۔ طبیعی قوانین کا سب پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔

اِنسانی زندگی

لیکن انسان کی زندگی محض طبیعی (یا حیوانی) زندگی نہیں۔ اس کی ایک زندگی، حیوانی سطح سے اوپر، انسانی زندگی بھی ہے۔ اس مقام پر ہمارے سامنے دو نظریاتِ حیات آتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی ہے تو طبیعی زندگی ہی، لیکن چونکہ یہ مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے اس لئے اس کی زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ یعنی اس نے معاشرہ (یا سوسائٹی) کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن سے معاشرہ کے مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور سب امن وچین اور خوشحالی وفارغ البالی کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد کے لئے سوسائٹی کچھ قوانین وضوابط مرتب کرتی ہے جن کی پابندی سب افراد کے لئے ضروری ہے۔ جو ان قوانین کو توڑتا ہے معاشرہ اسے مجرم قرار دے کر، قانون شکنی کی سزا دیتا ہے اسے معاشرہ کا نظامِ عدل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی درحقیقت قانونِ مکافاتِ عمل ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس میں اور طبیعی قوانین میں کچھ فرق ہے اور وہ فرق بڑا اہم ہے۔ معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے یہ ہوسکتا ہے کہ

(۱) ایک شخص قانون شکنی کرے لیکن نظامِ عدل کی گرفت میں نہ آئے۔

(۲) گرفت میں آئے بھی تو کسی نہ کسی طرح اپنے جرم کی سزا پانے سے بچ جائے ـــــ رشوت سے، سفارش سے، فریب دہی سے .... (وغیرہ وغیرہ)۔

جو شخص اس طرح قانون شکنی کی سزا سے محفوظ رہ جائے، اس میں اور اس شخص میں جس نے قانون شکنی نہیں کی تھی، کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں، سوسائٹی کی نگاہ میں یکساں "مملکت کے پُرامن شہری" ہوتے ہیں۔ اور جب معاشرہ میں قانون شکنی عام ہوجائے، تو قانون شکن، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو قانون کی پابندی کرتے ہیں، زیادہ مزے میں رہتے ہیں کیونکہ یہ جائز اور ناجائز ہر طریق سے مفاد حاصل کرلیتے ہیں اور عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

دوسرا نظریۂ زندگی

اس کے برعکس، دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ اس میں حیات

طبیعی کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے ـــ اچھے کام کا اچھا اثر۔ بُرے کام کا بُرا اثر ـــ اس اثر (یا نتیجہ) سے انسان اپنی کاریگری یا پُرکاری سے بچ نہیں سکتا۔ اس کے لئے نہ کسی دیکھنے والے کی ضرورت ہوتی ہے نہ گرفتار کرنے والے کی حاجت۔ نہ کسی دنیاوی عدالت کے فیصلے کی ضرورت پڑتی ہے نہ اس فیصلہ پر عمل کرانے والی انتظامیہ کی حاجت۔ یہ نتیجہ اسی طرح از خود مرتب ہو جاتا ہے جس طرح آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے۔ انسان کی طبیعی موت کے ساتھ اس کی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کی ذات ان اثرات کو لئے ہوئے جو اس پر عمر بھر مرتب ہوتے رہے تھے' مرنے کے بعد' آگے بڑھتی ہے اور جس قسم کے اثرات کا مجموعی پلڑا بھاری ہو اس کے مطابق اس کا مستقبل متشکل ہوتا ہے۔ اس نظریۂ زندگی کا نام دین ہے۔

دین بھی ایک معاشرہ متشکل کرتا ہے کیونکہ معاشرہ سے باہر (ایک فرد کی تجریدی زندگی میں ـــ یعنی ایسی زندگی میں جس میں اسے کسی دوسرے انسان سے معاملہ نہ پڑے) ـــ اچھے اور بُرے کام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین' انسانی زندگی کے لئے جو قوانین دیتا ہے ان کا اثر بھی معاشرہ پر پڑتا ہے۔ لیکن ان کا اثر صرف معاشرہ پر ہی نہیں پڑتا۔ ان کا اثر خود اس فرد کی ذات پر بھی پڑتا ہے جو ان کا اتباع کرتا ہے یا ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مثلاً

(۱) ایک شخص کسی کے ہاں چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کا اُسے موقعہ نہیں ملتا۔ یہ شخص معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے مجرم نہیں قرار پائے گا لیکن اس کی اس نیّت (ارادہ) کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جائے گا۔

(۲) وہ شخص چوری کرتا ہے لیکن معاشرہ کے نظامِ عدل کی گرفت میں نہیں آتا یا کسی اور طریق سے سزا سے بچ جاتا ہے۔ اسے معاشرہ کی رُو سے اس کے کئے کی سزا نہیں ملی' لیکن اس کی ذات پر اس کا اثر مرتب ہو جاتا ہے۔

(۳) اگر اس شخص کو اس کے جرم کی سزا مل جائے تو معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے وہ اس کے بعد اس جرم کا مجرم متصوّر نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوا تھا' اس سزا سے وہ اثر زائل نہیں ہوتا۔

(۴) اسی کی ذات پر مرتب شدہ اثر' اس قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے سے زائل ہوگا جو اس

مقصد کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

(۵) اگر اس نے اِس طرح اُس اثر کو زائل نہیں کیا، تو وہ اثر مرنے کے بعد اس کے ساتھ جائے گا۔

اس سلسلہ میں دو اور باتوں کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ایک یہ کہ انسانی ذات پر صرف انہی اعمال کا اثر مرتب ہوگا جن کے صحیح یا غلط ہونے کا اسے علم تھا۔ اگر ایک شخص تک یہ قانون پہنچا ہی نہیں یا اس کی ذہنی سطح ایسی نہیں جس سے وہ ان امور کو سمجھ سکے، تو اس کی ذات پر ایسے اعمال کا اثر مرتب نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے ایسا کام (صحیح یا غلط) مجبوراً کرایا گیا ہے تو پھر بھی اس کا اثر اس کی ذات پر مرتب نہیں ہوگا۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنے انہی اعمال کا ذمہ دار ہے جنہیں اس نے اپنے علم اور ارادے سے سرانجام دیا تھا۔

اب آپ افراد سے آگے بڑھ کر معاشرہ (یا اقوام) کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ دین نام ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق تمام نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرنے کا۔ فطرت کی قوتیں، خدا کے مقرر کردہ طبیعی قوانین کے مطابق عمل کرنے سے مسخر ہوں گی۔ اور ان کے صحیح استعمال کے لئے ان قوانین کی ضرورت ہوگی جنہیں ہم نے "انسانی زندگی" سے متعلق بتایا ہے۔ انہیں ہم (طبیعی قوانین سے متمیز کرنے کے لئے) مستقل اقدار کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) جو قوم طبیعی قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت نہیں کرتی اس کی دنیاوی زندگی خوشحال نہیں ہو سکتی۔ اور جب اس نے فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کیا تو انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا، وہ قوم دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ اس قوم کی یہ زندگی بھی تاریک ہوگی اور مستقبل کی زندگی بھی تاریک۔

لیکن اگر اس قوم میں ایسے افراد ہیں جو اس نہج زندگی سے مطمئن نہیں اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ نظامِ معاشرہ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے وہ دین کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، تو ان افراد کی موجودہ دنیا کی زندگی تو (بالعموم) مصائب و تکالیف میں گزرے گی لیکن ان کی اگلی زندگی تابناک ہوگی۔

(۲) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہیں کرتی، اسے اس دنیا میں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہو جائیں گی لیکن اس کے افراد کی اُخروی زندگی تاریک ہوگی۔

ہاں اگر اس قوم میں ایسے افراد ہیں جو نظامِ معاشرہ کو مستقل اقدار پر متشکل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان افراد کی حیاتِ آخرت درخشندہ ہوگی۔

(۳) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتی ہے، اس کی حال کی زندگی بھی درخشندہ ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی تابندہ۔ یہ قوم اسلامی نظام کی حامل کہلائے گی۔ البتہ ان میں جو افراد ایسے ہوں گے جن پر اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنا ناگوار گزرے گا اور وہ اس میں کرہاً دن گذار رہے ہونگے یا جو اس نظام کو الٹنے کی کوشش کریں گے، ان کی آخرت کی زندگی تاریک ہو گی۔

قرآنِ کریم نے قانونِ مکافاتِ عمل کے ان اجتماعی نتائج کو بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(۱) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے ترکہ پر چند دن کے لئے سامانِ زیست سے متمتع ہوتی رہے، لیکن آخر الامر وہ تباہ ہو جائے گی۔

(۲) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر تو کر لیتی ہے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہیں کرتی، اسے مفادِ عاجلہ حاصل ہو جائیں گے لیکن ان کا نظام بھی آخر الامر بگڑ جائے گا اور وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔

اس قسم کی تباہی کو وہ السّاعۃ سے تعبیر کرتا ہے جس سے مراد کسی قوم کی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا ہونے کے ہیں۔ اس انقلاب کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً

(۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس قوم کے غلط نظام کی وجہ سے اس میں اندرونی خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے اس میں حوادثِ ارضی و سماوی کے مقابلہ اور مدافعت کی سکت اور صلاحیت نہیں رہتی اور یوں وہ قوم رفتہ رفتہ آمادہ بہ زوال ہو کر آخر الامر یا تو بالکل مٹ جاتی ہے اور یا اپنی قومی حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔

(۲) یا کوئی دوسری قوم، جو اس قوم سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے، اسے اپنا مغلوب و محکوم بنا لیتی ہے۔ اس طرح اس کا قومی تشخص ختم ہو جاتا ہے۔

اگر یہ طاقتور قوم، دین کے صحیح نظام کی حامل ہے، تو وہ سابقہ قوم کے غلط نظام کی جگہ مستقل اقدار کا صحیح نظام متشکل کر دیتی ہے اس طرح اس سابقہ قوم کے افراد کو احترامِ آدمیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ نئی قوم محض قوت ہی میں بالادست ہے اور نظام ان کا بھی انسانیت سوز ہے تو پھر یہ قوم، سابقہ

قوم کے افراد کا کچومر نکال دیتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد ان کی اپنی حالت بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم، ان تباہ ہونے والی قوموں کی زندگی کو (دنیاوی) جہنم سے تعبیر کرتا ہے اور جو معاشرہ مستقل اقدار کے مطابق متشکل ہوتا ہے اسے جنّتی معاشرہ کہہ کر پکارتا ہے۔ یہاں کی جنت اور جہنم کی زندگی، آگے بڑھ کر، اُخروی جنت اور جہنم کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس زندگی کو قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے کیونکہ اس کی کنہ وحقیقت کا ادراک، انسانی شعور کی موجودہ سطح پر ممکن نہیں۔

یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک طائرانہ سا تصور جسے قرآنِ کریم نے بڑی شرح وبسط سے پیش کیا ہے۔ اس کے لئے وہ ہماری اصطلاحات ہی استعمال کرتا ہے (کیونکہ قرآن بہرحال انسانوں کی زبان ــ عربی ــ میں نازل ہوا ہے)۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ تمہارا ہر عمل لکھا جاتا ہے۔ اس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ تم سے حساب لیا جائے گا۔ تمہارے اعمال عدل کے ترازو میں تلیں گے۔ مجرمین کو عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔ ان کے ساتھ "پولیس کے سپاہی" ہوں گے۔ مستغیث بھی وہاں موجود ہوں گے اور گواہ بھی۔ اس عدالت میں نہ کسی کی سفارش چلے گی نہ رشوت۔ نہ کچھ دے دلا کر جان چھوٹے گی، نہ کوئی شخص کسی دوسرے کی سزا بھگت سکے گا۔ اسی طرح، جہنم کی جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ ایسی ہی ہیں جیسے دنیا میں جیل خانوں کی زندگی یا میدانِ جنگ میں آگ اور خون کا عذاب۔ جہاں تک اس دنیا میں جنت یا جہنم کی زندگی کا تعلق ہے، وہ تو بہرحال، مادی شکل ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن آخرت کی زندگی کی یہ تفاصیل تمثیلی انداز میں بیان ہوئی ہیں۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے اس مجموعی اور اجمالی تعارف کے بعد آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے ان تفاصیل کو کس طرح بیان کیا ہے۔ ان تفاصیل کو اس مجموعی تعارف کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس سے بات بھی زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گی اور ہمیں ایک ہی نکتہ کو بار بار دہرانا بھی نہیں پڑے گا۔

دوسرا باب

ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ ملتا ہے

جیسا کہ سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے، دین کا سارا نظام، قانونِ مکافات کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) ہر شخص کو اس کے کام کا نتیجہ ملتا ہے۔

(۲) نتیجہ صرف اپنے کام کا ملتا ہے، خواہ اسے انفرادی طور پر کیا جائے اور خواہ دوسروں کے ساتھ شریک ہو کر ـــ اور

(۳) کسی کا کوئی کام بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا ـــ تعمیری کام کا نتیجہ خوشگوار، تخریبی کا ناخوشگوار۔

قرآنِ کریم نے اس بنیادی حقیقت کو جامعیت کے ساتھ ان مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کہ ـــ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۴۷؛ ۵۲/۱۶؛ ۳۷/۳۹؛ ۴۵/۲۸) لوگوں کو بدلہ صرف ان کے اپنے کاموں کا ملتا ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۸۰) انہیں ان کے کاموں کا بدلہ بہت جلد مل جائے گا۔ سورۂ یونس میں ہے هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۱۰/۵۲) نیز (۱۴/۵۱) تمہیں صرف اس کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس میں نہ کسی کی تخصیص ہے، نہ استثناء۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ (۱۱/۱۱۱ نیز ۲۹/۷)

تیرا ربّ ان سب کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

سورۂ نحل میں ہے وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۱؛ ۴۰/۱۷؛ ۳۹/۷۰؛ ۳۶/۵۴) ہر شخص کو اس کے کاموں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اس میں نہ کسی پر زیادتی ہوگی، نہ کسی کے بدلہ

میں کمی کی جائے گی۔
جو لوگ حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے متعلق کہا کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳۹/۳۴) جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں اپنے رب کے ہاں سے ملے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ (۳۹/۳۴) یہ اس لئے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق نہایت حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی۔ اور اس سے اگلی آیت (۳۹/۳۵) میں اس کی مزید تشریح کر دی۔ سورۂ احقاف میں کہا کہ "ان لوگوں کے لئے جنت ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت کر دی کہ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ (۴۶/۱۴؛ ۶/۱۲۸) یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ (نیز ۵۲/۱۹)۔ دوسری طرف غلط کار لوگوں کے متعلق کہا کہ ان کی زندگی جہنمی ہوگی اور یہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا (۷/۶۶)۔ یعنی جزا مطابق اعمال (۷۸/۲۶)۔

غلط کار خود اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے

معاشرہ میں غلط روش اختیار کرنے والے (بزعمِ خویش) یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے جو نقصان ان کی ذات کو پہنچتا ہے وہ اس طبیعی مفاد سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے جسے وہ غلط طریق سے حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسروں کو تباہ نہیں کرتے بلکہ خود اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۶/۲۰ نیز ۷/۵۳) اس میں ان کی اپنی ہلاکت کا سامان پوشیدہ ہوتا ہے۔

وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۞ (۶/۲۶)

یہ صرف اپنے آپ کو ہلاک کرتے ہیں لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں لیکن وہ درحقیقت اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں — وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۞ (۷/۱۷۷) جب ان پر تباہی آتی ہے تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ خدا نے ان پر ظلم کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ۔ اللہ ان پر ظلم نہیں کرتا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۶/۳۳) وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، اور وہی ظلم ہلاکت بن کر ان کے سامنے آجاتا ہے۔ (نیز ۱۶/۱۱۲؛ ۲۹/۴۰؛ ۳۰/۹)۔

اَجر منتقل نہیں کیا جاسکتا

آپ صبح کے وقت باقاعدہ سیر کے لئے جاتے ہیں. اس سے آپ کی صحت اچھی ہوجاتی ہے آپ آپ کا بھائی سیر کے لئے نہیں جاتا. وہ سیر کے فوائد سے محروم رہ جاتا ہے. آپ ہزار چاہیں کہ اپنی سیر کا نتیجہ اپنے بھائی کی طرف منتقل کردیں' آپ ایسا نہیں کرسکتے. اسے یہ نتیجہ اسی وقت مل سکے گا جب وہ خود سیر کرے. اسی کا نام انسانی ذات کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے. یعنی ہر انسانی ذات' دوسری ذات سے منفرد ہے اس لئے کسی ایک شخص کے عمل کا نتیجہ نہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہوسکتا ہے نہ کوئی اور اسے اس سے چھین سکتا ہے. نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے کہ غلط کام کوئی دوسرا کرے اور اس کا نتیجہ آپ بھگتیں. جو شخص انگلی آگ میں ڈالے گا' درد اسی کو ہوگا. کوئی دوسرا اس کی اس تکلیف کو بٹا نہیں سکتا، یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کا وہ بنیادی اصول جس کے لئے قرآن نے کہا کہ

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)

جو شخص کوئی اچھا کام کرے گا اس کا اچھا اثر اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوگا. جو غلط کام کرے گا اس کا تباہ کن نتیجہ بھی اس کی ذات کو بھگتنا پڑے گا.

دوسری جگہ ہے وَ مَنْ يَكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱) جو شخص جرم کرتا ہے تو وہ جرم خود اس کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے. اس کا تباہ کن اثر اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے. سورۂ روم میں ہے. مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۙ (۳۰/۴۴ ; ۴۱/۴۶). جو صداقت سے انکار کرتا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو اس کا نقصان خود اٹھاتا ہے اور جو شخص صلاحیت بخش کام کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی لئے سامان آسائش مہیا کرتا ہے. قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اصول یہ ہے کہ

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۰/۱۰۸ ; ۱۷/۱۵ ; ۳۹/۴۱).

جو صحیح راستے پر چلتا ہے تو اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچتا ہے اور جو غلط راہ اختیار کرتا ہے اس سے اس کی اپنی ذات کا نقصان ہوتا ہے.

دوسری جگہ ہے فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا ؕ (۶/۱۰۵؛ ۲۷/۹۲؛ ۲۹/۶)۔ جو آنکھیں کھول کر چلتا ہے اس کا فائدہ خود اسی کو ہوتا ہے اور جو آنکھیں بند کر کے چلتا ہے وہ خود کنوئیں میں گرتا ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر ہے۔

وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ

(۶/۱۶۵)

جو شخص غلط اقدام کرتا ہے تو اس کا نقصان اس کی اپنی ذات کو ہوتا ہے، (قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

لہٰذا، اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ (۱۷/۷) (نیز ۳۰/۲۷؛ ۲۱/۱۲؛ ۱۵/۴۵) اگر تم اچھا کام کرتے ہو تو اپنی ذات کے لئے کرتے ہو اور اگر غلط کام کرتے ہو تو اس کا نقصان بھی تمہیں کو ہوگا۔ لہٰذا، یہ عقیدہ کہ ہم اپنے کسی نیک کام کا ثواب دوسرے کو پہنچا سکتے ہیں یا کوئی ہمارے گناہوں کا کفارہ دے کر ہمیں عذاب سے بچا سکتا ہے، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (۳۵/۱۸) جو اپنی ذات کے لئے سامانِ نشوونما فراہم کرتا ہے، اس کی ذات نشوونما پاتی ہے۔

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ (۳۵/۱۸)

اگر کوئی ایسا شخص جو بوجھ کے نیچے دب رہا ہو، کسی دوسرے کو آواز دے کہ وہ اس کے بوجھ کو اٹھا لے تو وہ اس کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں ہٹا سکے گا خواہ وہ اس کا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو (۳۹/۷)۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ اپنی کمر پر لادے، سامنے آئے گا (۶/۳۱؛ ۵۳/۳۸)۔

ہاں! جو لوگ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، ان کی پشت پر ان لوگوں کے بوجھ کا بھی کچھ حصہ ہوگا جنہیں انہوں نے گمراہ کیا تھا۔

لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۟ (۱۶/۲۵؛ ۲۹/۱۳)

وہ مکافات کے وقت، اپنے غلط اعمال کا تو پورے کا پورا بوجھ اٹھائے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کے بوجھ کا بھی کچھ حصہ جنہیں انہوں نے بلا علم و تحقیق غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طرح راہ گم کردہ لوگوں کے بوجھ میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ ان کا بوجھ تو اتنا ہی رہیگا لیکن گمراہ کرنے والوں کے بوجھ میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ بوجھ انہیں دوسروں کو گمراہ کرنے کے جرم کی وجہ سے اٹھانا پڑے گا۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا اصل الاصول یہ ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ جو کوئی غلط کام کریگا اسے اس کا بدلہ ملے گا۔ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى اور جو کوئی اچھے کام کرے گا ـــ وہ مرد ہو یا عورت ـــ اسے اس کا بدلہ ملے گا۔ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (۱۲۳-۴/۱۲۴) اور ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہو گی۔ اس باب میں، اور تو اور، کائنات کی عظیم ترین ہستی، خود ذاتِ رسالتمآبؐ کی زبانِ اقدس سے یہ اعلان کرایا گیا کہ

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۶/۱۵؛ ۱۰/۱۵؛ ۳۹/۱۳)۔

ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو یومِ مکافات کے عذاب سے مجھے بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں۔

بلکہ آپؐ سے کہا گیا کہ اگر (بفرضِ محال) آپ ایسا کرتے تو "آپ کو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دوہرا عذاب ملتا" (۱۷/۷۵) ـــ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

یہ اعلان ایک عظیم حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ آپ مختلف مذاہبِ عالم پر نگاہ ڈالیے۔ ان کے متبعین نے اپنے بانئ مذہب کے متعلق بڑے غلو سے کام لیا ہے۔ کسی نے اسے خدا بنا دیا، کسی نے خدا کا بیٹا۔ کسی نے اُسے اوتار کہا اور کسی نے کہہ دیا کہ اس نے اپنی جان دے کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اور یہ عقیدہ تو (کسی نہ کسی شکل میں) ہر ایک کے ہاں موجود ہے کہ ان کے پیغمبر یا بزرگ خدا کے ہاں سفارش کر کے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش سے بچا لیں گے۔ ان کے برعکس، قرآنِ کریم کا یہ اعلان دیکھئے جس کی رُو سے خود رسول اللہ یہ کہہ رہے ہیں کہ کسی اور کو گناہوں کی پاداش سے چھڑانا تو ایک طرف، اگر مجھ سے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہو جائے تو میں بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا، بلکہ مجھے دوسروں کے مقابلہ میں دوہری سزا ملے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی وضاحت، اس سے بہتر انداز میں ہو نہیں سکتی۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے اس رسول کے متبعین سے بھی کہہ دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم (محض اس

رسول کی امت میں شامل ہونے کی بنا پر، یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ان جانگسل مراحل میں سے نہیں گزرو گے جو جنت تک پہنچنے کی راہ میں پڑتے ہیں (۲/۲۱۴)۔ ان مراحل میں گزرنے ہی پر تو اس کی پرکھ ہو گی کہ تم میں کون سعیِ پیہم اور عملِ مسلسل سے جنت کا مستحق بنتا ہے (۳/۱۴۱؛ ۱۹/۱۶)۔ یہ استحقاق زبان سے ایمان کا دعویٰ کر دینے سے حاصل نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے بڑی بڑی سخت کٹھالیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے (۲۹/۲)۔ جی تو ہر ایک کا یہی چاہتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے لیکن جنت، انسان کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہے (۳۸۔ ۳۹/۷۰)۔ یہ نہ "بخشش" کے طور پر مل سکتی ہے نہ کسی کی سفارش سے۔ یہ تو اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ (۲۹/۵۸) ـــ یعنی کام کرنے والوں کے کام کا معاوضہ ہے۔ یہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۲/۱۷) ہے۔ یعنی ان کے اعمال کا فطری نتیجہ۔ اس کے حصول کے لئے ہر کام کرنے والے کو کام کرنا چاہیئے (۳۷/۶۱) یہی وجہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے والوں کو پکار کر بتا دیا جائے گا کہ

تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۴۳)

یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اپنے اعمال کی بدولت، وارث بنایا گیا ہے۔

اور چونکہ اسے تم نے اپنے سعی و عمل سے حاصل کیا ہے اس لئے تم اس کے مالک قرار پا گئے ہو۔ اب تمہیں کوئی اس سے نکال نہیں سکتا۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا۔ تم اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ (۷۸/۳۶) اسے "حساب کرکے" عطا کیا گیا ہے۔

عدل کے ترازو

اس حساب کے لئے خدا نے عدل کے ترازو کھڑے رکھے ہیں۔ سورۂ انبیآء میں ہے وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ (۲۱/۴۷) یوم مکافات کو ہم عدل کے ترازو کھڑے کر دیں گے اور اس طرح کسی پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو گی۔ ان ترازوؤں کی کیفیت یہ ہو گی کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۷۔۸/۹۹) غلط اور صحیح اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے آ جائے گا۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہر انسان کے عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے اس لئے کسی عمل کے ضائع ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں کہیں ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۷۰) " خدا

مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔" کہیں یہ کہ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۱۲/۵۶؛ ۱۲/۹۰) "ہم حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔" سورۂ کہف میں ہے۔ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ (۱۸/۳۰) "ہم کسی کے حسنِ عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے۔" کسی جگہ ہے۔ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲/۲۷۷) "ان کے اعمال کا بدلہ ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا۔" پورا پورا بدلہ۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲/۲۸۱) ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ کسی کے کام کا پورا پورا بدلہ نہ دینا ظلم ہے اور خدا ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (۳/۵۶؛ ۳/۲۴)؛ (۳/۱۹۰)۔ ظلم کرنا تو ایک طرف خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے جو بدلہ ملے گا وہ انسان کے اپنے اندازے سے بھی زیادہ ہوگا (۴/۱۷۳)۔ لیکن بلاسعی و عمل کسی کو کچھ نہیں ملے گا کہ قانونِ مکافات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) انسان کے لئے صرف وہ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔ جنت میں جانے والوں کے متعلق کہا کہ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۳/۱۳۵) کام کرنے والوں کے کام کا بدلہ کیسا اچھا ہے؟ مدارج کے تعین کا معیار بھی لوگوں کے اعمال ہی ہوں گے۔ جس کا جتنا اور جس قدر اچھا کام، اس کا اتنا ہی درجہ بلند۔ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۳۳)؛ (۴۶/۱۹) ہر ایک کا درجہ اس کے اعمال کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ خدا کو سب معلوم ہے کہ کس نے کیا کام کیے ہیں۔

انسانی زندگی ایک کارگاہِ عمل ہے

موجودہ سطح پر انسانی زندگی کا مقصد و منتہیٰ یہ ہے کہ اس کی ذات کی اس حد تک نشوونما ہو جائے کہ وہ اس سے اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ موت درحقیقت اس بات کی پرکھ (TEST) کے لئے ہے کہ انسانی ذات میں کس حد تک استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲) خدا نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ تمہیں حسنِ عمل کے لئے مواقع بہم پہنچائے۔ لہٰذا، اس کارگہ سعی و عمل میں لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷) جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔

اس سے اگلی آیت میں قرآنِ کریم نے مکافاتِ عمل کے سارے فلسفہ اور اس کی رُلم کو ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے. کہا کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۙ (۷۴/۳۸). دوسری جگہ ہے. كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ○ (۵۲/۲۱) ہر شخص نے اپنے آپ کو اپنے اعمال کے عوض (گرو) رکھا ہوا ہے. جو شخص جو کام کرتا ہے اس کام کا نتیجہ اسے بھگتنا ہوگا. اس لئے اس حد تک اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے. وہ اپنے اس کام کے نتیجے کے ہاتھوں رہن رکھا جاتا ہے. اس سے اسے کوئی دوسرا چھڑا نہیں سکتا. اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے کہا کہ تم نہ تو خدا کی مملکت سے بھاگ کر کسی اور مملکت میں جا سکتے ہو کہ وہاں (سابقہ مملکت کے خلاف جرائم کی پاداش سے) بچ جاؤ. اور نہ ہی اس کی مملکت میں رہتے ہوئے' اس کے خلاف جنگ کر کے اسے شکست دے سکتے اور اس طرح اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہو. یہ ناممکن ہے (۷۲/۱۲). اس کا قانونِ مکافات تمہیں اس طرح پکڑ لے گا جس طرح گھوڑے کو اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ لیا جاتا ہے اور اس طرح وہ بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے (۹۶/۱۶-۱۵). یہ ہو سکتا ہے کہ تم (غلط معاشرہ میں) اپنے جرائم کی پاداش سے اپنے آپ کو بچا لو. لیکن یہ کچھ تم اس دنیا کی زندگی میں کر سکتے ہو اور دنیا کی زندگی تو بہرحال ایک مدّتِ معینہ تک کے لئے ہے. اس کے بعد' یہاں کی حفاظتی تدابیر تمہارے کسی کام نہیں آ سکیں گی. لہٰذا "اگر تمہاری عمر ہزار برس کی بھی ہو جائے تو بھی تم اس کی گرفت سے مامون نہیں رہ سکتے" (۲/۹۶).

کل کے لئے کیا بھیجا ہے؟

چونکہ انسان کا عمل پہلے سرزد ہوتا اور اس کا نتیجہ بعد میں مرتب ہوتا ہے' اس لئے قرآنِ کریم نے ظہورِ نتائج کے لئے "کل" یا "فردا" کی اصطلاح استعمال کی ہے. سورہ حشر میں ہے. وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ (۵۹/۱۸) ہر شخص کو چاہیئے کہ یہ دیکھے کہ اس نے "کل" کے لئے کیا آگے بھیجا ہے. "آگے بھیجنے" سے مراد ہی اعمال کے نتائج ہیں. یہ اصطلاح کئی ایک دیگر مقامات میں بھی آئی ہے. مثلاً (۲۰/۷۳; ۷۵/۱۳; ۷۸/۴۰; ۸۱/۱۴; ۸۲/۵). سورۃ الفجر میں اس کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ ہوا ہے جس سے حقیقت نکھر کر سامنے آگئی ہے. کہا کہ اہلِ جہنم اس تباہی کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي (۸۹/۲۴) اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ پہلے بھیج دیا ہوتا. اس سے

واضح ہے کہ زندگی کی اگلی منزل عبارت ہوگی انسان کے اپنے اعمال کے نتائج سے۔ اس کے غلط اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی اس کی انسانی صلاحیتوں پر زنگ بن کر چمٹ جاتے ہیں جس سے وہ ابھرنے ہی نہیں پاتیں (۸۳/۱۴)، اور یہی نتائج اگلی زندگی میں، اس کی صحیح زندگی کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔

اپنے اعمال کی فکر ہونی چاہیئے

سو جب حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس کے اپنے اعمال ہی سے جنت اور جہنم بنتی ہے تو انسان کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیئے۔ دوسروں کے اعمال کی ٹوہ میں لگے رہنے سے اس کا اپنا کیا سنور جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم مومنین سے بار بار تاکید کرتا ہے کہ وہ مخالفین سے اس باب میں اُلجھیں نہیں بلکہ ان سے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیں کہ

وَ لَنَآ اَعۡمَالُنَا وَ لَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ (۲/۱۳۹؛ ۲۸/۵۵)

ہمارے اعمال کے نتائج ہمارے لئے ہوں گے۔ تمہارے
اعمال کے نتائج تمہارے لئے۔

سورۂ کافرون میں اعمال کی جگہ نتائجِ اعمال (دین) کہہ کر بات کو اور بھی واضح کر دیا ــــ لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ٥ (۱۰۹/۶)۔ سورۂ سبا میں ہے کہ ان سے کہہ دو کہ لَّا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّاۤ اَجۡرَمۡنَا وَ لَا نُسۡـَٔلُ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ٥ (۳۴/۲۵) نہ تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے کیا کیا جرم کئے تھے اور نہ ہم سے سوال ہوگا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ دوسرے مقام پر نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ میرے اعمال میرے لئے ہیں تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ نہ تمہارے اعمال کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اور نہ ہی میرے اعمال کی ذمہ داری تم پر عائد ہوگی (۱۰/۴۱)۔

اسلاف کے اعمال

اپنے مخاطبین ہی سے نہیں۔ بلکہ تم اسلاف کے متعلق بھی اس قسم کی بحثوں میں نہ الجھا کرو کہ فلاں اچھے تھے اور فلاں بُرے۔ فلاں جنت میں جائیں گے فلاں جہنم میں۔ یاد رکھو!

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۱۴۱ ؛ ۲/۱۳۴)

یہ لوگ اپنے اپنے وقتوں میں گذر گئے۔ ان کے اعمال ان کے لئے تھے تمہارے اعمال تمہارے لئے ہوں گے۔ اور تم سے پوچھا تک بھی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

غور کیجئے۔ اگر قرآنِ کریم کا یہ عظیم اصول ہمارے پیشِ نظر رہے تو ہم کس طرح ان تمام اُلجھنوں سے چھوٹ جاتے ہیں جن میں اُمت تیرہ سو برس سے ماخوذ چلی آرہی ہے اور جس سے نہ صرف یہ کہ اس قدر وقت، محنت، توانائی دولت ضائع ہو چکی اور ضائع ہوتی رہتی ہے، بلکہ اس سے باہمی نفرت و حقارت دُور ہو کر، کس طرح وحدت اور یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ خدا برملا کہہ رہا ہے کہ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ تمہارے اسلاف نے کیسے کام کئے تھے لیکن ہم کہتے ہیں کہ نہیں! ہم سے سب سے پہلے سوال ہی یہ پوچھا جائے گا اس لئے ہمیں "پوری چھان بین اور کامل تحقیق و تدقیق" کے بعد اس سوال کے جواب کی تیاری کرنی چاہیئے۔

پھر اسے بھی سمجھ رکھئے کہ ہمارے اسلاف میں سے اگر کسی نے اچھے کام کئے تھے تو ان کا فائدہ ان کی اپنی ذات کو پہنچے گا۔ ہمیں ان کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ (جیسا کہ پہلے وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے) کسی کے عمل کا نتیجہ، کسی دوسرے کی طرف منتقل کیا ہی نہیں جا سکتا۔

کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا

اس اصول کی وضاحت کے لئے قرآنِ کریم نے بار بار کہہ دیا کہ نتائجِ اعمال کے سلسلہ میں کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (۲/۴۸)؛ (۲/۱۲۳)

تم ظہورِ نتائج کے اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام نہیں آسکے گا نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا نہ ہی مجرموں کی کسی قسم کی مدد کی جاسکے گی۔

دوسری جگہ ہے کہ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ (۲/۲۵۴)؛ (۱۴/۳۱) اس دن نہ

کوئی سودا بازی ہو سکے گی۔ نہ کسی کی کوئی سودا بازی کوئی کام دے سکے گی۔ نہ کسی کی سفارش چل سکے گی۔ اس دن کوئی کسی کو کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکے گا (۳۴/۴۲)۔ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (۴۳/۶۷) اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ ہاں مگر جو لوگ کامیابیوں کی فہرست میں شامل ہوں گے ان کی باہمی رفاقت قائم رہے گی لیکن اعمال کے نتائج بدلنے میں وہ بھی ایک دوسرے کے کام نہیں آسکیں گے (۴۴/۴۱)۔ کسی میں نہ اس کی قوت ہوگی کہ وہ ان نتائج کو اپنے سے دور کرا سکے اور نہ کوئی دوسرا اس کا مددگار بن سکے گا (۸۶/۱۰)۔ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ (۳/۹۰)؛ (۵/۳۶؛ ۱۳/۱۸؛ ۳۹/۴۷؛ ۳۴/۳۷)۔ اگر کوئی چاہے گا کہ سارے کرۂ ارض کے برابر سونا دے کر ان نتائج سے محفوظ رہ سکے تو اس سے یہ بھی بطور فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا (۶/۷۰؛ ۵۷/۱۵)۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا (۳/۹)؛ (۳/۱۱۵؛ ۵۸/۱۷) خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں نہ کسی کا مال کچھ کام دے سکے گا نہ اولاد (۲۶/۸۸)۔ يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا (۳۱/۳۳) جس دن نہ بیٹا باپ کے کسی کام آسکے گا نہ باپ بیٹے کو بچا سکے گا۔ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۶۰/۳) اس دن نہ کسی کو اس کی اولاد کوئی فائدہ پہنچا سکے گی نہ کوئی اور رشتہ دار۔ جس قدر قوت اور اقتدار (اتھارٹی) وہ دنیا میں رکھتا تھا، وہ بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکے گی (۲۸-۲۹/۶۹)؛ (۱۱/۹۲؛ ۱۱۱/۲)۔ قانون کہتے ہی اسے ہیں جس پر کوئی خارجی عنصر اثر انداز نہ ہو سکے اور وہ اپنی کارفرمائی اور نتیجہ خیزی میں اٹل ہو۔ ہر ایک اپنے اپنے اعمال کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا حاضرِ عدالت ہو اور نفسا نفسی اور افراتفری کا یہ عالم کہ

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ۙ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۭ (۸۰/۳۴-۳۷)، (۷۰/۱۰-۱۴)

جس دن دوست اپنے دوست سے بھاگ جائے گا۔ ماں اور باپ اولاد کو چھوڑ جائیں گے۔ بیوی اور بچے بھی سب آنکھیں دکھا دیں گے۔ اس لئے کہ اس دن سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔

دنیاوی قانون کی گرفت سے چھوٹنے کے لئے مختلف سازشیں کام دے جاتی ہیں۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں کوئی سازش کارگر نہیں ہو سکے گی (۵۲/۴۶)۔ یہ اس لئے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر

مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی خارجی قوت اس اثر کو زائل کرنے میں کیا کام دے سکتی ہے؟ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے ایک ایسے جامع انداز میں بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔

انسانی ذات وہ شے ہے جسے "میں" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے آپ کو "میں" کہتے ہیں اور باقی ہر شے کو "میری" (یعنی اس "میں" کی)۔ میرا مال، میری جائیداد، میری بیوی، میری اولاد، میرے دوست، میرا جسم۔ حتیٰ کہ میری جان۔ انسانی اعمال کا اثر اس "میں" پر مرتب ہوتا ہے اور موت کے وقت وہ سب کچھ جسے میرا یا میری کہا جاتا ہے پیچھے رہ جاتا ہے اور "میں" تنہا آگے جاتا ہے۔ دیکھئے! اس حقیقت کو قرآن کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَ مَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ؑ (۶/۹۵)؛ (۱۸/۴۸)۔

تم ہمارے پاس فُرَادٰی (تنہا) آؤ گے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اس کے بعد جو کچھ تمہیں دیا گیا تھا سب پیچھے چھوڑ آؤ گے۔ حتیٰ کہ جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گے اور خدا کے شریک بن کر تمہیں عذاب سے بچا لیں گے وہ بھی تمہارے ساتھ نہیں ہوں گے۔ اس وقت تمام رشتے منقطع ہو جائیں گے اور جس جس کو تم "میرا" سمجھتے تھے سب غائب غُلّا ہو جائیں گے۔

سورۃ مریم میں اسے اور بھی مختصر الفاظ میں سمٹا کر بیان کر دیا جب کہا کہ وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ○ (۱۹/۹۵) اس دن سب کے سب خدا کے سامنے انفرادی طور پر آئیں گے۔ یعنی کوئی اضافی نسبت ان کے ساتھ نہیں ہوگی۔ ان کی ذات، ان کے اعمال کے اثرات لئے ہوئے آگے جائے گی (۱۹/۸۰)۔

تیسرا باب

حِسابِ کِتاب

قانونِ مکافاتِ عمل کا منطقی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کا خود ذمہ دار ہے یا یوں کہیئے کہ انسان کے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونے کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتے. بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے، جس شخص کو کسی چیز کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتے، اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے اسے اس چیز کا حساب دینا ہوگا. اسے (ACCOUNTABILITY) کہا جائے گا. قرآن کریم نے اسے "حساب دینے" سے تعبیر کیا ہے. سورۃ الحجر میں ہے.

فَوَ رَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۵/۹۲-۹۳)

تیرا رب اس پر شاہد ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں، ان سے اس کی بابت باز پرس ہوگی.

دوسری جگہ ہے ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝ (۱۰۲/۸) پھر ان سے ان تمام نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا ______ جن سے یہ متمتع ہوتے تھے ___ پوچھا یہ جائے گا کہ انہیں حاصل کس طرح کیا تھا اور خرچ کہاں کیا تھا ___ انسان یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ وہ اپنے کاروبار میں آزاد اور صاحبِ اختیار ہے اس لئے وہ جو جی چاہے کرے. یہ ٹھیک ہے کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور اسے آزادی حاصل ہے کہ یہ جو جی میں آئے کرے. لیکن اسے اپنے ہر عمل کا نتیجہ بھگتنا ہوگا. یعنی وہ اس باب میں تو آزاد ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے، لیکن اسے اس کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج بدل لے. اس کے لئے وہ خدا کے قانونِ مکافات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے. فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (۲۳/۱۱۷) "یقیناً خدا کے ہاں اس کا حساب ہوگا" (۲۴/۳۹). خدا کے رسول جو انسانوں کو

خدا کے قانونِ مکافات سے آگاہ کرتے تھے، ان سے واضح الفاظ میں کہتے تھے کہ ان کا حساب ان کے خدا کے ہاں ہوگا۔ اے کاش! یہ اس حقیقت کو سمجھ لیں (۲۶/۱۱۳)۔ اور خدا اعلان کرتا تھا کہ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۸۸/۲۶) ان سے حساب لینا ہمارے ذمہ ہے۔ بلکہ وہ اپنے رسولوں سے واضح کہہ دیتا تھا کہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ٥ (۱۳/۴۰) تمہارے ذمہ صرف اس پیغام کا پہنچا دینا ہے، ان سے حساب لینا ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لئے خدا کو کسی معاون اور مددگار کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی اس کے انتقام میں کسی قسم کا نقص یا خامی ہے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۴/۶)؛ (۳۳/۳۹) خدا محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ ہر شے کا حساب لے گا (۴/۸۶)۔ انسانی عمل کا "ایک ایک ذرہ" اس کے حساب میں آجائے گا (۲۱/۴۷)۔

دنیا کا نظامِ عدل و محاسبہ کتنا ہی مکمل اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کی دسترس بہرحال انسان کے ظاہری اعمال تک ہو سکتی ہے۔ اس کے خیالات اور ارادے اس کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے انسان کے ہر خیال اور ارادہ کا اثر بھی اس کی ذات پر پڑتا ہے اس لئے یہ بھی 'خدا کے حساب' کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط (۲/۲۸۴) تم کسی بات کو اپنے دل میں چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو، خدا ان سب کا حساب لے گا۔ مومن کو اس کا یقین ہوتا ہے اور اسی سے وہ غلط اقدامات سے بچتا ہے۔ اسی لئے وہ ظہورِ نتائج کے وقت کہتا ہے کہ مجھے اس کا ہر وقت خیال رہتا تھا کہ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۚ (۶۹/۲۰) میرا حساب میرے سامنے آئے گا۔ اس کے برعکس، جہنم میں جانے والا اپنے حساب کا پرت دیکھ کر چیخ اٹھے گا کہ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ (۶۹/۲۵-۲۶) اے کاش! یہ حساب کا پرت مجھے نہ دیا جاتا اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے! چونکہ اہلِ جنت کے اعمال خدا کے قوانین کے مطابق ہوں گے اس لئے ان کا حساب بہت آسان ہوگا (۸۴/۸)۔ اسکے برعکس، غلط کار لوگوں کا حساب بڑا سخت ہوگا (۱۳/۱۸)۔ لہٰذا، انسان کو ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اسے اپنی ایک ایک حرکت کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔

انسان اپنا محاسب آپ ہے

یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ "خدا کو حساب لینے والا" کہا گیا ہے۔ یہ صرف بات سمجھانے کا انداز

ہے. مقصد اس سے یہی ہے کہ یہ حساب خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوگا۔ یہ حساب کرنے والا کہیں باہر سے نہیں آئے گا. چونکہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اس لئے وہ درحقیقت اپنا محاسب آپ ہوتا ہے. اس کی ذات اس کا "اعمال نامہ" ہوتی ہے اور اس اعمال نامہ کو وہ خود پڑھ کر اپنا حساب آپ کر لیتا ہے. سورۂ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے. فرمایا. وَ كُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓـئِرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ ؕ ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوتا ہے. وَ نُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ. ظہور نتائج کے وقت ہم اس اعمال نامہ کو باہر نکال لائینگے. كِتٰبًا يَّلۡقٰٮهُ مَنۡشُوۡرًا ۝ یعنی جو کاغذ پہلے لپٹا ہوا تھا اسے اُس وقت پھیلا دیا جائے گا اور انسان سے کہا جائے گا کہ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ تو اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھ. كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ۝ (۱۳-۱۴/۱۷) آج تو اپنے خلاف اپنا محاسب آپ ہے. کسی دوسرے محاسب کی ضرورت نہیں۔

سریع الحساب

انسان سے جس وقت کوئی عمل سرزد ہو اس کا نتیجہ اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں کچھ عرصے کے بعد جا کر سامنے آتا ہے. اس اعتبار سے کہ عمل کا نتیجہ اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے، خدا نے اپنے آپ (یعنی اپنے قانونِ مکافات) کو سریع الحساب ۔ بہت جلد حساب لینے والا ۔ کہا ہے (۳/۱۸؛ ۵/۴؛ ۱۳/۴۱؛ ۱۴/۵۱؛ ۲۴/۳۹؛ ۴۰/۱۷)۔ "سریع الحساب" ہی نہیں بلکہ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ (۶/۶۲) سب سے زیادہ تیز حساب کرنے والا۔

یوم الحساب

جس وقت انسانی اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آئیں ۔ خواہ اس دنیا میں اور خواہ اس کے بعد کی زندگی میں ۔ اسے "یوم الحساب" سے تعبیر کیا گیا ہے. (اس کی تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)، مثلاً سورۂ صٓ میں نعمائے جنت کے تذکرہ کے بعد کہا. هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِيَوۡمِ الۡحِسَابِ (۳۸/۵۳) یہ ہیں وہ نعماء جن کا تم سے "یومِ حساب" کے لئے وعدہ کیا جاتا ہے. (جیسا

کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا کہ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ (۲۱/۱) لوگوں کے حساب کا وقت قریب آرہا ہے لیکن وہ ابھی تک حقائق سے مُنہ موڑے، خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے ہیں۔ دنیا میں جس قدر فساد برپا ہے اور لوگ دھاندلی مچا رہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں "یومِ حساب" (خدا کے قانونِ مکافات) پر یقین نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہر امن پسند کو پناہ مانگنی چاہیئے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اپنے پیغام کے خلاف فرعون کا ردِ عمل دیکھا تو ان کی زبان پر بے ساختہ آگیا کہ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ؏ (۴۰/۲۷) میں ہر اس متکبر سے محفوظ رہنے کے لئے جو یومِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا، خدا کی پناہ میں آجانا چاہتا ہوں۔

پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اسے بھی واضح کر دیا کہ ہر ایک کا حساب اپنا اپنا ہوگا۔ حتیٰ کہ اس باب میں رسول بھی افرادِ امت کے حساب میں شریک نہیں ہوتا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (۶/۵۲) نہ ان کے اعمال کا حساب تمہارے ذمہ ہے اور نہ ہی تمہارے اعمال کا حساب ان کے ذمے۔

بغیر حساب

قرآنِ کریم میں بعض مقامات کہا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کے اعمال کا اجر "بغیر حساب" ملے گا۔ مثلاً سورۂ زمر میں ہے۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۳۹/۱۰) جو لوگ مشکلات کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں، انہیں ان کا بدلہ "بغیر حساب" کے ملتا ہے یا مثلاً رزق کے معاملہ میں بعض مقامات میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳/۳۶؛ ۲۴/۳۸؛ ۴۰/۴۰)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کے ہاں کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں اور وہ یونہی بلا حساب دے دیتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف ہے۔ خدا کے ہاں ہر بات قاعدے اور پیمانے کے مطابق ہوتی ہے۔ ان آیات میں "بغیر حساب" کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص قانونِ خداوندی کے مطابق کوئی کام کرتا ہے تو اس کا خوشگوار نتیجہ اس کے اپنے اندازے اور خیال سے بھی بڑھ کر

مرتب ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ طلاق میں ہے کہ جو شخص قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے، خواہ بظاہر حالات کیسے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔ یَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ (۶۵/۳) خدا اسے ایسے مقامات سے رزق دیتا ہے جو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس، جن سرکش اور عہد شکن یہودیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ملی تھی۔ ان کے متعلق کہا کہ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ؕ (۵۹/۲) خدا (کا عذاب) ان پر ان راستوں سے آگیا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔

بنابریں، جن آیات میں کہا گیا ہے کہ خدا "بغیر حساب" دیتا ہے، وہاں مراد یہ ہے کہ وہ اتنا دیتا ہے جو خود اس شخص کے اپنے اندازے اور حساب سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ خدا کے پیمانے، انسانی پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

قوموں کا حساب

یہ حساب، افراد ہی کا نہیں ہوتا، قانونِ مکافات کی رُو سے قوموں کے اعمال کا بھی محاسبہ ساتھ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ (۶۵/۸)۔

کتنی قومیں ایسی تھیں جنہوں نے احکاماتِ خداوندی اور پیغاماتِ رسالت سے سرکشی برتی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور انہیں تباہ کن عذاب کا مزہ چکھایا۔

خدا کی گرفت

اس محاسبہ کو کہیں خدا کی گرفت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ بروج میں ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵/۱۲) یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ دوسری جگہ اسے البطشۃ الکبریٰ کہا گیا ہے (۴۴/۱۶)۔

جو مجرم ارتکابِ جرم کے بعد کہیں بھاگ جائے، پولیس اس کا تعاقب کرتی ہے۔ کبھی وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا سراغ نہیں لگتا اور وہ گرفت سے بچ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے، اس

تشبیہ کے مطابق، قانونِ مکافات کے مؤاخذہ کو عقاب کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی مجرم کا پیچھا کرنا۔ جن قوموں کی، ان کے جرائم کی وجہ سے تباہی ہوئی ان کے متعلق کہا کہ انہیں کچھ ڈھیل دی گئی۔ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ پھر ہم نے انہیں جا پکڑا۔ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ (۱۳/۳۲) اور تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ جب ہم مجرمین کا تعاقب کرتے ہیں تو ہمارا تعاقب کرنا کیسا ہوتا ہے؟ (۴۰/۵)۔ اسی جہت سے خدا نے اپنے آپ کو کہیں ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝ کہا ہے (۴۱/۴۳)۔ کہیں سَرِيْعُ الْعِقَابِ (۶/۱۶۶؛ ۷/۱۶۷) اور کہیں شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲/۱۹۶؛ ۲/۲۱۱؛ ۳/۱۰؛ ۵/۲؛ ۵/۹۸؛ ۸/۴۸ - ۲۵ - ۱۳ - ۸/۵۲؛ ۱۳/۶؛ ۳ - ۴۰/۲۲؛ ۵۹/۴) اور شَدِيْدُ الْمِحَالِ بھی (۱۳/۱۳)۔

چونکہ ہر عمل کا انجام اس کا نتیجہ ہوتا ہے (یا ہر نتیجہ اس عمل کا انجام ہوتا ہے)۔ اس لئے عقبا کا لفظ انجام کے لئے بھی آیا ہے۔ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ۝ (۱۸/۴۴)۔ وہ بہترین بدلہ لینے والا ہے اور انجام کو بہتر بنانے والا۔ عُقْبَى الدَّارِ (آخری ٹھکانہ۔ یعنی مآل کار) بھی انہی معانی میں آیا ہے (۱۳/۲۴؛ ۱۳/۳۵؛ ۱۳/۴۲)۔

ذُوانتِقام

ہمارے ہاں انتقام کا لفظ بالعموم اچھے معنوں میں نہیں استعمال کیا جاتا۔ لیکن (عربی زبان میں اور) قرآنِ کریم میں یہ لفظ جرم کے مواخذہ کے معنوں میں آیا ہے۔ اس اعتبار سے خدا کو ذُوانْتِقَامٍ کہا گیا ہے یعنی وہ جس کا قانونِ مکافات، ہر مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیتا ہے۔ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ۝ (۳/۳) اللہ بڑے غلبہ کا مالک اور مجرموں کو ان کے کئے کی سزا دینے والا ہے۔ (نیز ۵/۹۵؛ ۱۴/۴۷؛ ۳۹/۳۷)۔ کہیں قوموں کے پاداشِ عمل کے بعد کہا کہ ہم نے ان سے اس طرح "انتقام" لیا۔ یعنی انہیں ان کے جرائم کا بدلہ دیا (۷/۱۳۶) نیز (۱۵/۷۹؛ ۳۰/۴۷؛ ۲۲/۲۲؛ ۴۳/۴۱؛ ۴۳/۲۵؛ ۴۴/۱۶) اور کہیں یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (۴۳/۲۵) ہم نے انہیں ان کے کئے کی سزا دی۔ پھر دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ہمارے قانونِ مکافات کو جھٹلاتے تھے۔

چوتھا باب

اعمال نامہ

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے اور اس طرح اس کی ذات' اس کے تمام اعمال کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے. اس طرح اس کی ذات پر مرتب شدہ نقوش' اس کا اعمال نامہ ہے. یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کی ہر نقل و حرکت (حتیٰ کہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات تک) کی ایک فلم ساتھ کے ساتھ تیار ہوتی جاتی ہے اور ظہورِ نتائج کے وقت' یہی فلم سکرین (پردہ) پر سامنے آجاتی ہے. لیکن چونکہ قرآنِ کریم میں' اس قانون کی کارفرمائی کو دنیاوی نظامِ عدل کی تشبیہات کی رُو سے سمجھایا گیا ہے' اس لئے' کہیں یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا کوئی عمل خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں. (اور ظاہر ہے کہ جس جرم کے عینی' معتبر گواہ موجود ہیں' اسے ثابت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی). کہیں یہ کہا گیا ہے کہ ہماری خفیہ پولیس کے نہایت دیانتدار پرچہ نویس' ساتھ کے ساتھ تمہاری ڈائری مرتب کرتے چلے جاتے ہیں. یہ سارا ریکارڈ عدالت میں پیش ہوگا اور اس کی رُو سے تمہارے مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے گا. اس سلسلہ میں سب سے پہلے علمِ خداوندی کی بات سامنے آتی ہے جسے (یوں کہئے کہ) ایک عینی گواہ کی حیثیت دی گئی ہے.

خدا تمہارے اعمال سے باخبر ہے

سب سے پہلے قرآنِ کریم نے انسان کی اس بنیادی غلط نگہی کو لیا جس کی وجہ سے وہ ارتکابِ جرم کرتا ہے. اس نے کہا:

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ؕ (۹۰/۷)

کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ ہی نہیں رہا۔

اس کے بعد کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کبھی تنہا بھی ہوتا ہے۔ جس وقت وہ سمجھتا ہے کہ وہ بالکل تنہا ہے، اس کے پاس کوئی اور نہیں، اس وقت بھی اس کے پاس "کوئی" ہوتا ہے۔ اور یہ دوسرا ساتھ ہونے (یا رہنے) والا خود خدا ہے ـــ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (۵۷/۴) وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (۵۷/۴) اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجئے! اگر انسان کو اس بات کا یقین ہو کہ میں جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کروں، اسے خدا دیکھتا ہے، تو ایسا انسان کبھی دانستہ قانون شکنی کر ہی نہیں سکتا۔ جرم کا ارتکاب تو (بالعموم) کیا ہی اس یقین (یا کم از کم اس مفروضہ) کے ماتحت جاتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ خدا، انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○ (۳/۱۱۹)۔ دوسری جگہ ہے۔ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ○ (۸۵/۲۰) خدا، انسان کو ہر طرف سے محیط ہے۔ سورۃ الفجر میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ○ (۸۹/۱۴) خدا ہر وقت تمہاری گھات میں ہوتا ہے۔

پھر، یہی نہیں کہ جس وقت تم سے کوئی عمل محسوس طور پر سرزد ہوتا ہے وہ اُسے اُس وقت دیکھتا ہے۔ وہ انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا علم رکھتا ہے۔ سورۃ قٓ میں ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○ (۵۰/۱۶)۔

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں (اس لئے کہ) ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ○ (۴۰/۱۹) وہ نگاہوں کی خیانتوں اور دل کے رازوں تک کو جانتا ہے۔ انسان خواہ کتنے ہی خفیہ مشورے کرے، وہ خدا سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے کہ "جب تم تین مل کر خفیہ مشورہ کرتے ہو تو وہ چوتھا وہاں موجود ہوتا ہے اور جب تم پانچ مل کر مشورہ کرتے ہو تو وہ چھٹا وہاں موجود ہوتا ہے ـــ یہ "پانچ اور چھ" تو محض بات سمجھانے کے لئے کہا گیا ہے۔ مشورہ کرنے والے کتنے ہی کیوں نہ ہوں هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا (۵۸/۷) وہ

ان کے ساتھ ہوتا ہے۔" اس لئے انسان کا کوئی راز بھی خدا کی نگاہوں سے مستور نہیں رہ سکتا۔ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ٥ (۶۹/۱۸)۔ اس لئے کہ وہ عَالِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ (۶۲/۸) ہے۔ اس کے نزدیک مستور، مشہود سب یکساں ہیں۔ کوئی اونچے بات کرے یا چپکے سے، کوئی دن کی روشنی میں کھلے بندوں چلے یا رات کی تاریکی میں دبے پاؤں، اس کے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا (۱۳/۱۰)۔ اس کا دیکھنا ایسا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۚ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ (۶/۱۰۴) کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی (اس کا ادراک تک نہیں کر سکتی) لیکن وہ ہر آنکھ کا ادراک کرتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی اعمال کے ایک ایک ذرے کو سامنے لے آئے گا۔ خواہ وہ زمین و آسمان میں کسی جگہ ہو اور پتھر کی چٹانوں کے اندر بھی چھپا ہوا کیوں نہ ہو (۳۱/۱۶)۔ اس لئے کہ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ (۲۵/۶) وہ کائنات کے تمام سربستہ اسرار سے واقف ہے۔ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۴/۶۴؛ ۳۳/۵۴؛ ۵۸/۷؛ ۶۵/۱۲) وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ (وَ) يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۚ (۱۳/۴۲) اور ہر انسان کے ہر عمل کا علم بھی۔ (نیز ۴۱/۲۴)۔

اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے اس تکرار و اصرار سے دہرایا ہے کہ ان تمام آیات کا درج کرنا طوالت پذیر ہے۔ کہیں اس نے کہا ہے کہ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥ (۲/۷۴) "جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں۔" (اسے قریب دس مقامات پر دہرایا گیا ہے)۔ کہیں کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۲/۹۶) اللہ لوگوں کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ (یہ الفاظ کم و بیش بیس مقامات پر آئے ہیں)۔ کہیں کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲/۲۳۴) اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ اور کہیں یہ کہ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳/۱۵۴) اللہ تمہارے دل کی باتوں سے بھی باخبر ہے۔ (اس عنوان کو بیس پچیس مقامات پر سامنے لایا گیا ہے)۔

تحریری ریکارڈ

اس حقیقت کو بیشتر مقامات میں ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ (۱۹/۷۹) جو کچھ (انسان) کہتا ہے ہم اسے لکھ لیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ اِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ (۲۱/۹۴) اور ہم (اس کے ہر عمل کو) لکھ لیتے ہیں۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے۔ وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ۚ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۠ (۳۶/۱۲)؛ (۸/۲۹) جو کچھ انسان اپنے اعمال سے آگے بھیجتا ہے ہم اسے

بھی لکھ لیتے ہیں اور جو نقوش یہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے انہیں بھی محفوظ کر لیا جاتا ہے. ہم اس کی ہر بات کو ایک کھلے ہوئے رجسٹر میں درج کرتے جاتے ہیں۔ اَحۡصٰہُ اللّٰہُ وَ نَسُوۡہُ ؕ (۵۸/۶) انسان تو بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا کیا تھا لیکن خدا کے اس ریکارڈ سے ایک حرف بھی محو نہیں ہوتا.

کہیں اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ہمارے مقرر کردہ محافظ متعین ہیں جو اس کی ہر بات کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں کہ لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ (۱۳/۱۱) اس کے آگے اور پیچھے نگران مقرر ہیں جو اس کی ہر بات کو، بحکمِ خداوندی، محفوظ کئے جاتے ہیں. کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا کہ یہ ٹیپ ریکارڈر (TAPE RECORDER) اسے ریکارڈ نہ کر لیتا ہو (۵۰/۱۸). سورۃ الفطار میں ان ریکارڈ کرنے والوں کو کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ (۸۲/۱۱) کہہ کر پکارا گیا ہے. یعنی نہایت واجب التکریم ریکارڈ کیپرز. یہی وہ پہرے دار ہیں جن کی نگاہوں سے انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہتا (۸۶/۴).

یہ "رجسٹر" کہیں چھپا کر نہیں رکھا گیا. نہ ہی اس کے اندراجات ایسی باطنی زبان میں کئے گئے ہیں جنہیں ہر کوئی پڑھ نہ سکے. یہ رجسٹر کتاب مبین ہے (۱۰/۶۱). یعنی بالکل صاف، واضح، کھلی ہوئی کتاب. (نیز ۲۷/۷۵، ۳۴/۳). وَ کُلُّ شَیۡءٍ فَعَلُوۡہُ فِی الزُّبُرِ ۝ وَ کُلُّ صَغِیۡرٍ وَّ کَبِیۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ ۝ (۵۴/۵۲-۵۳) جو کچھ بھی لوگ کرتے ہیں وہ ان کی کتابوں میں درج ہو جاتا ہے. ہر چھوٹا اور بڑا عمل ضبطِ تحریر میں آ جاتا ہے.

جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ ہمارے جو اسلاف پہلے گزر چکے ہیں وہ کس حالت میں ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ عِلۡمُہَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ. ان کے متعلق میرے خدا کے ہاں ایک رجسٹر میں سب کچھ درج ہے. لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی (۲۰/۵۲-۵۱) وہ نہ تو کچھ بھولتا ہی ہے کہ درج ہونے سے رہ جائے اور نہ ہی حساب کرنے میں غلطی کرتا ہے. یہی وہ "کتاب" ہے جس کے متعلق کہہ دیا کہ یَنۡطِقُ بِالۡحَقِّ. وہ بالکل حق کے ساتھ (حقیقت کے مطابق) بات کرتی ہے. وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ (۲۳/۶۲) اس لئے اس کے مطابق فیصلہ کرنے میں کسی پر کسی قسم کے ظلم اور زیادتی کا امکان ہی نہیں.

یہی وہ کتاب (اعمال نامہ) ہے کہ اُسے جن کے "دائیں ہاتھ" میں دیا جائے گا وہ صاحبِ یمن وسعادت ہوں گے اور زندگی کی خوش بختیوں اور سرفرازیوں کے حامل (۶۹/۱۹) اور جن کے "بائیں ہاتھ" میں دیا جائیگا ... پیٹ کر رہ جائیں گے اور کہیں گے کہ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُوۡتَ کِتٰبِیَہۡ ۝ وَ لَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِیَہۡ ۝

(۲۵-۲۶/۶۹) اے کاش! مجھے یہ اعمال نامہ نہ ہی ملا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ میرا حساب میرے سامنے کیوں آگیا۔ اس کا مجھے علم نہ ہی ہوتا تو ٹھیک تھا۔ (نیز ۷-۱۱/۸۴)۔ اس وقت انسان کے سارے بھید کھل جائیں گے۔ (یَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ (۱۰/۱۰۰) اور دلوں کے راز باہر آجائیں گے۔

اس مقام پر ذرا رکیے۔ ہم اس دنیا میں ہزاروں اشخاص سے ملتے ہیں۔ ہم کیریکٹر کے اعتبار سے (اندر سے) کچھ اور ہوتے ہیں لیکن بظاہر ان سے کسی اور طرح معاملہ کرتے ہیں اور اس طرح ان کی نظروں میں بڑے معتبر بنے رہتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں کو اپنے خلوص اور دیانت کا یقین دلاتے رہتے ہیں لیکن دل میں ان کے متعلق کچھ اور ہی خیالات رکھتے ہیں۔ ہم اپنے ملنے والوں کی نگاہوں میں بڑے مقدس اور پاکباز بنے رہتے ہیں کیونکہ ہماری حقیقت ان کے سامنے نہیں آنے پاتی۔ ہم اسی طرح معتبر اور معتمد علیہ بنے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اب ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ وہ تمام لوگ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں جن کی نگاہوں میں ہم نے اپنے آپ کو اس قدر دیانتدار، پاکیزہ، مقدس، پُرخلوص، صادق بن کر دکھایا تھا اور ان کی موجودگی میں ہماری اصل و حقیقت اس طرح واشگاف طور پر سامنے آجائے کہ کسی کو اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ رہے تو سوچئے کہ اس وقت ہمارا حشر کیا ہوگا؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور عذاب بھی ہو سکتا ہے کہ انسان ان کی نظروں میں بے نقاب ہو جائے جن میں وہ بڑا معتبر بنا رہا تھا؟ یہ ہے جو کچھ انسان کا یہ "اعمال نامہ" کرے گا۔

لیکن (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ اعمال نامہ، یہ کتابِ مبین کہیں باہر نہیں ہے۔ كُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ ؕ ہر انسان کا اعمال نامہ خود اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ وَنُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلۡقٰهُ مَنۡشُوۡرًا ۝ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جائے گا اور انسان سے کہا جائے گا کہ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ تو اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھ۔ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ۝ (۱۳-۱۴/۱۷) اور اپنا حساب بھی آپ ہی کرلے۔ تو اپنا حساب کرنے کے لئے خود آپ کافی ہے۔ اس کے لئے کہیں باہر سے اکاؤنٹنٹ یا آڈیٹر بلانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اعمال نامہ انسان کی اپنی ذات ہے جس پر اس کے ہر عمل کا نتیجہ منقوش ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے انسان اپنے اعمال کا کاتب بھی آپ ہے اور محاسب بھی آپ۔ یہی وہ اعمال نامہ ہے جس کے بے نقاب ہو جانے سے مجرمین چیخ اٹھیں گے (۴۹/۱۸)۔ اس وقت انسان کی یہ کیفیت

ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے اپنی حقیقت کو چھپاتا ہے اور اگر اس کا کوئی عیب ظاہر ہونے لگتا ہے تو ایسے گواہ پیدا کر لیتا ہے جو اس کی پاک بازی کی شہادت دے دیں۔ یہ کچھ تو وہ دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے کرتا ہے۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے' اس کی اپنی عقلِ فریب کار' اس کے ہر غلط کام کے جواز میں بیسیوں نگاہ فریب دلیلیں تراش کر اسے دھوکے میں رکھتی ہے یا یوں کہیئے کہ وہ اس طرح خود اپنے آپ کو دھوکا دے لیتا ہے۔ لیکن ظہورِ نتائج کے وقت صورت اس کے بالکل برعکس ہوگی۔ اس وقت بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ۝ (۷۵/۱۵-۱۴) انسان خود اپنے خلاف آپ گواہی دے گا اور خود فریبی کے لئے جو جھوٹے بہانے اس نے اس سے پہلے تراشے تھے ' ان سب کی تردید آپ کر دے گا۔

یوں انسان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہو کر رہے گا ـــ افراد کا بھی اور اقوام کا بھی (۴۵/۲۸)۔ لیکن اقوام کے متعلق ہم گفتگو آگے چل کر کریں گے۔

پانچواں باب

لِقاءِ رَبْ

مجُرم کو جب ارتکابِ جُرم کے بعد، سزا کا احساس ہوتا ہے تو وہ فرار ہو جاتا ہے تاکہ اسے عدالت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ (پولیس اسے مفرور یا اشتہاری ملزم قرار دے دیتی ہے)۔

یا (مثلاً) ایک شخص کسی کے خلاف (اس کی غیبت میں) کچھ کہتا ہے لیکن جب اس کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اس شخص کا سامنا کرنے سے ہچکچاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے، قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیریت کی وضاحت اور اس کے اٹل ہونے کی حقیقت کی تبیین کے لئے کہا ہے کہ تم ارتکابِ جرم کے بعد کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ تمہیں خدا کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ تم اس سے بچ کر کہیں روپوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے اس نے "لقاءِ ربّ[1]" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی خدا کی ملاقات یا آمنا سامنا۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس "لقاءِ ربّ" کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت خدا، انسان کے سامنے نہیں۔ ایسا صرف مرنے کے بعد ہوگا جب

---

[1] قرآنِ کریم نے، خدا کے تخلیقی شاہکاروں پر غور و خوض کے بعد، اس حقیقت پر پہنچ جانے کو کہ یہ کارگہِ کائنات اس کی حکمتِ بالغہ کی رُو سے کس قدر صحیح اور غیر متبدل قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے، بعض مقامات پر لقاءِ ربّ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس طرح یوں سمجھو گویا انسان خدا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم لقاءِ ربّ کا تصور صرف قانونِ مکافات کی رو سے پیش کر رہے ہیں۔

انسان "حشر کے میدان میں" خدا کے سامنے حاضر ہوگا. مرنے کے بعد "خدا کے حضور جانے" کے متعلق آگے چل کر گفتگو ہوگی. اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اصطلاح بھی ہمارے عدالتی نظام کی تشبیہ کے طور پر سمجھانے کے لئے استعمال کی گئی ہے. خدا کا قانونِ مکافات ہر آن اور ہر جگہ انسان کے سامنے موجود رہتا ہے اور انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کے مطابق ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے. اس اعتبار سے' انسان' اپنی زندگی کے ہر سانس میں عدالتِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے. "لِقَآءِ رَبّ" کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے. اسی کو بعض مقامات پر "رجعت الی اللّٰہ" (خدا کی طرف لوٹنے) کے الفاظ سے بھی واضح کیا گیا ہے. رجعت الی اللّٰہ ـ یا ـ خدا کی طرف لوٹنے کے بھی یہ معنی نہیں کہ پہلے ہم کہیں خدا کے پاس رہتے تھے. پھر وہاں سے دنیا میں آ گئے' اور' مرنے کے بعد پھر وہیں' اس کے پاس چلے جائیں گے. یہ تصور صحیح نہیں. جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت سے لکھ چکے ہیں' خدا اس وقت بھی ہر آن ہمارے پاس ہوتا ہے. وہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے. اس لئے اس سے "جدا ہو کر دنیا میں آنے اور مرنے کے بعد اس سے پھر جا کر ملنے" کا تصور' قرآنی نہیں. اس سے بھی یہی مراد ہے کہ تم جہاں بھی ہو تمہارا ہر قدم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف اُٹھ رہا ہے. تم کشاں کشاں اُس کی طرف جا رہے ہو. تمہیں اس سے مفر ہی نہیں. "اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کے یہی معنی ہیں.

چونکہ' انسانی اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھی سامنے آسکتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں یقیناً سامنے آئے گا' اس لئے "لقاء رب" یا "رجعت الی اللّٰہ" کا عمل اس زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ہوگا. یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق' انسان کا اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کرنا ــــ چاہے اس دنیا میں' چاہے اس کے بعد ــ لہٰذا' جہاں قرآنِ کریم میں مرنے کے بعد بھی "لقاء رب" یا "رجعت الی اللّٰہ" کا ذکر آتا ہے' وہاں بھی اس سے یہی مراد ہے. (مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا).

اس وضاحت کے بعد لقاء رب یا رجعت الی اللّٰہ کے متعلق قرآنِ کریم کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے.

لِقَآءِ رَبّ پر ایمان

سورۂ انعام میں ہے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدائی راہ نمائی آئی. لَعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ

یُوۡمِنُوۡنَ (۶/۱۵۵)؛ (۳۲/۲۳) تاکہ وہ اپنے رب کے سامنے جانے پر ایمان رکھیں۔ یعنی وہ اس بات کا یقین کریں کہ ان کا ہر عمل، خدا کے مقرّر کردہ قانون کے مطابق، نتیجہ پیدا کر کے رہے گا۔ سورۂ رعد میں ہے کہ قرآنِ کریم میں قوانینِ خداوندی کو اس طرح نکھارا اور ابھار کر اس لئے بیان کیا گیا ہے۔ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ○ (۱۳/۲) تاکہ تم اپنے رب کے سامنے جانے کا یقین کر لو۔ مومنین کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ انہیں اس بات کا ہر وقت خیال رہتا ہے کہ انہوں نے اپنے رب کے سامنے جانا ہے۔ اس لئے ان کا ہر قدم اسی طرف اٹھتا ہے (۲/۴۶)۔ جس دن وہ اپنے رب کے سامنے جائیں گے (یعنی ظہورِ نتائج کے وقت) انہیں سلامتی کے مژدۂ جانفزا سے نوازا جائے گا (۳۳/۴۴)۔

اس کے برعکس، جو لوگ "لقاءِ رب" پر یقین نہیں رکھتے وہ آخر الامر تباہ و برباد ہو جائیں گے (۶/۳۱)؛ (۱۰/۴۵)۔ جسے اس بات پر یقین ہی نہیں کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے وہ بلا دریغ سنکھیا کھا لے گا اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ ایسے لوگوں کی نگاہ ہمیشہ مفادِ عاجلہ پر رہتی ہے۔ یعنی ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ جس طریق سے بھی ہو سکے دنیاوی مفاد حاصل کر لئے جائیں اور جب انہیں یہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ مقصدِ زندگی حاصل ہو گیا۔

> اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِهَا وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ (۱۰/۷)
>
> جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی توقع نہیں رکھتے اور مفادِ دنیا ہی کو مقصودِ حیات سمجھ کر اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں وہ جائز اور ناجائز کی پرواہ ہی نہیں کرتے اور قوانینِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

یہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں کے نشہ میں بدمست، اپنی غلط روی میں آنکھیں بند کر کے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں (۱۰/۱۱)۔ انہیں جائز اور ناجائز کی تمیز کی تلقین بڑی ناگوار گذرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس قرآن کے اتباع کے لئے تیار نہیں جو ہماری بے محابا مفاد پرستیوں پر حدود و قیود عائد کرتا ہے۔ اگر تم اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں ہماری منشاء کے مطابق تبدیلیاں کر دو تو پھر ہم تمہاری دعوت کو قبول کر لیں گے (۱۰/۱۵)۔ ان سے کہا گیا کہ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل اور اپنی نتیجہ خیزی میں غیر متبدّل ہیں۔ نہ ان میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی مفاہمت کہ ان قوانین

کے ساتھ کچھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین شامل کر کے اس مرکب کو ضابطۂ حیات بنا لیا جائے اور اطمینان حاصل کر لیا جائے کہ ہم تباہیوں سے محفوظ ہو گئے ہیں! کیا سنکھیا میں شکر ملا لینے سے اس کی سمیت زائل ہو سکتی ہے؟ لہٰذا، قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے والے کو تو خالصتہً قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنی ہوگی۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ○ (۱۸/۱۱۰) "سو جو کوئی اپنے رب کے سامنے جانے پر یقین رکھتا ہے اسے صلاحیت بخش کام کرنے چاہئیں اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ کسی اور کے قوانین کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، انسان صحیح روش پر صرف اس صورت میں چل سکتا ہے جب اسے اس بات کا یقین ہو کہ غلط روش پر چلنے سے وہ تباہ ہو جائے گا۔ اگر یہ یقین باقی نہ رہے تو پھر انسان، اپنی غلط روش چھوڑنے کے خلاف ہزار کٹ حجتیاں پیش کرتا ہے۔ اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کبھی کہتے ہیں کہ خدا خود ہمارے سامنے کیوں نہیں آتا یا ہم پر فرشتے نازل ہو کر ہمیں اس سے آگاہ کیوں نہیں کرتے (۲۵/۲۱)۔ حالانکہ یہ ان بستیوں کے کھنڈرات کے پاس سے صبح و شام گذرتے رہتے ہیں جو اس لئے تباہ ہو گئیں کہ انہیں مکافاتِ عمل پر یقین نہیں تھا (۲۵/۴۰)۔ اگر انہیں اس کا یقین ہوتا تو انہیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا کہ غلط روش کے نتیجے میں تباہی آکر رہتی ہے (۲۹/۵)۔

جو شخص قانونِ مکافات پر یقین رکھتا ہے، اگر کبھی اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ جاتا ہے تو اسے اس کا بھی یقین ہوتا ہے کہ اگر میں نے فلاں روش اختیار کر لی تو اس غلط اقدام کے نقصان کی تلافی ہو جائے گی، (اسے خدا کی رحمت کہتے ہیں)۔ لیکن جو شخص سرے سے قانونِ مکافات ہی پر یقین نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اتفاقیہ طور پر (BY CHANCE) ہوتا ہے، اس کے سامنے، غلط اقدام کے نقصان کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کہا گیا کہ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۲۹/۲۳) جو لوگ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور اس پر یقین ہی نہیں رکھتے کہ ہر عمل اپنا خاص نتیجہ پیدا کرتا ہے ــــ غلط عمل نقصان وہ نتیجہ، صحیح عمل منفعت بخش نتیجہ ــــــ وہ

درحقیقت خدا کی اس رحمت سے ناامید رہتے ہیں جو نقصان ہو جانے کے بعد اس کی تلافی کا طریق بتاتی ہے ذرا سوچئے کہ وہ شخص جسے تکلیف سے نجات حاصل کرنے کی کوئی امید باقی نہ رہے' کس قدر الم انگیز اور دردناک اذیت کی زندگی بسر کرتا ہے! انہی کے متعلق کہا کہ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے حصے میں تباہی ہی تباہی ہے۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کا منتہی' جائز و ناجائز' ہر طریق سے' اپنے مفاد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہماری کاریگری بڑی کامیاب ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں اور "اپنے رب کا سامنا کرنے" کا انہیں خیال تک نہیں ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ[1] فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸/۱۰۵-۱۰۳) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کا کیا کرایا آخر الامر غارت ہو جاتا ہے اور ظہورِ نتائج کے وقت یہ دیکھنے کی ضرورت تک نہیں پڑتی کہ ان کا کونسا پلڑا جھکتا ہے۔ (نیز ۳۰/۱۶)؛ (۳۲/۱۴)۔

قانونِ مکافات سے انکار کرنے والے درحقیقت زندگی کے تسلسل (مرنے کے بعد کی زندگی) سے انکار کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ یہ کہتے ہیں کہ جب ہمیں (مرنے کے بعد) مٹی اپنے اندر جذب کر لے گی اور یوں ہمارا خاتمہ ہو جائے گا تو کیا اس کے بعد ہمیں پھر ایک نئی زندگی عطا ہو گی؟ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (۳۲/۱۰) اصل یہ ہے کہ یہ لوگ قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے۔ ورنہ اگر انسان کو اس بات پر یقین ہو کہ انسان کا کوئی عمل نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا تو جن اعمال کے نتائج اس دنیا میں اس کے سامنے نہیں آتے ان کے متعلق وہ لازماً یہ سمجھے گا کہ ان کا نتیجہ مرنے کے بعد سامنے آئے گا۔ یوں قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت پر یقین' لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

حیاتِ آخرت سے متعلق تفصیلی بحث آگے چل کر آتی ہے۔ جہاں تک قانونِ مکافات کا تعلق

---

[1] "حبط اعمال" کی تفصیل آئندہ الگ باب میں ملے گی۔

ہے، اس کے لئے قرآن قوانینِ فطرت پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ نظامِ فطرت پر غور کرنے سے انسان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے؟ کیا اس پر نہیں کہ کارگہِ کائنات کا ذرہ ذرہ قانونِ علّت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ محیّر العقول نظام چل ہی اس بنیاد پر رہا ہے کہ یہاں ہر شے کی حرکت ایک نتیجہ پیدا کرتی ہے اور انہی نتائج کا نام فطرت کے اٹل قوانین ہیں۔ سو جب نظامِ کائنات میں کوئی شے، ان قوانین کے احاطے سے باہر نہیں تو کیا انسان (جو اس زمین پر سلسلۂ کائنات کی آخری کڑی ہے) اس سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سورۂ روم میں ہے کہ کیا یہ لوگ خود اپنی زندگی اور نظامِ کائنات پر غور نہیں کرتے۔ خدا نے اس محیّر العقول کارگہ کو بالحق پیدا کیا ہے۔ بالحق پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے اور ایک خاص نظام کے تابع سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن یہ سلسلہ لامتناہی نہیں۔ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى " یہ ایک معینہ مدت تک کے لئے سرگرمِ عمل رہے گا۔ اس نظامِ کائنات پر غور کرنے سے تم کس نتیجہ پر پہنچتے ہو؟ کیا اس پر نہیں کہ یہاں اٹل قوانین کی حکمرانی ہے۔ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝ (۳۰/۸) لیکن اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت خدا کے قانونِ مکافات سے انکار کرتی ہے۔

اس کے بعد کہا کہ اگر یہ لوگ اس طرح نظامِ کائنات پر غور و تدبّر نہیں کرنا چاہتے تو ان سے کہو کہ اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ. کیا تم اِدھر اُدھر سفر کے لئے نہیں نکلتے اور ان بستیوں کے کھنڈرات پر سے نہیں گزرتے جن میں کبھی ایسی قومیں آباد تھیں جو تم سے بھی زیادہ قوت و شوکت کی مالک تھیں۔ تم ان کھنڈرات پر منقوش ان کی داستانوں کو پڑھو۔ وہ زبانِ حال سے خدا کے قانونِ مکافات کی کارفرمائی کی شہادت دیں گے۔ وہ بتائیں گے کہ فلاں قوم نے فلاں قسم کی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا اور فلاں قوم نے دوسری قسم کا مسلک اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا۔ اس سے تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى..... (۳۰/۱۰-۹) جو لوگ بھی دنیا میں ناہمواریاں پیدا کریں گے ان کا انجام تباہی ہوگا۔ یہی خدا کا قانونِ مکافات ہے۔

یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے کے انسانوں کو مخاطب کر کے کہی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس طریق تفکّر و تدبّر سے قانونِ مکافات کی حقیقت سے علم و آگہی، اسی دور کے انسانوں کے لئے مختص نہیں سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ

لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ ہم انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی اپنی نشانیاں انسانوں کے سامنے لاتے جائیں گے اور جوں جوں فطرت کے مستور حقائق کی پردہ کشائی ہوتی جائے گی، یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ خدا نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک یقینی بات ہے۔ لیکن اس کے باوجود اَلَآ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ (۴۱/۵۳-۵۴) یہ لوگ "لقاءِ رب" کے متعلق شک و شبہ میں پڑے ہیں۔

یوم التلاق

اسی کو (یعنی ظہورِ نتائج کے وقت کو) یوم التلاق کہا گیا ہے۔ یعنی "خدا کے سامنے جانے کا دن" (۴۰/۱۵)۔ سورۃ زمر میں ہے کہ اہلِ جہنم جب دوزخ کے دروازے پر پہنچیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ رَبِّکُمْ وَ یُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ؕ (۳۹/۷۱) کیا تمہارے پاس خدا کے رسول نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے خدا کے قوانین پیش کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے سامنے آنے سے متنبہ کرتے تھے؟ اس دن پھر کوئی راز مستور نہیں رہے گا، کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہے گی۔ اپنے جن اعمال کے متعلق انسان سمجھتا تھا کہ ان سے کوئی واقف نہیں، وہ سب بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے (۶۹/۱۸)۔ یہی "ملاقات کا دن" ہوگا۔ سورۃ زخرف میں اس کے متعلق کہا حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا (۴۳/۳۸) "جب انسان ہمارے پاس آئے گا"۔ دوسری جگہ ہے۔ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ (۷۵/۳۰) اس دن ہر ایک کو اس کے رب کی طرف ہانک کر لیجایا جائے گا۔ سورۃ یٰسٓ میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ○ (۳۶/۵۱) "لوگ لپک کر خدا کی طرف جائیں گے"۔ کہیں اسے وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ سے تعبیر کیا گیا ہے (۶۷/۱۵)۔ یعنی "اسی کی طرف اُٹھ کر جانا ہے"۔ کہیں اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ○ (۶۷/۲۴) کہہ کر یعنی اسی کی طرف اکٹھا ہونا ہے۔ سورۃ غاشیہ میں ہے اِنَّ اِلَیْنَاۤ اِیَابَهُمْ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ ○ (۸۸/۲۵-۲۶) انہیں آخر الامر ہماری طرف آنا ہے اور ہمارے ہی ذمے ان کا حساب لینا ہے۔

رجعت الی اللہ

(اوپر بتایا جا چکا ہے کہ) قانونِ مکافات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ کائنات کو خدا نے بلا مقصد

پیدا نہیں کیا۔ اسی سلسلہ میں خود انسان کے متعلق کہا کہ

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳/۱۱۵)۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف آؤ گے نہیں۔

" بامقصد" پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک مستقبل ہے ـــ کاروانِ حیات کی ایک منزل ہے ـــ اس مستقبل میں ہر فرد کے مقام کا تعین اس کے اعمال کے مطابق ہوگا۔ اسی کو رَجْعَتِ اِلَی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اس مقام پر اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ " اِلَى اللّٰهِ رَاجِعُوْنَ" کے معنی یہ نہیں کہ " ہم پہلے خدا کے پاس تھے' پھر اس سے جدا ہو کر اس دنیا میں آگئے' اس کے بعد پھر اُس سے جا ملیں گے۔" یہ عقیدہ ہندو فلسفہ ویدانت کا ہے اور وہیں سے ہمارے ہاں (تصوف کے رنگ میں) آگیا ہے۔ ویدانت کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانی روح ' (آتما) ' روحِ خداوندی (پرماتما) کا ایک حصہ ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادی دنیا (پراکرتی) کی آلائشوں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ یہ ہے کہ اس روح کو مادی آلائشوں سے نجات دلائی جائے تاکہ یہ پھر اپنی اصل (یعنی روحِ خداوندی) میں جا کر مل جائے اور یوں اس کے فراق کی اذیتیں وصال کی لذتوں میں بدل جائیں۔ انسانی ذات کا اس طرح ' ذاتِ خداوندی میں جذب ہو کر اپنے آپ کو فنا کر دینا ' مقصودِ حیات ہے۔ یہی فلسفہ ہمارے ہاں " وحدتِ وجود " کی شکل میں نمودار ہو گیا جس کے حاملین نے کبھی یہ کہا کہ

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

اور کبھی ان الفاظ میں کہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یہ غیر قرآنی تصور ہے۔ قرآن کی رُو سے ' انسانی ذات ' ذاتِ خداوندی کا جُزو نہیں ' اس کی عطا کردہ خصوصیتِ کبریٰ ہے جو انسان کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی۔ اسی سے یہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور اپنے اعمال کی ذمہ داریوں کا حامل۔ انسان کو اس کی ذات ' غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملی ہے۔ سطحِ ارض پر انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ذات کی اس حد تک نشوونما

ہو جائے کہ یہ زندگی کے اگلے ارتقائی مرحلہ میں پہنچنے کے قابل قرار پا جائے۔ (تفصیل ان امور کی حیات بعد الممات سے متعلق باب میں ملے گی)۔ اس وقت صرف اتنی وضاحت مقصود تھی کہ رجعت الی اللہ، سے مراد، خدا کی طرف واپس لوٹ کر، ذات کا اپنی اصل سے مل جانا نہیں' اس سے مراد' اپنے اعمال کے نتیجہ کے لئے، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف کشاں کشاں جانا ہے۔ اس سلسلہ میں "رجعت" کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مجرم' ارتکابِ جرم کے بعد' جرم کے جائے وقوع سے بھاگ جاتا ہے اور اثباتِ جرم کے لئے اسے پکڑ کر وہیں لایا جاتا ہے۔ "رجعت الی اللہ" سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تم ارتکابِ جرم کے بعد، کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ تم جس طرف بھی بھاگ کر جاؤ گے' خدا کا قانونِ مکافات' تمہارے سامنے ہو گا' اس لئے یوں سمجھو کہ اس بھاگنے میں بھی تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ تم اپنی دانست میں سمجھ رہے ہو کہ تم جرم کے جائے وقوع سے بھاگ کر کسی اور سمت کو جا رہے ہو لیکن درحقیقت تم لوٹ کر وہیں آ رہے ہو۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ؀ (۹۶/۸)۔

اِس دُنیا میں رجعت الی اللہ

یہ انسان کے ہر قدم کا خدا کی طرف اُٹھنا۔ یہ' اس کا ایک "مفرور مجرم" کی طرح' پلٹ کر عدالت کی طرف آنا' اس دنیا میں بھی ہوتا ہے (اور مرنے کے بعد بھی ہو گا)۔ یہ جو اس نے کہا ہے کہ اِلَیْنَا رَاجِعُوْنَ (۲۱/۹۳)۔ تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم (مرنے کے بعد) ہماری طرف پلٹ کر آؤ گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم' ہر قدم پر' ہماری طرف پلٹ کر آ رہے ہو۔ (رَاجِعٌ کے یہ معنی ہیں)۔ کہیں کہا ہے۔ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا (۱۰/۴)۔ کہیں اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ آیا ہے (۲۸/۷۰)[1]۔ سورۂ مومن میں ہے اَنَّ مَرَدَّنَا اِلَی اللّٰهِ (۴۰/۴۳)۔ سورۂ زخرف میں ہے وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ؀ (۴۳/۱۴)۔

---

[1] رجعت الی اللہ کا ذکر ان آیات میں بھی آیا ہے۔

(۱۰/۴۶)؛ (۱۱/۴)؛ (۱۹/۴۰)؛ (۲۱/۳۵)؛ (۲۸/۸۸)؛ (۲۹/۱۷)؛ (۲۹/۲۱)؛ (۳۰/۱۱)؛ (۳۶/۸۳)؛

(۳۹/۴۴)؛ (۴۰/۴۳)؛ (۴۱/۲۱)؛ (۴۳/۱۳)؛ (۴۳/۸۵)؛ (۴۵/۱۵)؛ (۱۰/۴)؛ (۲۸/۷۹)۔

ضمناً یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ سورۃ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ دنیا میں آسمانی انقلاب برپا کرنے کے لئے اُٹھتے ہیں انہیں قدم قدم پر سخت صبر آزما تصادمات اور ہمت شکن تزاحمات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ ان مقامات پر گھبراتے نہیں بلکہ جب بھی کوئی نیا صبر آزما مرحلہ سامنے آتا ہے تو وہ دل کی پوری جمعیت و سکون اور جگر کے بلند حوصلہ اور ہمت سے بیساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ (۲/۱۵۶) ہم نے اپنے آپ کو خدا کے پروگرام کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس لئے ان مصائب اور مشکلات سے ہم اپنا منہ نہیں موڑیں گے۔ ہمارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا چلا جائے گا جسے ہم نے خدا کی راہ نمائی کے مطابق اپنے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ ہجوم مصائب آتا ہے تو آئے، مشکلات کے طوفان اٹھتے ہیں تو اٹھیں، ہم بلا خوف و خطر اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے۔ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اس زندگی میں انسان، اپنے ہر سانس میں رجعت الی اللہ کر رہا ہے۔ یعنی اس کا ہر قدم خدا کے قانونِ مکافات کی طرف اُٹھ رہا ہے تاکہ اس کے عمل کا نتیجہ اس کے مطابق مرتب ہو۔ قرآنِ کریم نے خود ہی بتا دیا کہ رجعت الی اللہ کا مقصد کیا ہے۔ کہا کہ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (۵/۱۰۵) تم سب کی رجعت خدا کی طرف ہے۔ پس وہ تمہیں تمہارے اعمال کے متعلق سب کچھ بتا دے گا۔ (نیز ۶/۶۰؛ ۵/۴۸؛ ۶/۱۶۵؛ ۱۰/۲۳؛ ۲۴/۶۴؛ ۲۹/۸؛ ۳۱/۱۵؛ ۳۱/۲۳؛ ۳۹/۷)۔

موت کے بعد رجعت الی اللہ

لیکن رجعت الی اللہ کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم کی رُو سے انسانی اعمال کے نتائج کی آماجگاہ یہی زندگی نہیں، موت کے بعد کی زندگی بھی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں مختلف مقامات میں موت کے بعد رجعت الی اللہ کا ذکر بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (۲/۲۸) تم خدا سے کس طرح انکار کر سکتے ہو۔ ذرا اپنی حالت پر غور کرو خدا نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بےجان مادہ سے کی، پھر تم ارتقائی منازل طے کر کے پیکرِ بشریت میں پہنچے۔ طبیعی زندگی پوری کر لینے کے بعد تم مر جاتے ہو۔ اس کے وہ تمہیں پھر زندگی عطا کرتا ہے۔ ان تمام مراحل میں تم اس

کے قانون کے دائرے میں گھرے رہتے ہو، تو مرنے کے بعد تم اس دائرے سے کس طرح باہر نکل جاؤ گے؟ اب بھی تمہارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے، مرنے کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا۔ سورۂ انعام میں ہے۔ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۶/۳۶) خدا مُردوں کو اٹھائے گا تو وہ اس کی طرف جائیں گے۔ اس رجعت الی اللہ سے بھی مقصود مکافاتِ عمل کی رُو سے نتیجہ خیزی ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ میں واضح کر دیا جہاں کہا کہ

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۹/۱۰۵)۔

ان سے کہو کہ تم کام کرو۔ خدا، اس کا رسولؐ اور جماعتِ مومنین تمہارے اعمال کو دیکھ لینگے۔ پھر تم خدائے عالم الغیب والشہادت کی طرف لوٹائے جاؤ گے تاکہ وہ بتا دے کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔

اس سے رجعت الی اللہ کا مقصود واضح ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات میں آیا ہے۔ مثلاً (۹/۹۴ ؛ ۱۰/۷۰ ؛ ۱۱/۲۵ ؛ ۲۴/۶۴ ؛ ۲۹/۵۷ ؛ ۳۰/۱۱ ؛ ۳۲/۱۱ ؛ ۳۶/۲۲ ؛ ۳۶/۸۳ ؛ ۵۰/۴۳ ؛ ۶۲/۸ ؛ ۶۴/۳)۔

تمام امور خدا کی طرف لوٹتے ہیں

مذکورہ صدر آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسان خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف لوٹتے ہیں جس کے مطابق ان کے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دوسرے مقامات میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام امور آخر الامر خدا کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ دنیا کے ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲/۲۱۰) ؛ (۱۱/۱۲۳) ؛ (۲۲/۷۶ ؛ ۳۵/۴)۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۳/۸۲)۔

کیا یہ قانونِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنا لوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اسی کے قانون کے سامنے سجدہ ریز ہے اور ان کا ہر

قدم اسی کے قانونِ مکافات کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ (نیز ۳/۱۰۸)۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ؏ (۴۲/۵۳) اس حقیقت سے باخبر رہو کہ تمام معاملات اپنے آخری فیصلہ کے لئے خدا کے قانونِ مکافات ہی کی طرف جاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ٥ (۵۷/۵) کائنات میں اختیار و اقتدار اسی کا ہے اور ہر معاملہ کا فیصلہ اسی کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ (نیز ۸/۴۴)۔ سورۂ مریم میں ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ٥ (۱۹/۴۰) زمین اور جو کچھ اس پر ہے وہ سب خدا کی ملک ہے اور اس کے قانونِ مکافات کے مطابق ہر معاملہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یعنی خارجی کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کے قانونِ علّت و معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ انسانی دنیا میں ہر فرد کے اعمال کے نتائج بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور اقوام کا مستقبل بھی اسی کی رُو سے متعین ہوتا ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ؕ وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ؏ (۳۶/۳۲ — ۳۱)۔

کیا انہوں نے تاریخ کی اس شہادت پر غور نہیں کیا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اقوام کو اس طرح تباہ کر دیا کہ وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ لہٰذا اقوامِ سابقہ ہوں یا یہ قومِ مخاطب' ان سب کو اپنے انجام و مآل کے لئے ہمارے قانونِ مکافات کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

جو قوم اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ اس کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوتا ہے' وہ کبھی ظلم و استبداد اور سلب و نہب کی روش اختیار نہیں کرتی کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی روش کا نتیجہ خود ان کی اپنی تباہی ہے۔ ظلم و استبداد پر وہی قوم اُترتی ہے جسے قانونِ مکافات پر یقین نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرعون اور اس کے جیوش و عساکر کے متعلق کہا۔

وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ٥ (۲۸/۳۹)۔

فرعون اور اس کے لشکروں نے ملک میں ناحق دھاندلی مچا رکھی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس زعمِ باطل میں تھے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج کے لئے ہماری طرف نہیں آئیں گے۔

ان کے برعکس، جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا تو انہوں نے اسے بلا توقف قبول کر لیا۔ اس پر جب فرعون نے انتہائی جلال آمیز انداز سے کہا کہ میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا، تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا تو انہوں نے دل کے انتہائی اطمینان کے ساتھ کہہ دیا کہ تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر لے۔ تیرا حکم ہماری طبیعی زندگی تک ہی چل سکتا ہے، اس سے آگے تیری دسترس ہی نہیں ہو سکتی اور ہم اس حقیقت کو جان چکے ہیں کہ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ٥ (۷/۱۲۵) معاملات کے حقیقی فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتے ہیں، ہمارے معاملہ کا صحیح فیصلہ بھی اسی کی عدالت سے ہوگا۔ تمہارے فیصلے کی ہمارے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں۔ یہی وہ یقینِ محکم ہے جس سے انسان کو سچا اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے (۲۸/۸۹-۲۷۱)۔ اور یہی ہر مومن کا ایمان و اعلان ہوتا ہے کہ — وَ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ٥ (۴۳/۱۴) ہمیں اپنے ہر معاملہ کے فیصلہ کے لئے عدالتِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا ہے۔

چھٹا باب

توبہ ـــــ مغفرت

ایک مریض ڈاکٹر کے پاس آیا۔ وہ دردِ گردہ سے بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب! میں رات اچھا بھلا سویا تھا۔ آدھی رات کو اچانک درد اُٹھا اور صبح تک اس نے مجھے ادھ موا کر دیا ہے۔ معلوم نہیں یہ آناً فاناً ہو کیا گیا؟ ڈاکٹر نے مریض کا ایکسرے (X-RAY) لیا اور اس سے کہا کہ تمہارے گردے میں تین پتھریاں ہیں۔ یہ کچھ تمہیں آناً فاناً نہیں ہوگیا' کم از کم سال بھر سے یہ پتھریاں بن رہی تھیں۔ اگر تم پہلے "چیک اپ" (CHECK-UP) کرا لیتے تو اسی وقت ان کا علاج ہو جاتا۔ تم نے تغافل برتا۔ اب گردے کا آپریشن ہوگا۔

اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر نمودار ہونے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے یوں سامنے آنے کی مدت کو مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔

ـــــــ (۰) ـــــــ

اب دوسرا کیس لیجئے۔ تپ دق کا مریض ڈاکٹر کے پاس لایا گیا۔ اس کے تیمار دار نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ میرا جوان بیٹا سال بھر سے بخار میں مبتلا ہے۔ یہ بڑا تندرست اور توانا تھا۔ مرض نے گھلا گھلا کر اسے مردہ بنا دیا ہے۔ اس کا کچھ کیجئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نوجوان میں بڑی ہی قوتِ مدافعت تھی جو وہ اس موذی مرض کا اتنے عرصہ تک مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن اب اس کی

قوتِ مدافعت کم ہو رہی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ مرض ایسی شکل اختیار نہ کرلے کہ اس کی قوتِ مدافعت اس کا مقابلہ نہ کرسکے اگر اس میں اتنی قوتِ مدافعت پیدا نہ ہوسکی تو پھر مرض اس پر غالب آجائے گا اور اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

یا مثلاً شہر میں وبا پھیل گئی۔ کچھ لوگ پہلے ہی دو تین دن کے اندر مر گئے۔ بعض کچھ دنوں کے بعد اس کا شکار ہوئے اور بعض ایسے بھی تھے کہ یا تو مرض نے انہیں چھوا تک بھی نہیں۔ اور اگر وہ اس کی لپیٹ میں آبھی گئے تو بچ گئے۔ مرے نہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جن لوگوں میں قوتِ مدافعت کی کمی تھی وہ شروع ہی میں اس تخریبی حملہ کا شکار ہو گئے۔ جن میں قوتِ مدافعت قدرے زیادہ تھی، وہ چند دن تک اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ جن کی قوتِ مدافعت کافی زیادہ تھی، مرض نے حملہ تو ان پر بھی اسی طرح کیا لیکن انہوں نے اس کا مقابلہ کر لیا اور مرض مغلوب ہو گیا۔

اس سے واضح ہے کہ دنیا میں تخریبی اور تعمیری قوتوں کی کشمکش کا سلسلہ ہر آن جاری رہتا ہے۔ جب تک تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں پر غالب رہتی ہیں اسے صحت، توانائی اور زندگی کہا جاتا ہے۔ جب تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں تو اسے کمزوری، بیماری اور بالآخر موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ کمزوری اور بیماری (حتیٰ کہ موت کے وقت بھی) تعمیری قوتیں کسی نہ کسی حد تک جسم میں موجود ہوتی ہیں لیکن تخریبی قوتوں کا پلڑا اس قدر بھاری ہو جاتا ہے کہ تعمیری قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

(۱۰)

مُہلت کا وقفہ

جس قسم کے قوانین انسان کی طبیعی زندگی پر کارفرما ہیں، اس قسم کے قوانین کا اطلاق اس کی "انسانی زندگی" پر بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک ایک فرد کا تعلق ہے، یہ بتایا جاچکا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ غلط اعمال وہ ہیں جن سے انسان کی ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اچھے کام وہ ہیں جن سے اس کی ذات نشوونما پاکر مستحکم ہوتی جاتی اور اس طرح زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ غلط کاموں کو آپ تخریبی قوتیں کہئے اور صحیح کاموں کو تعمیری قوتیں۔ (اقوام کی صورت میں کیا ہوتا ہے، اس کی بابت متعلقہ عنوان میں بتایا جائے گا)۔ ان تعمیری اور تخریبی قوتوں میں

باہمی کشمکش کا سلسلہ ہر آن جاری رہتا ہے۔ اس کشمکش میں جب تک تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہتا ہے انسان تباہی سے محفوظ رہتا ہے۔ جب تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، تو یہ پہلے مضمحل ہوجاتا ہے اور آخرالامر اس پر تباہی آجاتی ہے۔ یہ مدت جس میں تخریبی قوتیں اس طرح غالب نہیں آجاتیں کہ تعمیری قوتیں اٹھنے کے قابل ہی نہ رہیں، مہلت کا وقفہ کہلاتا ہے۔ قانونِ مکافات میں یہ مہلت کا وقفہ فی الواقعہ خدا کی بڑی رحمت ہے۔ ورنہ اگر یہ ہوتا کہ جونہی انسان سے کوئی غلط عمل سرزد ہوتا، یہ تباہ ہوجاتا، تو کوئی انسان تباہی سے بچ ہی نہ سکتا۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (۱۶/۶۱)

اگر ایسا ہوتا کہ جونہی لوگ زیادتی کرتے تو ان پر فوری گرفت ہوجاتی تو صفحۂ ارض پر کوئی ذی حیات باقی ہی نہ بچتا۔ لیکن خدا نے عمل اور اس کے نتیجہ میں ایک وقفہ رکھا ہے۔ اس دوران میں اس کی بازیابی کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ مہلت کا وقفہ پورا ہوجاتا ہے تو پھر ظہورِ نتائج میں ذرا بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

سورۂ کہف میں اس مہلت کے وقفہ کے متعلق کہا کہ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ۔ خدا کا مقصد لوگوں کی پکڑ دھکڑ نہیں۔ وہ درحقیقت ان کی حفاظت اور نشوونما چاہتا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ اور جونہی کسی کا غلط قدم اُٹھتا، اس کا مواخذہ ہوجاتا تو ان پر فوراً تباہی آجایا کرتی۔ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ............لیکن ان کے لئے ایک مہلت کا وقفہ ہے۔ اس کے دوران، انسان کو سامانِ حفاظت مل سکتا ہے۔ لیکن یہ اگر رخصت سے فائدہ نہ اٹھائے تو اس کے بعد اسے اس تباہی سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی (۳۵/۴۵)؛ (۱۸/۵۸)۔

اجلِ مسمّٰی

عمل اور اس کے نتیجے کے درمیانی وقفہ کو اجل سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ (اَجَلْ کے معنی میعاد ہوتی ہے)۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ. خدا چاہتا ہے کہ

تمہیں تباہی سے سامانِ حفاظت مل جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے کہا یہ ہے کہ وَ يُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ (۱۴/۱۰) تمہاری تباہی کو ایک معین مدت تک کے لئے مؤخر کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ (۲۰/۱۲۹) اگر خدا نے پہلے ہی سے قانونِ مہلت مقرر نہ کر دیا ہوتا تو غلط عمل کے ساتھ ہی تباہی آجایا کرتی لیکن اس نے عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان مہلت کا عرصہ مقرر کر رکھا ہے۔ (نیز ۴۲/۱۴)۔

اِنسان اس سے غلط فائدہ اُٹھاتا ہے

مُہلت کا وقفہ اس لئے ملتا ہے کہ انسان (آخری تباہی آنے سے پہلے) اس سے بچنے کا سامان کرلے۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قانونِ عدل کے ساتھ قانونِ مہلت، خدا کی بہت بڑی رحمت ہے) لیکن غلط بیں انسان، اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے، الٹا گمراہی میں پڑجاتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ میں نے یہ ظلم و زیادتی کی۔ تم کہتے تھے کہ ظلم کرنے والا تباہ ہوجاتا ہے۔ لیکن مجھے دیکھو کہ میں اسی طرح دندناتا پھر رہا ہوں۔ بلکہ ہر روز اور زیادہ پنپتا چلا جاتا ہوں۔ اگر خدا کا قانونِ مکافات فی الواقعہ کہیں موجود ہے تو وہ میری گرفت کیوں نہیں کرتا۔ وہ اس سے خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ غلط معاشرہ میں، غلط اعمال اتنی سرعت اور شدت سے پھیلتے ہی اس لئے ہیں کہ معاشرہ کا قانون، غلط کام کرنے والوں کا مؤاخذہ نہیں کرتا اور خدا کا قانونِ مکافات بھی ان کی فوری گرفت نہیں کرتا۔ سورۂ سبا میں ہے۔ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۳۴/۲۹)۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہماری غلط روش پر ہماری گرفت ہوگی، تو پھر بتاؤ کہ وہ کب ہوگی؟ اب تک تو ہمیں کچھ ہوا نہیں۔ جواب میں کہا گیا کہ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ۔ ان سے کہہ دو کہ اس کے لئے ایک مہلت کا وقفہ ہے لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّ لَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (۳۴/۳۰) مہلت کی اس مدت میں ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ سورۂ ابراہیم میں، اسی قسم کا اعتراض کرنے والوں سے کہا گیا کہ خدا نے یہ مہلت کا وقفہ تو اس لئے مقرر کیا تھا کہ تم اس دوران میں اپنی حفاظت کا سامان کرلو اور تم الٹے شک میں پڑگئے کہ جو کچھ کہا جارہا ہے وہ

فی الواقعہ ہو گا بھی یا نہیں (۱۴/۱۰)۔ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو قطعاً یہ گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ انکا مواخذہ نہیں ہو گا۔ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۝ (۱۴/۴۲) اسے ہم اس کے وقتِ مقررہ تک کے لئے مؤخر کیا گیا ہے اور جب وہ اپنے وقت پر آئے گا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ یہ لوگ اپنی تباہی کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ اگر ہماری غلط روی کا نتیجہ ہماری تباہی ہے تو وہ تباہی آتی کیوں نہیں۔ وَ لَوْ لَا اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ۚ اگر ہمارے قانونِ مکافات میں مہلت کا وقفہ نہ رکھا جاتا تو ان پر یہ تباہی کبھی کی آچکی ہوتی۔ وَلَیَاْتِیَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (۲۹/۵۳) جب یہ مدت پوری ہو گئی تو اس وقت یہ تباہی اس طرح اچانک آجائے گی کہ ان کی عقل و فکر میں بھی یہ بات نہیں آئے گی کہ وہ کیسے آگئی اور کہاں سے آگئی۔ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپؐ ان لوگوں کے اس قسم کے اعتراضات سے پریشان نہ ہوں۔ فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ۚ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی جھوٹی ہے تم انہیں میرے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ ہم انہیں بتدریج آہستہ آہستہ ان کی تباہی کے اس مقام کی طرف لئے جا رہے ہیں جس کا انہیں اس وقت کچھ علم نہیں۔ وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ۚ میں نے انہیں مہلت دے رکھی ہے۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہو گی۔ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۝ (۶۸/۴۴-۴۵) میری تدابیر بڑی محکم ہوتی ہیں۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ناکام رہ جائیں۔ ایضاً ۱۱/۱۴؛ ۱۱/۶۳؛ ۱۶/۸۶)۔

یہ مہلت کا وقفہ مختلف جرائم کی صورت میں مختلف ہوتا ہے ۔۔۔ کیلا چھ مہینے میں پھل دینے لگ جاتا ہے۔ کھجور کے درخت (کے متعلق کہتے ہیں کہ) چالیس سال میں جا کر پھل لاتا ہے ۔۔۔ اس مہلت کے وقفہ کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ اسی لئے مخالفین کے اس سوال کے جواب میں (کہ یہ تباہی کب آئے گی) آپؐ نے کہا کہ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ۝ (۷۲/۲۵) میں نہیں کہہ سکتا کہ جس تباہی کی بابت تم سے کہا جاتا ہے وہ قریب ہی ہے یا کچھ عرصہ بعد آئے گی۔

مخالفین تو اس قسم کے سوال، اعتراض کے طور پر کرتے تھے، لیکن خود جماعتِ مومنین کے دل میں بھی اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا فطری تھا کہ ہم اتنے عرصہ سے اس کشمکش میں مسلسل

مصروفِ تگ وتاز ہیں' معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک رہے گا اور کب ہماری کامیابی اور فریقِ مخالف کو شکست ہو گی۔ قرآنِ کریم شاہد ہے کہ خود نبیٔ اکرمؐ کے دل میں بھی بعض اوقات اسی قسم کے خیالات اُبھرتے تھے کہ معلوم نہیں کہ میں اپنی زندگی میں وہ دن دیکھ سکوں گا یا نہیں جب ہماری مجاہدانہ کوششیں بارآور ہوں گی۔ جب حق کو غلبہ حاصل ہو گا اور باطل کی قوتیں سرنگوں ہوں گی۔ اس کے جواب میں حضورؐ سے کہا گیا کہ اِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری تگ وتاز کے محسوس نتائج تمہاری زندگی میں ہی سامنے آجائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تمہاری وفات کے بعد برآمد ہوں۔ تمہیں اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ایسا کب ہو گا۔ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ ○ (۱۳/۴۰) تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس دعوت کو عام کرتے جاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ اس کے نتائج کب برآمد ہوتے ہیں۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) ہر میعاد کے لئے بھی ایک قانون مقرر ہے لیکن اس قانون کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ (نیز ۱۱/۴۹؛ ۲۳/۹۵؛ ۴۳/۴۲)۔ ظاہر ہے کہ جماعتِ مومنین کے لئے یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو اس طولِ طویل عرصہ میں ان کا حوصلہ بلند رکھتی ہے اور ان کی مجاہدانہ سعی وعمل میں فرق نہیں آنے دیتی؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک کسان' زمین درست کر کے اس میں بیج ڈال دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر صبح گھر سے نکلتا ہے' چلچلاتی دھوپ میں سارا دن' اپنا لہو پسینہ ایک کر کے مصروفِ محنت رہتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ واپس گھر آجاتا ہے — اور دوسری صبح پھر گھر سے نکل کر اسی عزم اور ہمت سے کھیت کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ ایسا ایک دن' دو دن' دس دن' مہینہ بھر نہیں کرتا۔ مہینوں ایسا ہی کرتا چلا جاتا ہے اور کسی مقام پر یہ کہہ کر نہیں بیٹھ جاتا کہ میں سارا دن محنت کرتا ہوں اور شام کو خالی ہاتھ گھر واپس چلا آتا ہوں۔ مجھے اس سے ملتا کیا ہے۔ میں اس سعیٔ لاحاصل میں اپنی جان کیوں کھپاؤں؟ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا ایسا جذبہ ہے۔ کون سا خیال ہے' جو اسے اس سعیٔ پیہم پر آمادہ کئے رکھتا ہے اور کبھی ہمت نہیں ہارنے دیتا۔ یہ جذبہ اور یہ خیال' اس کا اس بات پر "ایمان" ہے کہ میری محنت رائگاں نہیں جائے گی۔ زمین میں بیج ڈالنے اور فصل تیار ہونے کے درمیان ایک میعاد ہوتی ہے۔ اس میعاد کے ختم ہونے پر میری ساری محنت کا پھل میری جھولی میں آپڑے گا۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اس قسم کے ایمان کو

" ایمان بالغیب" کہتے ہیں. یعنی اپنی محنت کے ان نتائج پر ایمان جو ہنوز محسوس طور پر سامنے نہیں آئے جماعتِ مومنین کا یہی وہ ایمان بالغیب ہے جو انہیں اس قدر جاں گداز اور صبر آزما مراحل میں ہمت نہیں ہارنے دیتا۔ ان کا ایمان ہوتا ہے کہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۴۲/۲۴) ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ حق آخر الامر قائم ہوتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے. لیکن اس میں وقت لگتا ہے اس قسم کی جماعت جو بن دیکھے نتائج پر ایمان رکھ کر مصروفِ سعی و عمل رہتی ہے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی جماعت کہلاتی ہے. یہ وہ (PIONEERS) ہیں جن کے مدارج یقیناً ان لوگوں سے بلند ہوتے ہیں جو اس اسکیم کے درخشندہ نتائج کو اپنی آنکھوں کے سامنے مشہود دیکھ کر اس پروگرام میں شریک ہوں. قرآنِ کریم میں ان السابقون الاوّلون کے علوِ مرتبت اور رفعتِ مدارج کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔

یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی. ہم کہہ یہ رہے تھے کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے. اس وقفہ کی مدت مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے. قوموں کی زندگی میں یہ مدت بڑی طول طویل ہوتی ہے. کیونکہ قوموں کی عمر، افراد کی عمر کی طرح، دنوں، مہینوں اور سالوں کے حساب سے نہیں ماپی جاتی، وہ صدیوں اور قرنوں کے پیمانے سے ماپی جاتی ہے. سورۂ حج میں ہے. وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ۔ یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ تباہی جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو، جلدی کیوں نہیں آتی۔ ان سے کہو کہ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۔ خدا کا قانونِ مکافات بالکل برحق ہے. اگر تباہی میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لو کہ وہ قانون جھوٹا ہے، تمہیں یونہی دھمکی دی جا رہی ہے. وہ قانون بالکل سچا ہے، یہ تباہی آکر رہے گی. بات صرف یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے. اور جہاں تک قوموں کا تعلق ہے یہ وقفہ صدیوں کے حساب سے ماپا جاتا ہے۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲/۴۷) حقیقت یہ ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے. لہٰذا، اگر تمہاری تباہی تمہارے سامنے جلدی سے نہیں آرہی تو اس سے تم اس نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤ کہ خدا کا قانون ہی غلط ہے. اس قانون کی صداقت کی شہادت چاہتے ہو تو تاریخ کے اوراق سے پوچھو. وہ تمہیں بتا دیں گے کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ "کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو ظلم پر ظلم کئے جا رہی تھیں لیکن ان کی گرفت فوراً نہیں ہوتی تھی، انہیں مہلت دی جاتی تھی۔ ثُمَّ اَخَذْتُهَا" جب وہ مدت ختم

ہوجاتی تھی تو انہیں پکڑ لیا جاتا تھا۔ وَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ (۲۲/۴۸). اس لئے کہ آخر الامر ہر قوم کا معاملہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو ہی سے طے پاتا ہے۔

توبۃ

آپ نے کسی گاؤں جانا ہے۔ راستے میں ایک دوراہے پر پہنچ کر آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ گیا۔ کچھ عرصہ آپ چلتے رہے۔ اس کے بعد آپ کو قرآن سے احساس ہوا یا کسی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ غلط راستے کی طرف مڑ گئے تھے۔ آپ کو اس دوراہے سے دوسری سمت مڑنا چاہیئے تھا۔

اپنی غلطی کے اس احساس پر آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ پچھلے پاؤں اسی دوراہے پر واپس آتے ہیں اور اس کے بعد صحیح سمت کی طرف مڑتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ آپ کو صحیح منزل پر پہنچنے کے لئے کیا کرنا پڑا۔

۱۔ سب سے پہلے آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا (کہ آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا)۔ اگر آپ کو اس کا احساس یا علم نہ ہوتا تو آپ اسی راستے پر چلے جاتے اور آپ کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکتے۔ آپ کا وقت اور توانائی جو اس مسافت کے طے کرنے میں صرف ہوتی سب رائگاں جاتی۔

۲۔ اگر غلطی کا احساس ہونے پر آپ آگے چلنا تو بند کر دیتے لیکن اسی مقام پر بیٹھ جاتے تو بھی آپ اپنی منزلِ مقصود تک کبھی نہ پہنچ سکتے۔

۳۔ غلطی کے احساس پر آپ پچھلے پاؤں واپس لوٹے اور اس طرح اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے آپ صحیح سمت کی طرف مڑ سکتے تھے۔ اس طرح (غلطی کے احساس کے بعد) صحیح مقام کی طرف واپس لوٹنے کو عربی زبان (اور قرآنِ کریم کی اصطلاح) میں توبہ کہتے ہیں۔

۴۔ لیکن اگر آپ اس دوراہے پر واپس آ کر صحیح سمت کی طرف نہ چلتے تو بھی آپ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکتے۔ اس طرح صحیح سمت کی طرف چلنے کا نام اصلاح ہے۔ یعنی اپنی غلطی کے احساس و اعتراف کے بعد اپنے نقصان کی تلافی کے لئے صحیح قدم اٹھانا۔ قرآنِ کریم نے اس پروگرام کے دونوں اجزاء (غلط مقام سے دوراہے کی طرف واپس اور وہاں سے صحیح راستے پر گامزن ہونے) کو تَابَ وَ اَصْلَحَ سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے تلافیٔ مافات ہوجاتی ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ توبہ کے معنی "کچھ پڑھ کر خدا سے بخشش مانگنے" کے نہیں. اس سے مراد تلافیٔ مافات کے لئے کچھ عملاً کرنے کے ہیں. جس مقام پر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا' اگر آپ وہاں بیٹھ کر سو سال تک بھی "یا اللہ میری توبہ. یا اللہ میری توبہ" کا ورد کرتے رہتے' تو بھی آپ اپنی منزلِ مقصود تک کبھی نہ پہنچ سکتے. غلط اقدامات کے نقصان کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ آپ اس کے بعد اتنے اچھے کام کریں جن کے تعمیری نتائج' ان تخریبی نتائج کا ازالہ کر دیں. قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط (۱۱/۱۱۴)

یاد رکھو! غلط کاموں کے تخریبی نتائج کی تلافی اچھے کام کرنے سے ہوتی ہے.

اوپر کی مثال کے سلسلہ میں قرآنِ کریم میں ہے کہ غلط سمت کی طرف چلنے والے کے نقصان کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (۲۰/۸۲) جو غلط راستے سے واپس لوٹتا ہے (تَابَ)' وہاں پہنچ کر اس بات کا اطمینان کر لیتا ہے کہ منزلِ مقصود کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے (اٰمَنَ) اور اس کے بعد پھر جادہ پیما ہو جاتا ہے (عَمِلَ صَالِحًا) تو وہ منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے (اِهْتَدٰى). اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط (۲۵/۷۰) یہ وہ ہیں جن کی ناہمواریاں' ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں. سورۂ قصص میں ہے. فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ۝ (۲۸/۶۷) جو غلط راستے سے لوٹ آیا' پھر اس امر کا اطمینان کر لیا کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور پھر اس پر چل پڑا' تو یہ لوگ ہیں کامیابیاں جن کے قدم چومیں گی. دوسری جگہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں (مَنْ) تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (۴۰/۷) جو غلط راستے سے مڑ کر' خدا کی طرف لے جانے والے راستے پر چل پڑے اور اس طرح انہوں نے بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ (۲۷/۱۱) اچھے کام کر کے اپنی غلطیوں کا ازالہ کر لیا.

قانونِ مکافاتِ عمل میں' تلافیٔ مافات کی گنجائش رکھنا' خدا کی رحمت ہے. اس لئے خدا نے اپنے آپ کو تَوَّابُ الرَّحِيْمُ کہا ہے (۲/۳۷). یعنی جو شخص غلط سمت سے مڑ کر صحیح سمت کی طرف قدم اٹھائے' اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دینے والا. یہ اس کی رحمت ہے. یاد رکھئے. خدا انہی کے لئے توّاب و رحیم ہے جو غلط راستے سے واپس لوٹ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں. سورۂ بقرہ میں ہے.

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ۝ (۲/۱۶۰)۔

غلط اقدام کے نقصان سے وہی بچ سکتے ہیں جو غلط راستے سے واپس لوٹیں اور پھر صلاحیت بخش کام کریں اور اس طرح واضح کر دیں کہ وہ پھر غلط روش پر نہیں چلیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف خدا کا قانونِ مکافات پلٹ کر آجاتا ہے۔ اس لئے کہ خدا توّاب اور رحیم ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اصلاح کا امکان اسی کے لئے ہے جو اس کا اعتراف کرے کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ جو اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا' وہ اپنی اصلاح کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ اس بنیادی حقیقت کو قرآنِ کریم نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بڑے حسین انداز میں واضح کیا ہے۔ آدم سے غلطی ہوئی اور جب اسے اس کا احساس ہوا تو وہ پکار اٹھا کہ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۝ (۷/۲۳) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے۔ اگر تیری طرف سے سامانِ حفاظت نہیں ملے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جب تم نے اپنی غلطی کا احساس کر کے' اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے تو تمہارے لئے بازآفرینی کا امکان ہے۔

ایک غلطی ابلیس سے بھی ہوئی۔ جب اسے کہا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تو اس نے کہا کہ یہ کچھ میں نے کہاں کیا ہے۔ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ (۱۵/۳۹) تُو نے مجھے گمراہ کیا تو میں غلط راستے پر چل پڑا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جب تو غلط روی کے لئے اپنی ذمہ داری ہی قبول نہیں کرتا تو تو اپنی اصلاح کس طرح کر سکتا ہے۔ لہٰذا " ابلیس پر توبہ کے دروازے بند ہو گئے۔"

(۰)

ایک مثال اور سامنے لایئے۔ ایک شخص غلطی سے سنکھیا کھا جاتا ہے۔ جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ فوراً دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق دوائی پیتا ہے۔ اس کے بچ جانے کی امید کی جا سکتی ہے۔

لیکن ایک شخص خودکشی کی غرض سے دانستہ زہر کھاتا ہے۔ جب زہر کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے

تو وہ مطمئن ہوجاتا ہے کہ زہر اپنا کام کر رہا ہے' تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کا مقصد حاصل ہوجائے گا یعنی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس شخص کے لئے "غلطی کے ازالہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زہر کھانے کو غلطی سمجھتا ہی نہیں' اس لئے اس کے ازالہ کی فکر کیوں کرنے لگا۔ سورۃ نساء میں ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

(۴/۱۷) (نیز ۶/۵۴؛ ۱۶/۱۱۹)۔

توبہ اس کے لئے ہے جو کوئی غلط کام نادانستہ کر بیٹھے۔ پھر اس کا احساس ہونے پر فوراً واپس لوٹ آئے۔ یہ وہ ہیں جن کی طرف خدا لوٹ کر آتا ہے۔ وہ علیم و حکیم ہے۔

غلطی کے بعد بازآفرینی کا امکان فی الواقعہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے۔ ورنہ اگر صورت یہ ہو کہ جس سے کوئی لغزش ہوگئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوگیا اور اس پر تلافی مافات کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں' تو اس ابدی مایوسی سے انسان کی جو نفسیاتی کیفیت ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۂ زمر میں کہا گیا کہ

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (۳۹/۵۳)

اے رسول! میرے بندوں سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے آپ پر کچھ زیادتی کر بیٹھے ہو تو اس سے تم پر ابدی مایوسی نہیں چھا جانی چاہیئے۔ تمہارے لئے بازآفرینی کے امکانات موجود ہیں۔ تمہیں' تمہاری لغزشوں سے پیدا شدہ نقصان سے سامانِ حفاظت مل سکتا ہے۔ خدا سامانِ حفاظت عطا کرنے والا اور انسانوں کے لئے اسبابِ نشوونما مہیا کرنے والا ہے۔

اس کے قانونِ مکافات میں یہ کچھ بھی موجود ہے۔ لیکن ان کے لئے جو اپنی غلطی کے احساس کے بعد اس کی اصلاح کے لئے عملاً کوشاں ہوں وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا (۳/۱۳۴)۔ یہ نہیں کہ اپنی غلط روی پر جمے رہیں اور اس کی توقع کریں کہ

"خدا اپنی رحمت سے انہیں بخش دے گا۔"

مغفرت

قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے "بخشش" کا تصور ہی غلط ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ نے کسی شخص پر زیادتی کی۔ اس کے بعد آپ نے اس سے معافی مانگ لی اور اس نے آپ کو معاف کر دیا۔ اس "معاف کر دینے" کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ سے اس زیادتی کا بدلہ نہیں لے گا۔

اس نے آپ کو معاف نہیں کیا اور معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ عدالت نے آپ کو معاف کر دیا یعنی آپ کو اس جرم کی سزا نہیں دی۔

ان دونوں صورتوں میں آپ اپنے جرم کی طبعی سزا سے بچ گئے۔ لیکن اس جرم کے ارتکاب سے جو اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوا ہے وہ تو زائل نہیں ہو سکا۔ اسے کوئی دوسرا زائل کر ہی نہیں سکتا۔ اسے تو آپ خود ہی زائل کر سکتے ہیں۔ یعنی توبہ سے۔ بالفاظِ دیگر، اپنے اس عمل سے کہ آپ اپنی غلطی کے احساس سے نادم ہوں۔ پھر ایسے اچھے کام کریں جن کا تعمیری نتیجہ، آپ کے اس غلط کام کے تخریبی اثر کا ازالہ کر دے۔ اسے (OUT-WEIGHT) کر دے، اسے مغفرت کہتے ہیں۔ مغفرت کے معنی ہیں سامانِ حفاظت۔

سامانِ حفاظت کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ شروع ہی سے غلط اقدام سے پرہیز کریں اور اس طرح غلط اقدام کے نقصان سے محفوظ رہیں۔ یہ زندگی کی بڑی مستحسن اور محفوظ شکل ہے۔ (اسے تقویٰ کہتے ہیں)۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر آپ سے کوئی غلط کام ہو گیا ہے تو آپ حسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کے زور سے، اس غلط کام کے نقصان سے محفوظ رہ جائیں۔ یہ توبہ ہے۔ طبی اصطلاح میں پہلے انداز کو حفظِ ماتقدم (PREVENTIVE) اور دوسرے طریق کو معالجہ (CURATIVE) کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں آپ کو حفاظت کا سامان خود اپنے عمل سے مل سکے گا۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں مغفرت کہتے ہیں۔ مغفر اس آہنی ٹوپی (HELMET) کو کہتے ہیں جسے سپاہی بغرضِ حفاظت سر پر پہن لیتے ہیں۔ استغفار کے معنی ہیں، سامانِ حفاظت طلب کرنا۔ شروع میں حفاظتی تدابیر اختیار کرنا اور غلط قدم اُٹھ جانے کے بعد اس کے معالجہ کے لئے جدّوجہد کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "گناہوں کی بخشش" کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ ہم جب کوئی جُرم کرتے ہیں (یعنی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں)، تو ہم خدا کے خلاف کوئی زیادتی

نہیں کرتے جو وہ ہمیں معاف کردے. ہم خود اپنے خلاف زیادتی کرتے ہیں جسے کوئی معاف نہیں کرسکتا. اس کا ازالہ ہمیں' اپنے حسنِ عمل سے' خود ہی کرنا ہوگا. قرآنِ کریم میں جہاں خدا نے کہا ہے کہ "یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ" (یا اس نے اپنے آپ کو غَفُوْر کہا ہے) تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ "خدا گناہوں کو بخش دیتا ہے." اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی ہے کہ انسان کو اس کے غلط اقدامات کے تخریبی اثرات سے سامانِ حفاظت مل جائے. یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ. غلط قدم اُٹھ جانے کے بعد' جو شخص چاہے کہ اسے اس کے نقصانات سے حفاظت کا سامان مل جائے تو اسے' اس کے حسنِ عمل کی بدولت' ایسا سامان مل سکتا ہے. لیکن جو ایسا نہ چاہے تو وہ نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتا. خدا نہ تو کسی کو یونہی نقصان پہنچاتا ہے اور نہ ہی کسی کے جرائم کو "بخش" دیتا ہے.

خفت و ثقلِ موازین

صحت اور مرض کی اس مثال کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے شروع میں بیان کیا گیا ہے. تخریبی عناصر' ہر آن ہمارے جسم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں. جب تک جسم میں قوتِ مدافعت کافی ہوتی ہے' وہ عناصر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے. انسان تندرست رہتا ہے. جب اس میں قوتِ مدافعت کی کمی ہو جائے تو تخریبی عناصر غالب آجاتے ہیں اور انسان بیمار ہو جاتا ہے. ڈاکٹر ایک تو ان تخریبی عناصر کی روک تھام کی تدبیر کرتا ہے اور دوسرے' مریض کی قوتِ مدافعت کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے. جب قوتِ مدافعت غالب آجاتی ہے تو مریض اچھا ہو جاتا ہے. لیکن اگر قوتِ مدافعت اس تناسب سے نہ بڑھے اور تخریبی عناصر کا غلبہ زیادہ ہوتا جائے تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب ہر تدبیر ناکام رہ جاتی ہے اور انسان مر جاتا ہے. تخریبی اور تعمیری عناصر میں یہ کشمکش انسانی زندگی میں ہر آن جاری رہتی ہے. فیصلہ کن سوال یہ ہوتا ہے کہ اس میزان میں پلڑا کس کا بھاری ہے. اگر ہمارا تعمیری عناصر کا پلڑا بھاری ہے' تو ہم تباہی سے محفوظ رہتے ہیں. اگر تخریبی عناصر کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو ہم نقصان اٹھاتے اور آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں. قرآن کریم نے حفاظت اور تباہی کا یہی اصول بتایا ہے جہاں کہا ہے کہ

وَ الْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ○ (۸-۹/۷)۔

ظہورِ نتائج کے وقت، اعمال کا وزن ٹھیک ٹھیک سامنے آجائے گا۔ پھر جس کا (تعمیری اعمال کا) پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب ہوں گے اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہ ہوجائیں گے بوجہ اس کے کہ انہوں نے ہمارے قوانین کے ساتھ زیادتی کی۔

سورۃ مؤمنون میں انہی الفاظ کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جہنم میں رہیں گے (۱۰۲-۱۰۳/۲۳) اور سورۃ القارعۃ میں ہے فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوشگواری کی زندگی بسر کرے گا۔ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۙ (۶-۹/۱۰۱) جس کا پلڑا ہلکا ہوگا تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ یعنی شعلہ ریز جہنم۔

یہ "ثقل و خفت موازین" کا اصول ایک عظیم حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لغزش کا امکان ہر انسان کے ساتھ ہے۔ اگر کسی کی ایک لغزش سے اس پر ابدی تباہی وارد ہوجائے تو دنیا میں کوئی انسان بھی سعادت و کامرانی سے بہرہ یاب نہ ہوسکے ــــ عیسائیوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ نسلِ انسانی کے اوّلیں ماں باپ ــــ آدم اور حوّا ــــ سے ایک لغزش سرزد ہوئی جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکال دیئے گئے۔ اب ان کا یہ گناہ، ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے ساتھ لاتا ہے جو کسی صورت میں دھل ہی نہیں سکتا، بجز حضرت مسیحؑ کے صلیب اور کفارہ پر ایمان لانے کے۔ اس ایک عقیدہ نے نوعِ انسانی کو جن تباہیوں کے غاروں میں دھکیل دیا ہے، اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں ــــ وہ گناہ جس کا ذمہ دار وہ انسانی بچہ نہیں، ایسا انمٹ کہ اس کے ہزار اعمالِ حسنہ بھی اس کی تباہی سے اسے بچا نہیں سکتے۔ اور کفارہ کا عقیدہ گناہوں کے لئے ایسا "اذنِ عام" کہ جو جی میں آئے کرتے ہو، تم سے کوئی بازپرس ہی نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، قرآنِ کریم کی رُو سے، اس دنیا میں انسان کے لئے پروگرام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی اس حد تک نشوونما کرلے جس سے وہ، زندگی کی اگلی ارتقائی منزل میں پہنچنے کے قابل ہوسکے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نظامِ تعلیم میں طالب علموں کے امتحانات۔ یہ امتحان اس بات کے جانچنے کے لئے ہوتے ہیں کہ طالب علم میں اتنی صلاحیت اور استعداد پیدا ہوچکی ہے یا نہیں جس سے یہ اگلی کلاس میں چلنے کے قابل ہوسکے گا۔ اس کے لئے ایک معیار مقرر کیا جاتا ہے۔

مثلاً "ساٹھ فی صد پاس مارکس" جولڑکا سو میں سے ساٹھ نمبر حاصل کرلیتا ہے' اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے اس لئے اسے اگلی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر' اس کی چالیس فیصد کمی کی تلافی اس کے ساٹھ فی صد نمبر کردیتے ہیں۔ اس کے برعکس' جو لڑکا چالیس فی صد نمبر حاصل کرتا ہے' اسے اگلی جماعت میں ترقی نہیں دی جاتی۔ بالفاظِ دیگر' اس کے حاصل کردہ نمبر رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اسے "حبطِ اعمال" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (موت کے وقت بھی انسان کے جسم میں کچھ نہ کچھ توانائی باقی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس کی زندگی کی سہارا بننے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ رائیگاں چلی جاتی ہے اور انسان پر موت طاری ہوجاتی ہے۔ یہ بھی حبطِ اعمال کی ایک مثال ہے)۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۳/۲۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال' دنیا اور آخرت دونوں میں رائیگاں چلے گئے۔ کیونکہ وہ ان کی مدافعت کرنے کے لئے ناکافی تھے۔ (نیز ۵/۵ ؛ ۹/۶۹)۔ سورۂ نور میں کہا کہ یہ اعمال' سراب کی طرح ہوتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی (۲۴/۳۹)۔ ان کا وزن پرِکاہ جتنا بھی نہیں ہوتا (۲۵/۲۳)۔ منافقین کے اعمال کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ بظاہر بڑے وزنی دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی حقیقت اور اصلیت کچھ نہیں ہوتی (۳۳/۱۹)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے (۴۷/۹)۔ یہ خود بھی خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق نہیں چلتے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ اس راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوجاتے ہیں (۴۷/۱)۔

کوئی فارمولا کیسا ہی صحیح کیوں نہ ہو' اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہ کی جائے۔ اس پر خالصتہً عمل کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کچھ اجزاء ایک فارمولا کے لے لے اور کچھ اجزاء کسی اور فارمولا کے' تو وہ اپنے پروگرام کے لئے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے' اسے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکے گی۔ جو مریض کچھ دوائیاں ڈاکٹر کے نسخہ سے لے لیتا ہے اور کچھ کسی طبیب (یا عطائی) کے نسخے سے اور دونوں کو ملا کر اپنا علاج شروع کردیتا ہے' وہ شفا کے بجائے موت کو آوازیں دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اسے شرک کہا جاتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ غیر خداوندی قوانین کی آمیزش۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنے والے کا سب کیا کرایا رائیگاں چلا جاتا ہے۔ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۶/۱۹) ؛ (۶/۸۹)۔ سورۂ

زمر میں ہے۔

وَ لَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَ اِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (۳۹/۶۵)-

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تیری طرف بھی یہ وحی کی ہے اور تم سے پہلے جن کی طرف وحی کی تھی ان سے بھی یہی کہا تھا کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمہارے اعمال رائیگاں چلے جائیں گے۔

امتحان میں کامیابی کے لئے کچھ مضامین لازمی ہوتے ہیں جن میں پاس ہونا ضروری ہوتا ہے اور کچھ اختیاری۔ اگر کسی طالب علم نے لازمی مضمون کا پرچہ ہی نہیں دیا یا وہ اس میں فیل ہو گیا ہے، تو اس کے دوسرے پرچے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ "خداوندی نصابِ تعلیم" میں بھی بعض "مضامین" لازمی ہوتے ہیں ـــــ جو ان مضامین میں فیل ہو جائے، اس کے دوسرے پرچے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا۔ ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جو اعمال کے معاملہ میں سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے؟ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر صرف دنیاوی زندگی کے مفاد و مقاصد کا حصول ہوتا ہے، اس سے زیادہ کوئی مقصد ان کے سامنے ہوتا ہی نہیں۔ ان مقاصد کو وہ جائز و ناجائز ہر طریق سے حاصل کرتے رہتے ہیں اور برعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا تیر مار رہے ہیں۔ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآىِٕهٖ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور اعمال کے نتائج کے سامنے آنے سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ سو ان کے تمام اعمال رائیگاں جائیں گے۔ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸/۱۰۳ــ۱۰۵) ان کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ ان کی ناکامیاں ان کے ماتھے پر لکھی ہوں گی۔ واضح رہے کہ ان لوگوں کو دنیاوی زندگی کے مفاد، ان کی کوششوں کے مطابق، مل جائیں گے۔ اس لئے کہ دنیاوی مفاد کا حصول، طبیعی قوانین کی رُو سے ہوتا ہے۔ جو بھی ان قوانین کے مطابق کام کرے گا اسے اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ اس میں کافر و مومن کی کوئی تفریق و تمیز نہیں۔ اس کے لئے حیات بالآخرت پر ایمان کی بھی شرط نہیں۔

لیکن جہاں تک ان کی "انسانی زندگی" کے سنوارنے کا تعلق ہے، اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ جو "انسانی زندگی" میں (BELIEVE) ہی نہیں کرتا۔ اس کا اس زندگی میں حصہ کیا ہو سکتا ہے؟ سورۂ ہود میں ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۵۔ ۱۱/۱۶)؛ (۱۸۔ ۱۷/۲۱)۔

جو شخص دنیاوی زندگی کی آسائش و آرائش چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ جس قدر کوشش کرے گا اس کے مطابق اسے حصہ ملے گا۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔ لیکن ان لوگوں کا اُخروی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس میں ان کے لئے تباہی ہوگی۔ وہاں کی زندگی کے سلسلہ میں ان کے سب کام رائگاں جائیں گے اور کوئی خوشگوار نتیجہ مرتب نہیں کریں گے۔

حیات بالآخرت پر یقین، نصابِ تعلیمِ خداوندی میں لازمی مضمون ہے۔ اس کی روشنی میں انسانی اعمال کے دوسرے پرچوں کو دیکھا جاتا ہے (۷/۱۴۷)۔ جو اس طرح زندگی کے امتحان میں ناکام رہ جائے لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا (۱۰/۴۵) اسے اس کے کام کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

(۵)

مہلت کے وقفہ کا فائدہ

یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، کامرانی اور ناکامی کا معیار، عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس طور پر سامنے آنے کے درمیان جو مہلت کا وقفہ رکھا گیا ہے (اور جو زیرِ نظر باب کا بنیادی موضوع ہے) اس سے مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی وقت، کسی وجہ سے انسان کا تخریبی اعمال کا پلڑا جھک گیا ہے تو قبل اس کے کہ وہ انسان پر تباہی لے آئے اسے موقع دیدیا جاتا ہے کہ وہ تعمیری اعمال کے پلڑے میں کچھ ڈال کر اسے جھکالے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اس کی تباہی سامنے آن کھڑی ہوتی ہے تو

پھر اسے اس سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم۔نے کہا ہے کہ جب انسان کی موت سامنے آن کھڑی ہو تو پھر اس کی توبہ اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ "موت کے سامنے آجانے" کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے لئے کچھ کرنے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اور چونکہ توبہ کے معنی ہیں مہلت کے وقفہ سے فائدہ اٹھا کر حسنِ عمل کے پلڑے میں کچھ اضافہ کر دینا' اس لئے جب کام کرنے کے لئے وقت ہی باقی نہ رہا تو زبان سے توبہ۔ توبہ کہہ دینے۔ سے حاصل کیا ہوگا؟ سورۂ نساء میں ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَ
هُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ
اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۴/۱۸)۔

توبہ کا دروازہ ان کے لئے کھلا نہیں ہوتا جن کی حالت یہ ہو کہ وہ ساری عمر غلط کام کرتے رہیں اور جب ان کے سامنے موت آن کھڑی ہو تو وہ کہہ دے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔ نہ ہی توبہ ان کے لئے ہے جو بحالتِ کفر ہی دنیا سے چلے جائیں۔ ان کے لئے الم انگیز تباہی ہے

موت (یا خطرہ) کو سامنے دیکھ کر گڑگڑانے لگ جانے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ انسان اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں اس صدمہ کی برداشت کی قوت (یا ہمت) نہیں ہوتی اور وہ فرار کی راہیں تلاش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ انسانی کیرکٹر کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی' موت کو سامنے دیکھ کر توبہ کی التجا بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون نے ڈوبتے وقت یہ کہا کہ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ اس خدا کے سوا جسے بنی اسرائیل خدا مانتے ہیں' کوئی اور اللہ نہیں اور میں اس کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ تو بجائے اس کے کہ اسے اس ایمان پر شاباش دی جاتی' اس سے کہا گیا کہ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۱۰/۹۱-۹۰)۔ اب موت کو سامنے دیکھ کر ایمان کا اعلان کر رہے ہو حالانکہ ساری عمر تم قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہو اور دھاندلی مچاتے رہے! تم بڑے پھرتے تھے اتنے بڑے اور کیرکٹر تمہارا یہ ہے کہ تم موت کے ڈر سے' ایمان کا اعلان کر رہے ہو۔ میزانِ خداوندی میں اس ایمان کی وقعت کیا ہے؟

بہرحال، موت (یا نتائجِ اعمال) کو سامنے دیکھ کر، توبہ کچھ فائدہ نہیں دیتی ـــــ خواہ یہ توبہ نیک نیتی سے ہو اور خواہ موت کے ڈر سے ـــــ جب تلافیٔ مافات کا وقت ہی گذر چکا تو پھر معذرت خواہی سے حاصل کیا!

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝ (۳۰/۵۷ ؛ ۴۰/۵۲ ؛ ۷۷/۳۶)۔

جن لوگوں نے ظلم اور زیادتی کی ہوگی، اس وقت ان کی کوئی معذرت انہیں فائدہ نہیں دے گی اور نہ ہی ان کا گڑگڑا کر التجائیں کرنا کچھ سود مند ہوگا۔

وہ ہزار کہیں گے کہ رَبَّنَا .... فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ۝ (۴۰/۱۱) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا اس عذاب سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ مل سکتا ہے؟ ان سے کہا جائے گا کہ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝ (۴۵/۳۵)۔ نہیں! اس سے بچ نکلنے کی اب کوئی سبیل نہیں۔ اب تمہارا گڑگڑانا بے سود ہے۔

پھر دُنیا میں واپسی نہیں

اس وقت وہ یہ بھی کہیں گے کہ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ اے میرے رب! مجھے دنیا میں ایک بار واپس بھیج دے۔ پھر دیکھ کہ میں کس قدر نیک عمل کرتا ہوں اور اس طرح تلافیٔ مافات کر کے دکھاتا ہوں۔ کہا جائے گا کہ كَلَّا (۲۳/۱۰۰) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ وقت ختم ہو گیا۔ اب تم دنیا میں نہیں جا سکتے۔ عمل کا موقعہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ قانونِ ارتقاء کی رُو سے، زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں مڑا کرتا۔ اس میں آگے بڑھنے والے آگے بڑھ جاتے ہیں اور رُکنے والے اس مقام پر رُک جاتے ہیں۔ کوئی پیچھے لوٹ کر اپنی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ زندگی کی حرکت دوری (CYCLIC) نہیں۔ یہ آگے کی طرف بڑھتی اور اوپر کی طرف اٹھتی ہے۔ اس لئے رجعت (واپسی) اور تناسخ (TRANSMIGRATION) کا تصور، خلافِ حقیقت اور انسانی ذہن کا وضع کردہ ہے۔ لہٰذا، ان لوگوں کی ہزار تمناؤں کے باوجود، دنیا میں دوبارہ آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ باصد حسرت کہیں گے کہ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶/۱۰۲)

اے کاش! اگر کہیں ایک بار پلٹ جانا ہو تو پھر ہم مومن بن کر دکھائیں۔ سورۂ سجدہ میں ہے کہ مجرمین اُس وقت کہیں گے کہ جو کچھ ہم سے کہا جاتا تھا ہم اسے سچا نہیں سمجھا کرتے تھے' اسے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور کانوں سے سُن لیا ہے۔ فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ایک بار واپس بھیجدے' پھر دیکھ کہ ہم کیسے اچھے کام کرتے ہیں۔ اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ٥ (۳۲/۱۲) اب ہمیں قانونِ مکافات پر یقین ہو گیا ہے۔ ان سے کہا جائے گا کہ اب واپسی کا سوال ہی نہیں۔ تمہارے پاس ہمارے قوانین آئے۔ تم نے انہیں جھٹلایا۔ ان کی طرف متکبرانہ نگاہ سے دیکھا اور سرکشی برت کر اپنی معصیت کوشیوں میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب وہ وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے جب تم اپنی بگڑی بنا سکتے تھے (۵۹ ـ ۳۹/۵۸)۔

سورۂ الحدید میں ہے کہ قیامت میں مومنین چل رہے ہوں گے تو ان کی پیشانیوں کا نور ان کے راستوں کو جگمگا رہا ہوگا۔ انہیں دیکھ کر منافقین ان سے کہیں گے کہ اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ” ذرا رکو! ہم تمہاری روشنی سے تھوڑی سی چمک مستعار لے لیں تاکہ ہماری زندگی کی تاریک راہیں بھی روشن ہو جائیں۔ مومنین ان سے کہیں گے کہ یہ چراغ تو انسان کے اپنے حُسنِ عمل کے تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ یہ روشنی نہ کسی کو مانگے سے مل سکتی ہے نہ ہی کوئی اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کا مقام تو دنیاوی زندگی کا میدانِ عمل تھا۔ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ” (۵۷/۱۳) اگر تم جا سکتے ہو تو اسی دنیا کی طرف پلٹ کر جاؤ اور وہاں اپنی زندگی کی شمعیں روشن کر کے لاؤ۔ اور چونکہ دنیا کی طرف کوئی واپس جا نہیں سکتا' اس لئے تمہاری تاریک راہیں اب کیسے روشن ہو سکتی ہیں۔

اس مقام سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ یہ بڑا اہم مقام ہے اور گہری فکر کا محتاج ـــــ زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی' پیکرِ بشری میں پہنچی ہے۔ اب انسان کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنالے کہ یہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کر سکے۔ اب سوچئے کہ جو شخص اس موقع کو ضائع کر دیتا ہے وہ اپنا ایسا نقصان کرتا ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اگر زندگی کو موت کے ساتھ ختم ہو جانا ہوتا تو پھر انسان جس طرح جی چاہتا اس زندگی کو گزار لیتا۔ مرنے کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا۔ لیکن جب زندگی نے آگے

بھی چلنا ہو۔ انسان وہاں زندہ ہو۔ صاحبِ شعور و ذی احساس ہو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو کہ اس نے اپنے لئے کس قدر مہیب تباہی خرید لی ہے۔ نہ وہ الم انگیز تباہی ختم ہو اور نہ ہی اس کا موقع ہو کہ انسان تلافیٔ مافات کر سکے۔ ذرا سوچئے کہ اس قسم کی زندگی ـــــ اور وہ بھی اس قدر طول طویل زندگی۔ کس طور بسر ہو گی!

اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم حیات بالآخرت پر ایمان (یقین) کو اس قدر اہمیت کیوں دیتا ہے اور اس دنیا کی اسٹیج انسانی زندگی میں کس قدر اہم مقام رکھتی ہے۔ جس نے اسے ضائع کر دیا وہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔

ساتواں باب

یَومِ الدِّین

سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مہلت کے دوران، ہنوز اس کا موقع ہوتا ہے کہ انسان اپنے حسنِ عمل سے، تخریبی اعمال کے نتائج سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن جب یہ وقفہ ختم ہو جائے تو پھر میزانِ خداوندی کے پلڑوں کے مطابق نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے اختصاراً لکھا جا چکا ہے اور آگے چل کر اسے تفصیلاً بیان کیا جائے گا)۔ یہ نتیجہ اس دنیا میں بھی سامنے آسکتا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی بالیقین سامنے آئے گا۔ اس ظہورِ نتائج کے وقت کو قرآنِ کریم نے "یَوۡمِ الدِّیۡن" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ "الدِّین" ایک بڑا جامع لفظ ہے جس میں ضابطۂ قوانین، ان قوانین کی اطاعت اور ان کے مطابق اعمال کے نتائج (سب کا) مفہوم شامل ہے۔ قرآنِ کریم کے آغاز (سورۃ فاتحہ) میں خدا نے اپنے آپ کو مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (۱/۳) کہا ہے۔ یعنی وہ جس کے قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج ہوتا ہے۔ اس قانون پر خالصتہً اس کا اقتدار و اختیار (کنٹرول) ہے اور نہ کوئی اور قوت اس میں دخیل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اس کی گرفت سے باہر جا سکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانفطار میں یَوۡمِ الدِّیۡن کی توضیح ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ

يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۠ (۸۲/۱۹)

جس دن کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کوئی اختیار و اقتدار نہیں رکھے گا اور تمام معاملات کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے۔

یہ درحقیقت خدا کی حاکمیت کا فطری نتیجہ ہے۔ حاکمیتِ خداوندی کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں ہر بات خدا کے قوانین کے مطابق طے پاتی ہے اور ہر معاملہ کا فیصلہ اس کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے سورۃ التین میں کہا کہ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ (۹۵/۷) اے رسول! ان تصریحات کے بعد تمہارے اس دعوے کو (کہ ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے) کون جھٹلا سکتا ہے۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۝ (۹۵/۸)۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ کائنات میں آخری اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہے۔ جب کائنات میں قوانین اسی کے کارفرما ہیں تو پھر اس دعوے کے سچے ہونے میں کلام کیسے ہو سکتا ہے کہ "یوم الدین" کا مالک وہی ہے۔ اعمال کے نتائج اسی کے قانون کے مطابق برآمد ہوتے ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ ان لوگوں سے (جو قانونِ مکافات کو جھٹلاتے ہیں) کہہ دو اور برملا کہہ دو، پورے حتم ویقین کے ساتھ کہہ دو کہ إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ بالکل سچا ہے۔ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝ (۵۱/۵-۶) ظہورِ نتائج کا وقت آکر رہے گا۔ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ۝ (۵۱/۲۳) کائنات کو سنبھالنے والا خدا خود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس کا واقع ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح، جب تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہو تو تمہیں یقین ہوتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ ہو رہی ہیں۔ یہ تمہارا وہم و گمان یا خواب و خیال نہیں۔ قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج اسی طرح ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اس پر معترضین پوچھتے تھے (اور اس قسم کے اعتراضات اور سوالات کی تفصیل پہلے آچکی ہے) کہ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ ۝ یہ یوم الدین (ظہورِ نتائج کا) وقت کب آئے گا؟ کہا کہ اس کا وقت تو بتایا نہیں جا سکتا۔ لیکن ان کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہوگا کہ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ۝ (۵۱/۱۲-۱۳) یہ وہ وقت ہوگا جب ان کی کشتِ امل جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔

سورۃ الانفطار میں اس حقیقت کو بڑے لطیف لیکن بصیرت افروز انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ کہا کہ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ (۸۲/۱۵)۔ يَوْمَ الدِّينِ وہ ہوگا جب یہ لوگ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ اس سے ذہن میں یہ خیال آسکتا تھا کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں اس وقت کوئی باہمی رابطہ نہیں، مرنے کے بعد لوگوں کو یک لخت جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ کہا یہ غلط ہے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ (۸۲/۱۶) یہ تو اس وقت بھی جہنم کی نظروں کے سامنے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ

اِس وقت یہ اُس جہنّم کو محسوس نہیں کرتے۔ اُس وقت یہ اُسے بالمشافہ اپنے سامنے دیکھ لیں گے، ورنہ جہنّم تو انسان کو ہر وقت دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔ اسی حتم ویقین کی رُو سے اسے یَوْمُ الْحَقِّ (۷۸/۳۹) کہا گیا ہے۔ کہیں اسے یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۵ (۱۴/۴۱) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی جس دن حساب کے لئے میزان کھڑی کردی جائے گی۔ سورۃ صٓ میں نعمائے جنّت کے تذکرہ کے بعد کہا ہے هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۵ (۳۸/۵۳) یہ وہ ہے جس کا تم سے "حساب کے دن" کے لئے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عذابِ جہنّم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۵۶/۵۶) ظہورِ نتائج کے دن اس سے ان کی خاطر تواضع ہوگی۔

سُورۃ الصّٰٓفّٰت میں ہے کہ یہ لوگ جو حیاتِ اُخروی سے انکار کرتے ہیں جب "عدالتِ خداوندی" میں حاضر کئے جائیں گے تو کہیں گے۔ يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۵ اُوہ ہماری تباہی! یہ ہے يَوْمُ الدِّيْنِ! ان سے کہا جائے گا کہ ہاں! هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۵ (۲۱۔۲۰/۳۷) یہی ہے وہ فیصلہ کا دن جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔ یہ (یوم الفصل) وہ دن ہے۔ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۵ (۴۱۔۴۰/۴۴) — جب کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آسکے گا اور مجرمین کی کوئی مدد نہیں کرسکے گا۔

سورۃ مرسلٰت میں ہے۔ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ (۷۷/۱۲) ان کی تباہی کون سے دن پر اٹھا رکھی گئی ہے؟ لِيَوْمِ الْفَصْلِ۔ فیصلہ کے دن پر۔ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یَوْمُ الْفَصْل کسے کہتے ہیں؟ آؤ! تمہیں ہم بتائیں۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۵۔۱۴/۷۷) جس دن ان لوگوں کے لئے تباہی ہوگی جو خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ (نیز ۷۷/۳۸)۔ سورۃ نبا میں ہے۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (۷۸/۱۷) یوم الفصل اپنے وقت پر آکر رہے گا۔ کہیں یوم الدّین کو یوم البعث بھی کہا گیا ہے (۷۰۔۶۹/۳۸؛ ۳۶۔۳۵/۱۵)۔

سابقہ باب میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے کامیابی اور ناکامی کا معیار "ثقل وخفت موازین" (PASS-MARKS) ہے۔ طالب علم سال بھر پڑھتے رہتے

(کام کرتے رہتے) ہیں۔ اس کے بعد امتحان ہوتا ہے اور نتیجہ نکلنے کے دن فیل ہو جانے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کتنی کمی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ پاس نہیں ہو سکے۔ اس نہج سے اس فیصلہ کے دن کو قرآنِ کریم نے یوم التغابن کہہ کر پکارا ہے (۶۴/۹)۔ تغابن کے معنی ہوتے ہیں' ایک دوسرے کے مقابلہ سے اپنی کمی کا سامنے آجانا۔ ان "فیل ہو جانے والوں" سے کہا جائے گا کہ

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ○ (۶/۱۳۱)۔

اے شہروں اور صحراؤں کے رہنے والو! کیا تمہارے پاس' تمہارے اپنے بھائی بندوں میں سے' ہمارے پیغام رساں نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے آنے کے متعلق متنبہ کیا کرتے تھے؟

وہ کہیں گے کہ ہاں! یہ واقعہ ہے۔ اس لئے آج ہم خود اپنے خلاف آپ گواہی دیتے ہیں کہ ہمیں دنیاوی مفاد پرستی نے دھوکے میں رکھا اور ہم غلط راہوں پر چلتے رہے۔ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ان قوانین سے انکار کیا اور ان سے سرکشی اختیار کی تھی۔

"یوم الدین" کی اس طرح تکذیب کرنے والوں کا تذکرہ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ سورۂ مدثر میں ہے کہ جب مجرم جہنم میں داخل ہو رہے ہوں گے تو ان سے پوچھنے والے پوچھیں گے کہ

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○

تمہیں کونسی بات جہنم کی طرف کھینچ لائی؟ وہ کون سے ایسے جرائم تھے جن کی وجہ سے تم یہاں آپہنچے؟

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ۙ

وہ کہیں گے کہ تفصیل تو اس اجمال کی طول طویل ہے لیکن مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ ہم "مصلّین" میں سے نہیں تھے۔

وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ — ہم ان لوگوں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے جو اپنی روٹی آپ کمانے کے قابل نہیں تھے۔

وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ — ہم کرتے کراتے کچھ نہیں تھے لیکن اپنے جیسوں کے ساتھ مل کر باتیں بڑی بنایا کرتے تھے۔

وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ — اس طرح ہم خدا کے قانونِ مکافات اور ظہورِ نتائج کی حقیقت کو جھٹلاتے رہے۔

حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝ (۴۲-۴۷/۷۴) — تا آنکہ یہ حقیقت محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی۔

سورۂ انفطار میں ہے کہ تم یَوْمِ الدِّیْن کی تکذیب کرتے ہو حالانکہ تمہارا ایک ایک عمل محفوظ کیا جارہا ہے (۹-۱۰/۸۲)۔ ظہورِ نتائج کے وقت تمہارے لئے تباہی ہوگی (۱۰-۱۱/۸۳)۔

سورۂ المدّثّر کی طرح سورۃ الماعون میں بھی تکذیبِ دین کرنے والوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ سورۃ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو الدِّین کی تکذیب کرتا ہے؟ تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے؟

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ — یہ وہ ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے یہ انہیں دھکے دے کر نکال دیا کرتا تھا۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ — اور محتاجوں کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا تھا اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا تھا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ — یہ ان مصلّین (نمازیوں) میں سے تھا جن کی نمازیں ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ — یعنی وہ لوگ جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ — وہ نماز کی ظاہری شکل و صورت کی بڑی شدت سے پابندی کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑے نیک لوگ ہیں۔

وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (۱-۷/۱۰۷) — اور کرتوت ان کی یہ ہوتی ہے کہ رزق کے جن چشموں کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیئے تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنی ضرورت کے

مطابق لے لے' یہ ان پر بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ سارے کا
سارا انہی کی ملکیت میں آجائے۔

یہ ہیں وہ لوگ جو نمازیں پڑھنے کے باوجود 'تکذیبِ دین کرتے ہیں۔

(۰)

نتائجِ اعمال

یہ ہے مختصراً وہ طریقِ عمل جس کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج سامنے آتے ہیں ـــ عمل کا سرزد ہونا ـــ مہلت کا وقفہ ـــ مہلت کے وقفہ میں بازیابی کا موقعہ۔ پلڑوں کا جھکنا اور اٹھنا۔ اور بالآخر نتیجہ کا سامنے آجانا ـــ قرآنِ کریم میں ہر مقام پر ان تمام مراحل کا ذکر نہیں کیا گیا' نہ ہی ہر مقام پر اس کے دہرانے کی ضرورت تھی۔ اس میں عام طور پر عمل اور اس کے نتیجے ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۱۱۲)

نہیں۔ بات یوں نہیں جس طرح یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جس نے بھی اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دیا اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی' تو اس کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے ہاں ہے۔ اور اس اجر کا ماحصل یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف و خطر ہوگا نہ حزن و ملال۔

سورۃ الزمر میں ہے۔ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۳۹/۳۴) وہ جو چاہیں گے انہیں خدا کے ہاں سے ملے گا۔ یہ ان لوگوں کے اپنے حُسنِ عمل کا بدلہ ہے۔ انسانی کامیابی کا یہ منتہٰی ہے کہ وہ جو کچھ چاہے اسے مل جائے۔ لیکن قرآنِ کریم اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝ (۵۰/۳۵) اس میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے ان چند لفظوں میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی آرزوؤں اور خواہشوں کے پیمانے اس کی زندگی کی موجودہ

سطح کے مطابق ہوتے ہیں. یہاں اسے انہی پیمانوں کے مطابق ملے گا اور یہی اس کی کامیابیوں کا منتہیٰ ہے. لیکن اس کے بعد جب اس کی زندگی اس سے بلند مقام پر پہنچ جائے گی تو اس زندگی کے تقاضے کیا ہوں گے اس کے متعلق یہ اپنے شعور کی موجودہ سطح پر احساس وقیاس تک نہیں کر سکتا. ایک بچہ اس کا تصور تک نہیں کر سکتا کہ جوانی کے زمانے میں پہنچ کر اس کی زندگی کے تقاضے کیا ہوں گے؟ اس لئے کہا کہ ان لوگوں کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جس کی یہ لوگ اپنی زندگی کے موجودہ تقاضوں کے مطابق آرزو کر سکتے ہیں. لیکن یہ ان کا منتہیٰ نہیں ہے. اس کے بعد جب ان کی زندگی کے تقاضے اور بڑھ جائیں گے تو انہیں ان تقاضوں کی تسکین کا سامان بھی ملے گا.

وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ (۱۸/۲).

یہ لوگ جو خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور صلاحیت بخش کام کرتے ہیں. ان کے لئے ان کے اعمال کے نہایت حسین اجر کی بشارت ہے.

سورۃ ہود میں انسانی زندگی کا مقصود یہ بتایا گیا ہے کہ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱/۷). یہ انسان کے لئے حسنِ عمل کے مواقع بہم پہنچاتی ہے.

یہ حسنِ عمل کا اجر تھا. دوسری طرف غلط اعمال کے متعلق اصولاً بتایا کہ

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ؁ (۲/۸۱).

نہیں بات یوں بھی نہیں جس طرح یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں. بات یہ ہے کہ کہ جو شخص بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کرے اور پھر اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کی لغزشیں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں، تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا.

سورۃ حٰم میں ہے. وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ؁ (۴۱/۲۷) ان کے غلط اعمال کا بدلہ انہیں یقیناً مل کر رہے گا. دوسرے مقام پر ہے. ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى (۳۰/۱۰) غلط کاری کا انجام تباہی ہے. ایسی تباہی جسے دیکھ کر انہیں افسوس

اور صدمہ ہوگا کہ ہم نے ایسے کام کیوں کئے تھے۔ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (۲/۱۶۷) — وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ (۶/۱۴۸) دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس تباہی کو ان سے ٹلا دے۔ سورۂ اعراف میں اس تباہی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر کہا گیا کہ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ (۷/۴۱؛ ۷/۴۰) ہم اس طرح مجرمین اور ظالمین کو اُن کی زیادتیوں کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور آگے چل کر کہا گیا کہ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ○ (۷/۸۶؛ ۷/۸۴؛ ۷/۱۰۳) تم دیکھو گے کہ ان مفسدین کا انجام کیا ہوا؟

آئندہ ابواب میں اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

آٹھواں باب

عذاب ___ یعنی ہلاکت اور تباہی

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے، انسانی اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور اُخروی زندگی میں وہ بالیقین سامنے آئیں گے. جہاں تک دُنیاوی زندگی کا تعلق ہے، انسان مدنی الطبع (SOCIAL-ANIMAL) واقع ہؤا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اجتماعی زندگی ہی میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کر سکتا ہے. اجتماعی زندگی کو معاشرہ کہتے ہیں. معاشرہ، یوں تو افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے. لیکن یہ مجموعہ ریاضی کے قاعدے کی حاصل جمع کا نام نہیں ہوتا. ہمارے ہاں ایک محاورہ ہے کہ "ایک اکیلا اور دو گیارہ". یہ اس نکتہ کی تفسیر ہے کہ معاشرہ، افراد کے ریاضی مجموعہ کا نام نہیں ہوتا. اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے. معاشرہ کا ایک نظام ہوتا ہے اور افراد کو اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنی ہوتی ہے. اگر معاشرہ ان قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہؤا ہے جو اس نے انسانی زندگی کی نشوو ارتقاء کے لئے متعین کئے ہیں. (آئندہ ہم انہیں "مستقل اقدار" کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے) تو افراد کی زندگی بہ ہیئتِ مجموعی ان اقدار کے مطابق بسر ہو گی. اس معاشرہ کو اس دنیا میں خوشگواریاں نصیب ہوں گی اور ان افراد کی اُخروی زندگی بھی کامرانیوں کی ہو گی. ہو سکتا ہے کہ اس معاشرہ میں ایسے افراد بھی ہوں جو بعض اقدار کی خلاف ورزی کریں. سو معاشرہ انہیں ان کے ایسے اعمال پر سزا دے گا کیونکہ ان کے اس قسم کے اعمال، خود معاشرہ کے قوانین کی خلاف ورزی ہو گی. باقی رہی ان افراد کی اُخروی زندگی، سو اس کا تعیّن ان کے "اعمال کے پلڑوں" کی نوعیت کے مطابق ہو گا.

اس قسم کے معاشرہ کی دنیاوی زندگی کو بھی جنتی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس معاشرہ کے افراد کی یہاں کی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوگی اور اخروی زندگی بھی جنت کی زندگی۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض خارجی حوادث کی وجہ سے اس قسم کے معاشرہ پر کچھ دن مصائب و تکالیف کے آجائیں لیکن اسے تباہی (اور جہنم) سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے اسے حوادث کی گردشِ دولابی سے تعبیر کیا ہے (۳/۱۳۹)۔

اس کے برعکس، دوسرا معاشرہ ہے جو مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل نہیں ہوتا۔ اس قسم کے معاشرہ کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی

(۱) ایسا معاشرہ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتا۔ اس معاشرہ کے حصہ میں یہاں بھی ذلت و رسوائی کے جہنم کی زندگی ہوگی اور اُس کے افراد کی اخروی زندگی بھی جہنم کی ہوگی۔

(۲) ایسا معاشرہ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے متمتع ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ کو کچھ عرصہ کے لئے دنیاوی سامانِ آسائش میسر آجاتا ہے لیکن چونکہ یہ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا۔ اس لئے اس کا انجام اس دنیا میں تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اس تباہی کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں لیکن قرآنِ کریم اسے بہ ہیئتِ مجموعی جہنم سے تعبیر کرتا ہے۔ جہاں تک اس معاشرہ کے افراد کی اُخروی زندگی کا تعلق ہے، وہ تو جہنم کی زندگی ہوگی ہی۔

ان ہر دو اقسام کے معاشروں میں ایسے افراد بھی ہوسکتے ہیں جو معاشرہ کی غیر خداوندی اقدار کی روش کے خلاف ہوں اور چاہتے ہوں (یا کوشاں ہوں) کہ معاشرہ صحیح اقدار کے مطابق متشکل ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ جب اس معاشرہ پر اس دنیا میں تباہی آئے گی تو اس قسم کے افراد بھی اس سیلاب کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ انہی افراد کے سلسلہ میں کہا ہے کہ

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸/۲۵)

اس تباہی سے بچاؤ کی تدبیر سوچ لو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظالمانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ سارے معاشرہ کو محیط ہوجایا کرتی ہے۔ لہٰذا، اس قسم کے افراد کو معاشرہ کی اجتماعی مصیبت میں تو برابر کا حصہ دار ہونا پڑتا ہے لیکن ان کی مستقبل کی زندگی، ان کے حسنِ عمل کا پلڑا جھکنے کی وجہ سے، جنت کی زندگی ہوگی۔

قرآنِ کریم نے اس تباہی اور بربادی کے لئے (خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا اخروی زندگی میں) عام طور پر "عذاب" کا لفظ استعمال کیا ہے ـــــ عذابِ الیم (الم انگیز تباہی)۔ عذاب مھین (ذلّت آمیز تباہی)۔ عذاب الحریق (متاعِ حیات کو جلا کر راکھ کر دینے والی تباہی ـــــ یہی مفہوم عذاب النار یا عذاب السّعیر سے ہے)۔ عذاب عظیم (بہت بڑی تباہی) عذاب شدید (بڑی شدّت کی تباہی)۔

پھر، قرآنِ کریم نے کہیں اسے متمیز طور پر دنیاوی زندگی میں تباہی کہا ہے اور کہیں اسی طرح متمیز طور پر اخروی زندگی کی تباہی۔ کہیں اسے دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں بلا تمیز و تفریق محض تباہی کہا ہے۔ ہم پہلے ان آیات کو سامنے لاتے ہیں جن میں اس عذاب (تباہی) کا ذکر بلا تخصیص آیا ہے۔

دُنیا اور آخرت کی تخصیص کے بغیر عذاب کا ذکر

(۱) محض عذاب۔ بعض آیات میں اسے "خالی عذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ (۶/۴۹)

جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں اور بے راہ روی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں، ان پر تباہی آکر رہے گی۔ (نیز ۵/۸۰ ؛ ۷/۱۵۶ ؛ ۱۹/۷۹ ؛ ۳۰/۱۶ ؛ ۸/۳۴)۔

دوسرے مقام پر اسے سوء العذاب کہا گیا ہے (۶/۱۵۸)۔ یعنی بدترین عذاب۔ اور سورۂ مائدہ میں ہے کہ متّبعین حضرت عیسیٰ سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے خدا کے نظامِ ربوبیت کی خلاف ورزی کی تو ان پر ایسا عذاب آئے گا جو اقوامِ عالم میں سے کسی پر نہیں آیا تھا۔ سورۂ مریم میں اسے عذاب من الرحمٰن کہا گیا ہے (۱۹/۴۵)۔ دیگر مقامات پر اسے خدا کا عذاب (عَذَابَهٗ) یا عَذَابَ رَبِّكَ (۱۷/۵۷) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (نیز ۲۷ــ۲۸/۷۰)۔ سورۂ فرقان میں اسے عذاب کبیر کہا گیا ہے (۲۵/۱۹) اور سورۂ غاشیہ میں عذاب اکبر (۸۸/۲۴)۔ اس تباہی کی شدّت کے اظہار کے لئے اسے عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (۱۶/۸۸) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی تباہی بالائے تباہی۔

(۲) عَذَابٌ شَدِیْدٌ

شدّت کے اظہار کے لئے اسے عَذَابٌ شَدِیْدٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۳ ؛ ۲/۱۴ ؛ ۲/۱۶۵ ؛ ۲/۲۷ ؛ ۴۱/۲۷ ؛ ۵۸/۱۵)۔ اسی شدّت کے اعتبار سے کہیں اسے عَذَابٌ غَلِیْظٌ بھی کہا گیا ہے (۳۱/۲۴ ؛ ۴۱/۵۰)۔

(۳) عَذَابٌ عَظِیْم

سورۂ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ ایسی ذہنیت پیدا کرلیں کہ ہم نے نہ کچھ سُننا ہے نہ دیکھنا۔ نہ سمجھنا ہے نہ سُننا۔ بس حق و صداقت کی یونہی مخالفت کئے جانا ہے۔ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲/۷) ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ ان کی تباہی عظیم ہو گی۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ جو لوگ وحی کی واضح تعلیم آجانے کے بعد، فرقہ بندی پیدا کرلیں اور باہمی اختلاف کرنا شروع کردیں، ان کے لئے عذاب عظیم ہے (۳/۱۰۴ ؛ ۳/۱۷۵)۔ جو لوگ ایمان لے آنے کے بعد کفر اختیار کرلیں ان کے لئے بھی عذابِ عظیم ہے (۱۶/۱۰۶)۔

(۴) عَذَابٌ مُّھِیْنٌ

متعدد مقامات میں اسے ذلت آمیز اور رسوا کن تباہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ٥ (۲/۹۰) قوانینِ خداوندی سے انکار اور ان کی مخالفت کرنے والوں کی روشِ زندگی کا نتیجہ ذلت آمیز تباہی ہوتا ہے۔ (نیز ۳/۱۷۷ ؛ ۴/۱۰۲ ؛ ۴/۱۵۱ ؛ ۲۲/۵۷)۔ بعض آیات میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ آیات اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں (SERIOUSLY) نہیں لیتے ان کے لئے ذلت آمیز عذاب ہے (۳۱/۶ ؛ ۴۵/۹) اور سورۂ مجادلہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظامِ مملکت کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں ان کے لئے رسوا کن تباہی ہو گی (۵۸/۵)۔

(۵) عَذَابُ الْحَرِیْقِ وَ عَذَابُ السَّعِیْرِ

سورۂ آلِ عمران میں اسے عَذَابُ الْحَرِیْقِ سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۱۸۰)۔ یعنی ایسی تباہی جو

انسان کی متاعِ حیات کو جلا کر راکھ کر دے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر عَذَابُ السَّعِيْرِ بھی کہا گیا ہے (۲۲/۴ ؛ ۶۷/۵)۔

اور عَذَابُ النَّارِ کی اصطلاح تو اس کثرت سے آئی ہے کہ اس کا احاطہ بڑی تفصیل چاہتا ہے (مثلاً ۲/۱۲۶ میں)۔ مطلب اس سے بھی وہی ہے جو عذاب الحریق یا عذاب السعیر سے ہے۔

(۶) عَذَابٌ اَلِيْمٌ

اس قسم کی دوسری کثیر الاستعمال اصطلاح — عَذَابٌ اَلِيْمٌ[1] کی ہے۔ یعنی الم انگیز اور دردناک تباہی سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں منافقین کے متعلق ہے۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ (۲/۱۰) ان کے دلوں میں منافقت کا مرض ہے اور منافقت کا خاصہ ہوتا ہے کہ جوں جوں انسان اس میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی بڑی ہی الم انگیز تباہی میں گزرتی ہے۔

سورۂ سبا میں ہے۔ وَ الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ○ (۳۴/۵) جو لوگ اس مقصد کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں کہ قوانینِ خداوندی کو شکست مل جائے۔ ان کا انجام اس قسم کی الم انگیز تباہی ہوتا ہے جو خود ان کی قوت کو مضمحل کر دے۔ اسی قسم کی تباہی ان کے لئے ہوگی جو ان قوانین سے سرکشی اختیار کرتے ہیں (۴۵/۱۱)۔

قرآنِ کریم میں تباہی کی ان مختلف نوعیتوں کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ

---

[1] "عذاب الیم" کی اصطلاح کے لئے حسبِ ذیل آیات دیکھئے۔ (۲/۱۷۴ ؛ ۹/۶۱ ؛ (۲/۲) ۴۲ ؛ ۳/۱۸۷ ؛ ۱۹/۴۳ ؛ ۱۹/۱۰۴ ؛ ۱۹/۱۱۷ ؛ ۵۸/۴ ؛ ۲/۱۰۴ ؛ ۲/۱۷۸ ؛ ۵/۷۳ ؛ ۳/۲۰ ؛ ۹/۳۴ ؛ ۸۴/۲۴ ؛ ۳۱/۷ ؛ ۴۵/۸ ؛ ۲۲/۲۵ ؛ ۶۷/۲۸ ؛ ۶۱/۱۰ ؛ ۴۶/۳۱ ؛ ۴۳/۶۵ ؛ ۱۵/۵۰ ؛ ۳۷/۳۸ ؛ ۸/۱۳۸ ؛ ۴/۱۷۳ ؛ ۱۶/۱۰ ؛ ۳۳/۸ ؛ ۷۶/۳۱ ؛ ۱۲— ۱۳/ ۷۳)۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کی تباہی کن لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

لَوَاقِعٌ (۵۲/۷)۔ یادرکھو! یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی طرف سے یہ تباہی واقع ہو کر رہتی ہے ۔ یہ یونہی (خالی) دھمکی نہیں۔ سورۃ المعارج میں اسے عَذَابٌ وَّاقِعٌ (۷۰/۱) سے تعبیر کرکے کہا ہے کہ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ (۷۰/۲) دنیا کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ (۴۲/۴۴) تو کہیں اس منظر کو دیکھتا جب یہ ظٰلمین اس تباہی کو سیلابِ بلا کی طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر بے ساختہ چلا اٹھتے کہ کیا اس کے لوٹ جانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے ؟

لیکن چونکہ تباہی آتی ہی اس وقت ہے جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے اس لئے اس کے واپس جانے یا اس سے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ اس تباہی کا ذکر تھا جسے قرآنِ کریم نے دنیا اور آخرت کی تخصیص کے بغیر بیان کیا ہے۔ اگلے باب میں اعمال کے ان نتائج کا ذکر آئے گا جو اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔

نواں باب

دُنیاوی زندگی میں اعمال کی
جزا اور سزا

جو کچھ سابقہ باب میں اصولاً لکھا گیا ہے اسے چند الفاظ میں دہرایا جاتا ہے تاکہ بات اور نکھر کر سامنے آجائے۔

(۱) دنیا میں افراد، معاشرہ کے جزو کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک متاعِ زیست سے متمتع ہونے کا سوال ہے ان کا معیار معاشرہ کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ خوشحال ہے تو افراد بھی خوشحال ہیں اور اگر معاشرہ مصیبت میں مبتلا ہے تو افراد بھی تکلیف کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۲) دنیاوی متاعِ حیات فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس میں مومن اور کافر کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو قوم بھی ان قوانین کے مطابق کوشش کرے گی، اس کا پھل اسے مل جائے گا۔

(۳) لیکن جو قوم فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرے گی وہ خود بھی امن و سکون سے رہے گی اور باقی دنیا بھی اطمینان کی زندگی بسر کرے گی[1]۔ اس کے برعکس، جو قوم

---

[1] اس قوم کے افراد کی مرنے کے بعد کی زندگی بھی کامرانیوں کی زندگی ہوگی۔ اس نکتہ کی تشریح آگے چل کر اپنے مقام پر آئیگی۔

ان اقدار سے اعراض برتے گی متاعِ زیست کی فراوانی کے باوجود وہ خود بھی جہنم کی زندگی بسر کرے گی اور اس کی وجہ سے دوسری قوموں کو بھی قلبی سکون حاصل نہیں ہوگا اور آخر الامر اس قوم کی خوشحالیاں تباہیوں میں بدل جائیں گی۔

قرآنِ کریم نے ان حقائق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور زیرِ نظر باب میں یہی حقائق' مقابلۃً اختصار اور اجمال کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں گے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم دو قسم کے نظریات کا ذکر کرتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ مقصودِ حیات فقط دنیاوی متاع و اسباب کا حصول ہے۔ اس میں کسی مستقل قدر کے پیشِ نظر رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرآن "حیات الدنیا یا عاجلہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ متاعِ حیات کے حصول اور ان کے صرف کرنے کے لئے مستقل اقدارِ خداوندی کو سامنے رکھا جائے۔ اسے قرآنِ کریم "حیاتِ آخرت" سے تعبیر کرتا ہے۔ "حیاتِ آخرت" کی اصطلاح سے یہ مراد نہیں کہ انسان دنیاوی مفاد کو تیاگ کر صرف "آخرت" کی فکر کرے۔ یہ تو نظریۂ خانقاہیت ہے جس کی قرآن سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ "حیاتِ آخرت" سے مراد ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ قرآنِ کریم کی ان دونوں اصطلاحوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔

(۰)

دنیاوی مفاد کا حصول

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس قسم کی آیات آئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳)۔

"کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا کی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے"

اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے منزل تک پہنچنے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں تخاطب صرف مومنین سے نہیں' تمام انسانوں سے ہے اور مقصد یہ ہے کہ جو قوم بھی

غور و فکر سے کام لے کر قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرلے گی، فطرت کی قوتیں اس کے زیرِ تسخیر آ جائیں گی۔
سورۂ بنی اسرائیل میں اس اہم حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ۔ جو قوم دنیا کے مفادِ عاجلہ حاصل کرنا چاہتی ہے تو ہم اسے، اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق، جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے وضع کیا ہے، دنیاوی مفاد دے دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ مستقل اقدار کی پابندی نہیں کرتی اس لئے اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ (۱۷/۱۸) وہ جہنم کی زندگی بسر کرتی ہے جس میں ذلّت و خواری اس کے حصّے میں آتی ہے۔ اس کے برعکس وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (۱۷/۱۹) جو قوم دنیاوی مفاد کے ساتھ اُخروی خوشگواریاں بھی چاہتی ہے۔ یعنی وہ خدا کی مستقل اقدار پر ایمان رکھتی ہے اور خوشگواریوں کے حصول کے لئے پوری پوری کوشش کرتی ہے تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد کہا۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (۱۷/۲۰) جہاں تک دنیاوی مفاد کے حصول کا تعلق ہے ہم دونوں گروہوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیئے جاتے ہیں کہ وہ صفحۂ ارض پر خدا کی طرف سے بکھری ہوئی بخشائشوں کو حاصل کرلیں۔ اس باب میں ہم ایسا نہیں کرتے کہ ایک گروہ کے راستے میں بند لگا دیں کہ تم اس سے آگے نہیں جا سکتے اور دوسرے گروہ کا راستہ کھلا رکھیں۔ ہم ایسا نہیں کرتے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ تم اقوامِ عالم پر نگاہ ڈال کر دیکھو کہ ہر قوم کس طرح اپنی سعی و عمل کے مطابق متاعِ حیات سے بہرہ یاب ہوتی چلی جاتی ہے ـــــ اس دوڑ میں چونکہ کسی کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیا جاتا اس لئے قومیں، اپنی جدوجُہد کی نسبت سے ایک دوسرے سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝ (۱۷/۲۱)۔ لیکن جو قوم متاعِ زیست کے حصول کے ساتھ مستقل اقدار پر بھی نگاہ رکھے، اس کے مدارج بہت بلند ہوتے ہیں اور حقیقی فضیلت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ (۲/۲۰۰) لوگوں میں وہ بھی ہیں جن کا منتہائے مقصود صرف دنیاوی

مفاد کا حصول ہوتا ہے۔ انہیں وہ مفاد تو مل جاتے ہیں لیکن ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ ان کے برعکس وَ مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (۲/۲۰۱) وہ لوگ بھی ہیں جن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیاوی خوشگواریاں بھی حاصل ہو جائیں اور ان کے ساتھ اُخروی سرفرازیاں بھی۔ اور اس طرح وہ تباہی سے بچ جائیں۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○ (۲/۲۰۲) ان کی سعی و عمل کا نتیجہ انہیں مل جاتا ہے۔ خدا تو بہت جلد حساب کر دیتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ○ (۳/۱۴۴) جو قوم دنیاوی مفاد چاہتی ہے اسے دنیاوی مفاد مل جاتے ہیں۔ جو قوم اس کے ساتھ اُخروی زندگی بھی چاہتی ہے اسے اس کا حصہ بھی مل جاتا ہے۔ ہم ہر ایک کی کوشش کو ثمربار کر دیتے ہیں۔ اوّل الذکر گروہ کے حصہ میں صرف مفادِ عاجلہ آتے ہیں۔ مستقبل کی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن ثانی الذکر گروہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○ (۳/۱۴۷)

انہیں دنیا کا حصہ بھی مل جاتا ہے اور آخرت کا حصہ بھی۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی کوششوں میں "عاجلہ اور آخرۃ" میں صحیح صحیح توازن برقرار رکھا۔ اور یہی روش قانونِ خداوندی کی رُو سے مستحسن ہے۔

مومنین کی اِس دُنیا کی زندگی

اِس خیال کے پیشِ نظر کہ "حیاتِ اُخروی کے تابناک" ہونے سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جماعتِ مومنین کی اس دنیا کی زندگی (نظریۂ خانقاہیت کے مطابق) عُسرت اور مفلوک الحالی کی زندگی ہو گی لیکن ان کی آخرت کی زندگی بڑی درخشندہ اور تابناک ہو گی۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ "ایمان و اعمالِ صالحہ" کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں عزت اور حکومت، خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی ہے۔ سورۂ نحل میں ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۱۶/۹۷)۔

جو کوئی بھی قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھے گا اور صلاحیت بخش کام کرے گا — وہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کی زندگی کو بڑا ہی خوشگوار بنا دیں گے اور اسے اس کے اعمال کا نہایت عمدہ اجر دیں گے۔

اس کی وضاحت سورۃ زمر میں ان الفاظ میں کر دی کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۳۹/۱۰) اچھے کام کرنے والوں کی اس دنیا کی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ سورۂ نور میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں حکمرانی کی زندگی ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵) جو لوگ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کریں گے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اس زمین پر حکومت عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے اسی قسم کی اقوام کو حکومت عطا کی گئی تھی۔ "دین کے تمکن" سے یہی مراد ہے (۲۴/۵۵)۔ سورۂ انبیاء میں ہے کہ خدا نے زبور میں اسی اصل الاصول کو بیان کر دیا تھا کہ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ○ (۲۱/۱۰۵) "زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں کو ملے گی۔" اس قسم کی زندگی کو (جس میں مستقل اقدار کے مطابق چلنے والی حکومت قائم ہو جائے) اس دنیا میں "جنت کی زندگی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ زمر میں کہا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے والے کہیں گے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ (۳۹/۷۴)۔

کس قدر مستحقِ حمد و ستائش ہے خدا کی وہ ذات جس نے اپنے وعدوں کو سچ کر دکھایا اور ہمیں زمین کا اس طرح وارث بنا دیا کہ ہم اس میں جہاں جی چاہے با اختیار زندگی بسر کریں، کام کرنے والوں کا یہ کیسا اچھا اجر ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ (۵۸/۲۱) خدا نے یہ لکھ دیا ہے (اس کا اٹل قانون یہ ہے) کہ خدا اور اس کے رسول، مخالفین پر ضرور غالب آکر رہیں گے۔" خدا اور رسول"

کے غلبہ سے مراد ہے اس جماعتِ مومنین کا غلبہ جو خدا کے قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کے لئے رسول (اور رسول کے بعد اس کے جانشینوں کی قیادت میں، مخالفین کے مقابلہ کے لئے اٹھے۔ اسی کو ذرا آگے چل کر حزب اللہ (خدا کی پارٹی) کہا گیا ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲) یاد رکھو! خدا کی پارٹی ہی آخر الامر کامیاب ہوگی۔ "یہ کامیابی" محض ذہنی اور اعتقادی نہیں ہوگی۔ اس دنیا میں غلبہ اور تمکن کی زندگی ہوگی۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جب ہمارے رسول، دعوتِ حق و صداقت کی بنا پر انقلاب آفرینی کے لئے اٹھے، تو اس دعوت سے انکار کرنے والوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور انہیں سخت دھمکیاں دیں۔ لیکن ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ لَنُھْلِکَنَّ الظّٰلِمِیْنَ (۱۴/۱۳) ہم ان مستبدین کو یقیناً تباہ کر دیں گے۔ وَلَنُسْکِنَنَّکُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ (۱۴/۱۴) اور ان کے بعد اس سرزمین میں تمہیں بسا دیں گے۔ اس کی عملی مثال کے لئے ایک مقام پر بنی اسرائیل کی تاریخ سے شہادت پیش کی گئی کہ ہم نے فرعون اور اس کے جیوش و عساکر کو ان کے باغات اور باعزت مقامات سے نکال باہر کیا۔ وَ اَوْرَثْنٰھَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۵۹) اور ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔ اور دوسری مثال خود عہدِ رسالتمآبؐ کی جماعتِ مومنین کی پیش کی کہ اس قدر طول طویل کشمکش کے بعد مخالفین مغلوب ہوگئے۔ وَ اَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَدِیَارَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْھَا (۳۳/۲۷) اور ان کی زمینوں کا اور شہروں کا اور مال و دولت کا وارث، جماعتِ مومنین کو بنا دیا اور اس کے بعد ان ممالک میں بھی ان کی حکومت قائم کر دی جن تک وہ ہنوز پہنچ بھی نہیں پائے تھے۔

تم اپنی جگہ کام کرو میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں

حق و باطل کی اس کشمکش کے ابتدائی ایام میں، (ظاہر ہے کہ) جماعتِ مومنین تعداد کے لحاظ سے بھی قلیل ہوتی تھی اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے بھی بہت کمزور۔ لیکن بایں ہمہ انہیں اپنے پروگرام کی صداقت اور آخر الامر اپنی کامیابی پر اس قدر یقین محکم ہوتا تھا کہ مخالفین سے کہہ دیا جاتا تھا کہ

اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَکُوْنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ ۭ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۶/۱۳۶؛ ۱۱/۱۲۱؛ ۳۹/۳۹)۔

تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو. مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو. عنقریب تم دیکھ لوگے کہ انجام کار کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے. میں تم سے ابھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی.

دوسری جگہ کہا کہ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ٥ (۶/۱۵۹) ان سے کہہ دو کہ تم بھی اپنے پروگرام کے نتیجہ کا انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ (نیز ۷/۷۱؛ ۱۰/۲۰؛ ۱۰/۱۰۲؛ ۱۱/۱۲۲؛ ۳۲/۲۹؛ ۴۴/۵۹)۔ سورۂ ہود میں ہے کہ رسول نے قوم مخالف سے کہہ دیا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو، میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں. سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ تباہی آتی ہے جو اسے ذلیل و خوار کر دے گی اور کون اپنے دعوے میں جھوٹا ہے. وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ٥ (۱۱/۹۳) تم بھی دھیان رکھو میں بھی تمہارے ساتھ دھیان رکھتا ہوں. انجام کار نتیجہ خود شہادت دے دے گا. یہ جو کہا گیا ہے کہ عنقریب تم دیکھ لوگے کہ کون ذلیل و خوار ہوتا ہے. تو ظاہر ہے کہ یہ ذلت و خواری، اسی دنیا کی ہے. مرنے کے بعد کی نہیں. اس لئے کہ مرنے کے بعد کی ذلت و خواری اس دنیا میں کسی کے سامنے نہیں آسکتی اس لئے اسے اس طرح اپنی صداقت کے لئے بطور چیلنج پیش نہیں کیا جا سکتا. یہ نتائج اسی دنیا میں سامنے آجانے والے ہیں. سورۂ یونس میں اس نکتہ کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ٥ (۱۰/۱۰۲).

انہیں اس کے سوا اور کس بات کا انتظار ہے کہ جو حشر ان سے پہلی اقوام کا ہوا تھا وہی حشر ان کا ہو سو ان سے کہو کہ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں. اس سے ظاہر ہے کہ اقوامِ سابقہ کے جس انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اسی دنیا میں سامنے آیا تھا (مرنے کے بعد نہیں). اس لئے جماعت مومنین اور ان کے مخالفین کے پروگرام کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے آجانا تھا.

اور یہ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (۶/۴۵).

ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے اور یہ حقیقت ساری دنیا کے سامنے آجاتی ہے کہ

خدا کا پروگرام ہی مستحق حمد و ستائش ہوتا ہے۔

اس لئے کہ هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (۶/۴۷) تباہی آتی ہی ظالم قوم پر ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے۔ یونہی دھاندلی یا اتفاق (CHANCE) سے نہیں ہو جاتا۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جو تباہ ہوتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کے مطابق تباہ ہوتا ہے۔ جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہتا ہے۔ یہی قوموں کے عروج و زوال کا اصول اور ان کے استبدال و استخلاف کا قانون ہے (۹/۳۹ ؛ ۴۷/۳۸)۔

(۱)

قوموں کی تباہی کی شکلیں

اس دنیا میں قوموں کی تباہی بہرحال مادی اسباب کے ذریعہ ہی واقع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے (سورۃ بقرہ میں) ایک عظیم بنیادی حقیقت کی طرف توجہ منعطف کرائی ہے۔ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں)۔ وہ کہتا یہ ہے کہ انسانوں کی راہ نمائی کے لئے جو قوانین دیئے گئے ہیں، ان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ قوانینِ فطرت پر مشتمل ہے جن سے طبیعی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے حصہ کا تعلق مستقل اقدار سے ہے جن کا اطلاق انسان کی "انسانی زندگی" پر ہوتا ہے۔ ان دونوں قسموں کے قوانین کا نام الکتٰب یا ضابطۂ قوانینِ خداوندی ہے۔ جو قوم اس پورے کے پورے ضابطۂ قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے اس کی زندگی مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ جو ان میں سے ایک حصہ پر عمل کرتی ہے ان کے حصہ میں ذلت و خواری آتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک حصہ پر عمل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) جو قوم اخلاقی ضوابط کو تو پیشِ نظر رکھتی ہے لیکن طبیعی قوانین سے پہلو تہی کرتی ہے وہ خانقاہیت کی زندگی بسر کرتی ہے جس سے وہ دنیا میں زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کے برعکس

(۲) جو قوم صرف طبیعی قوانین پر انحصار کرتی ہے اور اخلاقی قوانین (مستقل اقدار) سے اعراض

برتتی ہے اس کا معاشرہ اخلاقی ناہمواریوں کی نذر ہوجاتا ہے اس لئے یہ قوم بھی تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۸۵)۔

کیا تم اس ضابطۂ قوانین کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے ہو؟ جو قوم بھی ایسی روش اختیار کرے گی اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہوگی[1] اور آخرت میں سخت ترین عذاب میں ماخوذ۔ خدا تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہوتا ہے۔

جو قوم معاشرہ میں اخلاقی ناہمواریاں پیدا کرتی ہے اس میں (CORRUPTION) عام ہوجاتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کی انتظامی مشینری بگڑ جاتی ہے اور طبیعی استحکامات اس قدر ناقص اور کمزور ہوجاتے ہیں کہ وہ ارضی یا سماوی حوادث کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ قرآن کریم نے اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتے ہوئے جو کہا ہے کہ فلاں قوم سیلاب کی وجہ سے تباہ ہوگئی۔ فلاں آندھی کے طوفان کا مقابلہ نہ کرسکی۔ فلاں کو آتش فشاں کی آتش ریزی اور سنگ باری نے ہلاک کردیا۔ تو وہ اس نوعیت کی تباہی کی مثالیں ہیں۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔

اس تباہی کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خانہ جنگی شروع ہوجاتی ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۶۵)۔

ان سے کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے تباہی کے اسباب بھیجدے یا نیچے سے۔

---

[1] دنیا میں ذلت کے لئے نیز دیکھئے (۲/۱۱۴؛ ۵/۳۳)۔

یا تم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر گڈمڈ ہو جاؤ اور باہمی خانہ جنگی شروع کر دو۔ دیکھو! ہم کس طرح
حقائق کو مختلف انداز سے تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم بات سمجھ جاؤ۔

ان حالات سے کوئی دوسری قوم فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کر دیتی ہے اور اس طرح اس کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اگر یہ (حملہ آور) قوم بھی مستقل اقدارِ خداوندی پر ایمان نہیں رکھتی تو یہ مقابلہ دونوں قوموں کی صرف طبیعی قوتوں کا ہوتا ہے اور نوعِ انسان کو ایک کی شکست اور دوسری کی کامیابی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اس سے ایک مستبد قوت کی جگہ دوسری مستبد قوت برسرِ اقتدار آجاتی ہے۔ لیکن اگر یہ دوسری قوم اقدارِ خداوندی کی متبع ہو تو اس کا غلبہ انسانیت کے لئے موجب برکات وسعادت ہوتا ہے کیونکہ اس کا غلبہ، عدل واحسان کی برتری کے لئے ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہیں مختلف شکلیں، جن میں، قوموں کی غلط روش کے نتائج ان کی تباہی بن کر اس دنیا میں ان کے سامنے آجاتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں تباہی کی ان مختلف شکلوں کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ ہم یہاں ان کا تذکرہ اجمالاً کرتے ہیں۔

(۰)

اقوامِ سابقہ کی تباہی

قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کی تاریخی سرگزشتوں کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ ایک قوم کے جرائم (اخلاقی ناہمواریوں) میں اس جرم کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے جو اس قوم میں سب سے زیادہ عام ہو چکا تھا اور ان میں طرح طرح کی خرابیوں کا موجب بن رہا تھا۔ ایسے میں، ان کی طرف خدا کا ایک پیغام ساں (رسول) آتا ہے جو انہیں ان کی اس روش کے ہلاکت آفریں نتائج سے آگاہ کر کے، انہیں صحیح روش پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اس کی ہدایات پر کان نہیں دھرتی اور اپنی غلط روش میں آگے ہی آگے بڑھے چلی جاتی ہے تآنکہ کوئی ارضی یا سماوی حادثہ اسے تباہ کر دیتا ہے۔ بظاہر ان کے اس اخلاقی جرم اور اس حادثہ میں کوئی ربط نظر نہیں آتا، اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا نے اس قوم کی تباہی کے لئے اس "عذاب" کو فوق الفطرت (SUPER-NATURAL) طریقہ سے بطور معجزہ

نازل کر دیا۔ لیکن درحقیقت بات یہ نہیں۔ اس قوم کی اس روش اور اس تباہی میں گہرا ربط ہوتا ہے۔ اس قوم کی اخلاقی ناہمواریوں کی وجہ سے اس کے معاشرہ میں اس قدر خرابیاں عام ہو جاتی تھیں کہ وہ فطری حوادث سے محفوظ رہنے کی حفاظتی تدابیر کی طرف سے غافل اور لاپروا ہو جاتی تھی۔ خدا کا رسول انہیں صرف "اخلاقی نصائح" نہیں کرتا تھا وہ انہیں متنبہ کرتا تھا کہ ان اخلاقی ناہمواریوں کی وجہ سے ایک تو ان کے معاشرہ میں بے اطمینانی پھیل رہی ہے اور دوسرے وہ اپنی حفاظتی تدابیر کی طرف سے لاپروا ہو چکے ہیں۔ اس لئے اگر فطری حوادث میں سے کوئی ایک حادثہ بھی آپہنچا تو وہ انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیگا۔ فطری حوادث آج بھی کچھ کم نہیں ہوتے لیکن ایک تو اُس زمانے کے عام جغرافیائی حالت کی وجہ سے اور (اُس زمانے میں) سائنٹفک تحقیقات و ایجادات کے فقدان کے باعث، یہ حوادث بڑی سخت تباہی کا موجب بن جاتے تھے۔ آج بھی جن قوموں میں معاشرتی خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور وہ طبیعی حوادث کی روک تھام کے لئے مناسب اقدامات نہیں کرتیں، اس قسم کے حوادث انہیں بُری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو قومیں ان حوادث کی روک تھام کی حفاظتی تدابیر کر لیتی ہیں، وہ ان کی تباہیوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے ان کی تباہی کی شکلیں اور پیدا ہو جاتی ہیں)۔ یہ تھا ربط ان اقوام کی معاشرتی خرابیوں اور خارجی حوادث سے ان کی تباہی میں ——— اس قوم کے جو افراد، رسول کی باتوں کو سچا سمجھتے تھے (وہ اگر اتنی قوت نہیں رکھتے تھے کہ اس قوم کے معاشرہ میں انقلاب پیدا کر دیں یا انفرادی طور پر اپنی حفاظت کا سامان کر لیں تو) وہ اس حادثہ کے رونما ہو جانے سے پہلے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتے اور وہاں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ نو کر لیتے تھے۔ (اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے)۔

قومِ نوح

قرآنِ کریم ، اس انداز سے قوموں کی تباہی کے تذکرہ کا سلسلہ، قومِ نوح سے شروع کرتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس قوم میں طبقاتی امتیاز اس قدر شدید ہو چکا تھا کہ دولتمند طبقہ محنت کشوں اور مزدوروں کو بڑی ذلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے تک کو اپنے لئے باعثِ ذلت سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس بستی کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ نشیب میں واقع تھی۔

اور بارش کے وقت، اردگرد کی پہاڑیوں کا پانی اس راستے سے گذرتا تھا۔ چونکہ قوم کا اوپر کا طبقہ اپنی دولت کے نشہ میں بدمست تھا اس لئے وہ اس خطرہ کی مدافعت کے لئے کوئی حفاظتی تدبیر نہیں سوچتا تھا۔ حضرت نوحؑ ان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قوم کی توجہ ان خرابیوں کی طرف منعطف کرائی۔ لیکن قوم کے اوپر کے طبقہ نے ان کی سخت مخالفت کی۔ جہاں تک سیلاب کے خطرہ کا تعلق تھا، انہوں نے اس سے بھی قوم کو متنبہ کیا لیکن انہوں نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ خطرہ اس طرح سر پر منڈلا رہا تھا کہ حضرت نوحؑ نے (خدا کی بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق) ایک کشتی بنانی شروع کر دی۔ وہ لوگ اس پر بھی انکا مذاق اڑاتے رہے، تاآنکہ ایک دفعہ بڑے زور کی بارش ہوئی اور اردگرد سے پانی اُمنڈ کر آگیا۔ کشتی نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور باقی بستی والے تباہ ہو گئے۔ (اس تذکرہ کے لئے دیکھئے آیات ۷/۵۹؛ ۱۱/۲۶؛ ۱۱/۳۹؛ ۱۱/۳۷؛ ۲۵/۳۷؛ ۷۱/۱ ؁)۔

قومِ عاد

قومِ عادؔ کے متعلق قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ بڑی قوت وحشمت اور دولت وسطوت کی مالک تھی۔ سامانِ زیست کی فراوانیاں، وسیع وعریض محلات، مستحکم قلعے۔ لیکن ان کے ظلم واستبداد کا یہ عالم تھا کہ وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝ (۲۶/۱۳۰) وہ اپنے پنجۂ فولادی کی گرفت سے کمزوروں اور مظلوموں کی ہڈیاں توڑ ڈالا کرتے تھے۔ دولت وقوت کی فراوانی اور ظلم واستبداد کی حدود فراموشی سے معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں وہ ظاہر ہیں۔ حضرت ہودؑ نے ہزار کوشش کی کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر قوانینِ خداوندی کی محکومی اختیار کر لیں لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ سنی اور خرابیاں بڑھتی اور حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت اور لاپروائی عام ہوتی چلی گئی۔ ایک دفعہ آندھی کا ایسا خطرناک طوفان آیا کہ اس نے ہفتہ بھر تک اس علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھا اور یوں وہ

؁ میں نے اپنی تصانیف جوئے نور۔ برقِ طور۔ اور شعلۂ مستور میں ان اقوامِ سابقہ کی داستانیں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں، اس لئے اس مقام پر میں انہیں تفصیلاً بیان نہیں کر رہا۔ اس وقت میرے پیشِ نظر صرف قانونِ مکافاتِ عمل کی اصولی بحث ہے۔ جو احباب ان اقوام کی تفصیلی داستانیں دیکھنا چاہیں وہ ان کتابوں میں ملاحظہ فرمالیں۔

قوم تباہ ہوگئی۔ دولت و قوت کے نشہ نے ان کو ایسا اندھا اور بہرہ کر دیا تھا کہ ان کی عقل و فکر ان کے کسی کام نہ آسکی۔ قرآنِ کریم ان کی تباہی کا تذکرہ کرنے کے بعد، نبیؐ اکرمؐ کے مخالفین کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَآ اَبْصَارُهُمْ وَ لَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۴۶/۲۶)۔

ہم نے انہیں ملک میں اس قدر قوت اور تمکن عطا کر رکھا تھا کہ ایسی قوت و تمکین تمہیں بھی نصیب نہیں۔ انہیں دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی ساری صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن چونکہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے خلاف روش اختیار کر رکھی تھی اس لئے ان کی یہ صلاحیتیں سب بیکار ہو کر رہ گئیں اور جس تباہی کے ذکر تک کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا[1]۔

قومِ ثمود

قومِ عادؔ کے بعد قومِ ثمودؔ کا تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں معیشت کا بیشتر دار و مدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ یہ مویشی چراگاہوں میں چرتے اور چشموں سے پانی پیتے تھے۔ لیکن قوم کے ذی قوت و اقتدار طبقہ نے ان چراگاہوں اور چشموں پر ذاتی قبضہ جما رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ پیٹ بھرنے کو چارہ ملتا تھا، نہ پینے کو پانی۔ حضرت صالحؑ نے ان کی توجہ ان خرابیوں کی طرف منعطف کرائی اور ان سے کہا کہ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (۷/۷۴)۔ خدا کی زمین، خدا کی مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنے دو اور اس قسم کی ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ ان ناہمواریوں کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اوپر کا طبقہ، بلا محنت و مشقت، امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور دولت کی فراوانی نے انہیں ایسا بدمست کر دیا ہے کہ وہ ملک کی رفاہی تدابیر کی طرف سے مدہوش ہو چکے ہیں اور

---

[1] قومِ عادؔ کے تذکرہ کے سلسلہ میں دیکھئے (۱۱/۵۸؛ ۲۱-۴۶/۲۴؛ ۱۳۵-۲۶/۱۳۸؛ ۵۴/۲۱؛ ۷/۶۹)۔

نیچے کا طبقہ اپنی مصیبتوں سے اس قدر پریشان ہے کہ اسے کسی دوسری طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔ تمہارے علاقے میں آئے دن زلزلے آتے رہتے ہیں۔ اگر تم نے حفاظتی تدابیر اختیار نہ کیں تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔ انہوں نے ان کی ایک نہ سُنی اور آخر زلزلے کے جھٹکوں نے انہیں تباہ کر دیا۔ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھی اس سے قبل (حضرت ہودؑ کی طرح) کسی محفوظ علاقے کی طرف منتقل ہو چکے تھے۔ (اس سلسلہ میں دیکھئے۔ (۷/۷۳؛ ۱۱/۶۴؛ ۲۶/۱۵۶؛ ۴۱/۱۷)۔

قومِ لُوطؑ

یہ قوم بحیرہ میت (DEAD SEA) کے اس علاقہ میں آباد تھی جو آتش فشاں پہاڑی کے دامن میں تھا۔ رہزنی اور قزاقی ان کا شیوہ تھا اور جنسی بدنہادی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ لواطت کو معاشرہ میں معیوب ہی نہیں سمجھا جاتا تھا (۲۹/۲۹)۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی وحشی اور جاہل قوم، معاشرہ کے لئے حفاظتی تدابیر کیا سوچتی؟ حضرت لوطؑ نے ہزار کوشش کی کہ انہیں راہِ راست پر لے آئیں لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مانی اور اپنی انسانیت سوز حرکات میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ معاشرہ کا نظم و نسق تہس نہس ہو گیا اور کوہِ آتش فشاں کی سنگ باری نے انہیں تباہ کر دیا۔ حضرت لوطؑ اپنے چند ساتھیوں کو لے کر قبل از وقت وہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ۱۱/۷۶؛ ۲۹/۲۹؛ ۵۱/۳۷؛ ۵۴/۳۸)۔

قومِ شعیبؑ

مدین میں بسنے والی اس قوم کو بڑا کاروباری فروغ حاصل تھا لیکن ان کا یہ فروغ ان کے نظامِ سرمایہ داری کا رہینِ منت تھا۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ "دوسروں سے لیا زیادہ جائے اور دیا کم جائے"۔ حضرت شعیبؑ انہیں اس غلط معاشی نظام سے روکتے اور ان سے کہتے کہ

يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ (۱۱/۸۵)۔

تم اپنے ماپ تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ دھوکا اور فریب سے لوگوں کی چیزیں نہ ہتھیا لیا کرو۔ اس سے

معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہوجاتی ہیں جن کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں. دولت کے نشہ میں بدمست سرمایہ دار طبقہ ان کا مذاق اڑاتا اور ان سے کہتا کہ "میاں! تم خدا پرست انسان ہو تو اپنے نماز روزے سے کام رکھو. تمہیں ان دنیاوی دھندوں سے کیا واسطہ. یہ ہمارا کاروبار ہے اسے ہم جس طرح چاہیں سرانجام دیں. غریبوں اور ناداروں کا سارا درد تمہارے ہی جگر میں کیسے جاگزیں ہوگیا. ہم جانتے ہیں کہ یہ کس سلوک کے مستحق ہیں اور انہیں کتنا دینا چاہیئے. اس قسم کی باتیں کرکے تم انہیں یونہی سر نہ چڑھاؤ (۱۱/۸۷). اس قسم کے غلط معاشی نظام سے معاشرہ کے نظم و نسق میں جو ابتری پھیل سکتی ہے وہ ظاہر ہے. اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا (۱۱/۸۴: ۲۶/۱۸۹).

قومِ سبا

یہ قوم یمن میں رہتی تھی. ابتداءً ان کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا. اس کے لئے انہوں نے اپنی بستی سے اوپر پہاڑی علاقہ میں پانی کا ایک بہت بڑا بند (DAM) تعمیر کر رکھا تھا جس سے اردگرد کا علاقہ بڑا سرسبز و شاداب رہتا اور انہیں جھولیاں بھر بھر کر پھل دیتا تھا. انہیں کسی طرح تجارت کا چسکا پڑ گیا اور ہر سرمایہ دار کی طرح ان کی ہوس زر دن بدن بڑھتی چلی گئی. دولت سمیٹنے کی اس مسابقت (RACE) میں یہ اس قدر منہمک ہوئے کہ ملک کا نظم و نسق تباہ ہوتا چلا گیا. بند میں شگاف پڑنے شروع ہوگئے لیکن ان کی طرف کسی نے توجہ ہی نہ دی. چنانچہ ایک سال اس کے سامنے کی دیوار جو ٹوٹی ہے تو ان کی بستیاں اور سارا علاقہ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا. ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا (۳۴/۱۷) انہوں نے جو غلط روش اختیار کی تھی تو یہ اس کا نتیجہ تھا. وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ. انہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴/۱۹) ان کی اجتماعیت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے. وہ خس و خاشاک کی طرح بکھر گئے اور وہی قوم جو کسی وقت اس قدر ممتاز زندگی بسر کرتی تھی اس طرح مٹ گئی کہ لوگوں کی زبانوں پر بس ان کی کہانیاں باقی رہ گئیں (۳۴/۱۶ـــ۱۹).

یہ ہیں اس تباہی کی مثالیں جو نظم و نسق کی خرابی کی وجہ سے حوادثِ ارضی و سماوی سے حفاظت کی تدابیر اختیار نہ کرنے کے باعث قوموں پر وارد ہوتی ہے.

تباہی کی دُوسری شکل

تباہی کی دوسری شکل یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی داخلی خرابیوں کی وجہ سے کمزور ہو جائے تو کوئی دوسری مستبد قوم جو قوت میں اس سے زیادہ ہو، اسے آکر جھپٹ لے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم بنی اسرائیل (یہودیوں) کی عبرت آمیز داستان ہمارے سامنے لاتا ہے۔

وہ سب سے پہلے ان کی قومی زندگی کے اس گوشے کا تذکرہ کرتا ہے جس میں وہ فراعنۂ مصر کی محکومی میں ذلّت کے دن گزارتے تھے۔ اسے بھی قرآنِ کریم نے "عذاب" قرار دیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں گئے ہیں تو اس نے ان کی ابتدائی زندگی کو سامنے لاکر اپنے احسانات گنوانے شروع کئے، اس پر حضرت موسیٰؑ نے جواب میں ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (۲۶/۲۲)

تمہاری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے، یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

اس کے برعکس، اس قوم پر خدا کی طرف سے جو احسان ہونے والا تھا وہ یہ تھا کہ اسے فرعون کی محکومی سے نجات دلا کر وارثِ حکومت و سلطنت بنا دیا جائے۔

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (۲۸/۶-۵)

اور ہم چاہتے تھے کہ جس قوم کو اس طرح کمزور و ناتواں بنا دیا گیا ہے اسے اس قعرِ مذلّت سے نکال کر دوسری قوموں کا امام (لیڈر) بنائیں اور اسے قومِ غالب کے تخت و تاج کا وارث قرار دیں اور انہیں ملک میں حکومت عطا کر دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر اپنے اعمال کے اس مآل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس کے تصور تک سے وہ لرزاں رہتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی قیادت میں سالہا سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد یہ قوم اہلِ فرعون کی محکومی کے شکنجے سے آزاد ہوئی۔ پھر اسے وہ عروج نصیب ہوا جو تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بھی ان کے اپنے حسنِ عمل کا نتیجہ تھا۔ پھر جب انہوں نے اس روش کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کر لی تو ان پر وہ تباہی آئی جس کی مثال تاریخِ امم میں بہت کم ملے گی۔ سب سے پہلے ان کی تباہی بابل کے شہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم میں ہے کہ

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِى بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا۟ خِلَٰلَ ٱلدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ (۱۷/۵)۔

جب ان کی تباہی کے دو مواقع میں سے پہلا موقعہ سامنے آیا تو (اے بنی اسرائیل) تم پر ایسے لوگ چڑھ دوڑے جو بڑے ہی خوفناک اور جنگ جو تھے۔ وہ تمہاری بستیوں کے اندر پھیل گئے اور یوں خدا کا قانونِ مکافات نتیجہ خیز ہو کر رہا۔

اس سے اس قوم نے عبرت پکڑی۔ اپنی سابقہ روش پر نادم ہوئے اور اپنی اصلاح کی کوشش کی چونکہ ابھی ان کی خرابیوں کا پلڑا بہت زیادہ جھکا نہ تھا اس لئے ان کی بازآفرینی کا امکان تھا۔ فارس کا شاہنشاہ خورس (ذوالقرنین) بابل کی مستبد شاہنشاہیت کے خلاف برقِ خاطف بن کر اُبھرا۔ انہیں ان کے غلط اعمال کی سزا دی اور بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں دوبارہ بسا دیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے پھر قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اقدارِ سماوی کو پامال کر دیا، تو ان کی آخری تباہی کا وقت آگیا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں۔

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ ٱلْءَاخِرَةِ لِيَسُـۥٓـُٔوا۟ وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا۟ مَا عَلَوْا۟ تَتْبِيرًا ۝ (۱۷/۷)

جب تمہاری تباہی کا دوسرا وقت آیا تو تم پر وہ لوگ حملہ آور ہوئے جنہوں نے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیا۔ انہوں نے ہیکل میں داخل ہو کر اسے اسی طرح تباہ و برباد کر دیا جس طرح پہلے حملہ آوروں نے کیا تھا۔ اور جو کچھ سامنے نظر آیا اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

بنی اسرائیل کی اس تباہی کی ابتدا پامپی (رومی) کے ہاتھوں ہوئی اور ٹائٹس کی یورش سے اختتام تک پہنچ گئی۔ قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے ان جرائم کو گنایا ہے جن کا نتیجہ اس قوم کا یہ عبرت انگیز انجام تھا۔

اس کے بعد، اُن کی حالت یہ ہوگئی کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوْا (۳/۱۱۱) وہ جہاں گئے ذلّت و محکومی سایہ کی طرح ان کے ساتھ چپکی رہی۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۹/۲۶) اقوامِ سابقہ کی ان تاریخی یادداشتوں میں، ان لوگوں کے لئے صد ہزار سامانِ عبرت ہے جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کا یہ انجام[1]، قوموں کی تباہی کی دوسری شکل ہے جس میں زیادہ قوت والی قوم، کمزور قوم کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

قوموں کی تباہی کی تیسری شکل

قوموں کی تباہی کی تیسری شکل یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والی قوم کے مقابلہ میں ایک ایسی قوم کھڑی ہو جائے جو مستقل اقدار کی علمبردار ہو اور دنیا میں عدل و احسان کا نظام قائم کرنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل، اسے حق و باطل کی کشمکش یا دو متخالف نظریاتِ زندگی (IDEOLOGIES) کی جنگ کہا جائے گا۔ اس کشمکش کے دوران، یہ ہو سکتا ہے کہ حق کی علمبردار جماعت کی عارضی طور پر پسپائی ہو جائے لیکن اگر وہ استقامت سے کام لے گی تو اپنے سے دس دس گنا زیادہ طاقتور دشمن پر بھی کامیابی حاصل کر لے گی (۸/۶۵)۔ یاد رہے کہ اس جنگ میں، حق کی حامی جماعت کو بھی پوری پوری قوت فراہم کرنی ہوگی (۸/۶۰) اور ان کی کامیابی ان کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہوگی جسے "نصرتِ خداوندی" یا "تائیدِ غیبی" کہا جاتا ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ اپنے مقصد کے مبنی بر حق و صداقت ہونے پر یقینِ محکم۔ اس تمام جدوجہد میں اخلاقی اقدار کی پوری پوری نگہداشت ان میں ایسا محکم کیرکٹر پیدا کر دیتی ہے جو مادی قوتوں کی کمی کا ایک حد تک ازالہ کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی، تسلسلِ حیات پر ایمان (یعنی اس حقیقت پر یقینِ محکم کہ موت کے ساتھ زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ ہم مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور وہ زندگی، موجودہ زندگی

---

[1] بنی اسرائیل پر اس دنیا میں "عذاب" کے سلسلہ میں یہ آیات بھی دیکھئے (۲/۴۹؛ ۵/۱۸؛ ۷/۱۴۱؛ ۷/۱۶۵—۱۶۴؛ ۷/۱۴—۶؛ ۲۰/۴۷) اور قومِ فرعون کی تباہی کے سلسلہ میں (۱۰/۸۸؛ ۲۰/۴۸—۴۷؛ ۲۰/۶۱؛ ۴۰/۴۵)۔

کے مقابلہ میں کہیں زیادہ حسین و تابناک ہوگی) ان کے دل سے موت کا ڈر قاطبتہً نکال دیتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو موت کا ڈر نہ ہو اس کی قوتِ بازو کا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔ یہ جنگ بھی درحقیقت "ثقل و خفت موازین" (پلڑوں کے جھکنے اور اٹھنے) کی جنگ ہوتی ہے۔ چونکہ حق و صداقت کی علمبردار جماعت کا حسنات کا پلڑا، فریقِ مخالف کے مقابلہ میں بھاری ہوتا ہے اس لئے اسے کامیابی ہوجاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ بات یوں شروع کی گئی ہے کہ

> کتنی قومیں اس سے پہلے تباہ ہوگئیں اور ہمارا عذاب ان پر کبھی رات کے وقت آگیا کبھی دوپہر کے وقت جب وہ آرام کررہے تھے۔ جب تباہی ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تو ان کی چیخ و پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ —— ہاں! ہم نے بڑے مظالم کئے اور یہ نتیجہ انہی کا ہے۔ یہ تباہی یونہی نہیں آجاتی۔ حق و صداقت کی علمبردار جماعت (جس کی قیادت خود رسول کررہا ہوتا ہے) کی ذمہ داریوں کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے اور فریقِ مقابل سے بھی اسی طرح بازپرس ہوتی ہے (۴-۷/۷)۔

اس کے بعد ہے۔

> وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ○ (۸-۷/۹) (نیز ۳۵-۲۱/۴۷)
>
> اس وقت ہماری میزانِ عدل ٹھیک ٹھیک فیصلہ دے دیتی ہے۔ جس کا پلڑا جھکا ہوتا ہے وہ کامیاب ہوجاتا ہے، جس قوم کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے وہ اپنے مظالم کی وجہ سے تباہ ہوجاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے (حق و صداقت کی علمبردار قوم کے ہاتھوں) مجرم قوم کی تباہی کے سلسلہ میں نمایاں طور پر ایک تو حضرت موسیٰؑ اور اہلِ فرعون کی کشمکش کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ تفصیلی طور پر نبی اکرمؐ (اور حضورؐ کے رفقاء) کی، مخالفینِ عرب کے ساتھ کشمکش کا ذکر۔ قرآنِ کریم کا ایک معتدبہ حصہ اسی کشمکش کی بصیرت افروز اور عبرت انگیز داستان پر مشتمل ہے۔ قومِ مخالف کی پے در پے شکستوں اور آخر الامر ان کی قوت کے خاتمہ کو، ان کی غلط روشِ زندگی کے فطری نتیجہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو خدا

کے قانونِ مکافات کی رُو سے سامنے آگیا۔ اسی کو "خدا کا عذاب" کہا گیا ہے اور بار بار اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ "ان پر اس قسم کا تباہی کا عذاب کیوں آتا" جبکہ ان کی حالت یہ تھی (کہ وہ یہ کرتے تھے اور وہ کرتے تھے) (۳۴ـ۳۷/۸)۔ اس سلسلہ میں ان سے کہا گیا کہ

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ (۴۸ـ۴۹/۶)۔

ہمارے پیغام برآتے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے اور صحیح روش کا مآل بڑا خوش آیند۔ سو جو قوم ان کی بات مان لیتی ہے اور اس کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتی ہے تو ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! یہ سب جھوٹ ہے ان پر، ان کی غلط روش کی وجہ سے تباہی آجاتی ہے۔

اس ٹکراؤ میں، پہلی بار ہی قومِ مخالف کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، انہیں نقصان پہنچتا ہے اور اس طرح انہیں موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی غلط روش چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کریں۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ لوگ اس مہلت کے وقفہ سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی مخالفت میں شدت اختیار کر لیتے ہیں اس طرح رفتہ رفتہ ان کی آخری تباہی کا وقت آجاتا ہے۔ حضور رسالت مآبؐ کے ساتھ فریقِ مخالف کے تصادمات کی یہی کیفیت تھی (۱۰۱ـ۱۰۲/۹)؛ (۲۰۱ـ۲۰۳/۲۶)؛ (۴۱ـ۴۲/۲۵)؛ (۷۵ـ۷۷/۲۳)؛ (۱۲۶/۹)؛ (۸/۱۱)۔

رسولُ اللہ کی بعثت سے پہلے ان لوگوں (عربوں) کے گرد و پیش جو قومیں بستی تھیں ان میں سے کسی کا معاشرہ بھی قوانینِ خداوندی پر متشکل نہیں تھا۔ اس لئے اُس وقت نظریات کے درمیان کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُس وقت معاملہ خالص "دنیاوی سیاست" کا تھا جس کی رُو سے ان (اہلِ عرب) نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ کوئی قوم انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن ظہورِ اسلام کے بعد، تصادم نظریات کا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ انہیں پہلے واضح طور پر بتا دیا جاتا کہ صحیح روش کونسی ہے اور غلط کونسی۔ پھر انہیں اس کا موقعہ دیا جاتا کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح روش

اختیار کرلیں. ایسا کیا گیا ــــ اور کافی لمبے عرصہ تک کیا گیا. (جماعتِ مومنین کی مکّی زندگی اسی تبلیغ و تبیینِ حقیقت کے لئے وقف رہی). لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا، بلکہ اپنی مخالفت میں اور متشدد ہوتے گئے تو پھر ان کی تباہی کا آغاز ہو گیا. بدر کی جنگ سے فتح مکّہ تک کا عرصہ' اس پروگرام کی دوسری کڑی تھی. یہ ہے مقصود ان آیات سے جن میں کہا گیا ہے کہ جب تک کسی بستی میں رسول نہیں بھیجدیا جاتا اس کی تباہی نہیں ہوتی ــــ یعنی ان پر تباہی کی یہ تیسری شکل وارد نہیں ہوتی. وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (۱۷/۱۵) ہم کسی بستی کو (اس طرح) تباہ نہیں کرتے جب تک وہاں اپنا پیغامبر نہ بھیجدیں. دوسری جگہ ہے. ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ (۶/۱۳۲) یہ پیغام بر اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ کسی بستی کو (اس طرح) تباہ نہ کردیا جائے کہ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ صحیح راہ کونسی ہے (۲۶/۲۰۸). اسی اصول کے مطابق، رسول اللہ سے کہا گیا کہ

وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ۝ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰى ۝ (۲۰/۱۳۴ــــ۱۳۵)

اگر ہم اس قوم کو تمہاری بعثت سے پہلے ہی تباہ کردیتے تو ان کا یہ کہنا حق بجانب ہوتا کہ ہماری طرف کوئی پیغامبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیرے قوانین کا اتباع کرلیتے اور اس طرح اس ذلّت و خواری سے بچ جاتے. لہٰذا' اے رسول! تم تبیانِ حقیقت کے بعد دیکھو کہ یہ لوگ کونسی روش اختیار کرتے ہیں. اس کے بعد بات واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ کون غلط راستے پر چلتا رہتا ہے اور کون صحیح راہ اختیار کرلیتا ہے.

رسول اس طرح دونوں راستوں کی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے ــــ اور بات کچھ ایسی مشکل نہیں ہوتی کہ سمجھ میں نہ آسکے ــــ لیکن چونکہ قوم کے صحیح روش اختیار کرنے سے اس طبقہ کے مفاد پر زد پڑتی ہے جو دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں' اس لئے وہ (یعنی مترفین) اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں ــــ انہیں اپنی دولت کی افراط اور اپنے جتھے کی کثرت پر اس قدر ناز ہوتا ہے کہ وہ

حق و صداقت کی اس کمزور سی جماعت کو خاطر ہی میں نہیں لاتے (۳۴ـــ۳۴/۳۵). وہ سمجھتے یہی ہیں کہ یہ تصادم محض طبیعی قوتوں کا ہے اس لئے یہ بات ان کے تصوّر میں کبھی نہیں آتی کہ ہم (اس قدر قوتوں کے مالک) اس کمزور جماعت کے ہاتھوں شکست کھا جائیں گے. وہ اپنی دولت کے نشہ میں بدمست اور اپنے مفادات کے تحفظ کی جدوجہد میں مدہوش یہ سمجھ ہی نہیں پاتے ـــــ بلکہ یوں کہیئے کہ ایسا سمجھنا ہی نہیں چاہتے. کہ اس تصادم میں شکست و فتح کے معیار بدل گئے ہیں. اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ

وَ مَآ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝ (۳۷ـــ۳۴/۳۸)؛ (نیز ۱۴ـــ۵۸/۱۷).

فتح و کامرانی کا مدار مال و دولت کی فراوانی اور جتھہ اور افرادِ خاندان کی کثرت پر نہیں. اس کا مدار اس پر ہے کہ خدا کے قوانین کی صداقت پر کس کا یقین محکم ہے اور کون ان کے مطابق اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے، جو ایسا کرے گا اسے (عام اندازوں کے مقابلہ میں) دُگنی کامیابیاں حاصل ہوں گی. ان کے برعکس، جو لوگ، قوانینِ خداوندی کی مخالفت کریں گے اور انہیں بے بس کر دینے کی سعی لاحاصل میں اپنی توانائیاں ضائع کریں گے، ان کے سامنے تباہی آن کھڑی ہو گی.

قرآنِ کریم میں، اقوامِ عالم کے سلسلہ میں جہاں هُوَ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ کا ذکر آیا ہے (۴۴/۸). اس سے مراد یہی ہے کہ قوموں کی موت اور زندگی کا فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے.

یہ ہے قوموں کی تباہی کی تیسری شکل. یعنی غلط روش پر چلنے والی قوم کی تباہی، اس قوم کے ہاتھوں جو حق و صداقت کا نظام قائم کرنے کے لئے کارزارِ حیات میں آئے. اسے بھی خدا نے "عذاب" سے تعبیر کیا ہے. جنگِ بدر میں قریش کی عبرت آموز شکست کے سلسلہ میں کہا کہ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝ (۱۳ـــ۸/۱۴)

یہ اس لئے ہوا کہ یہ لوگ حق و صداقت پر مبنی نظام کے قیام کی مخالفت کرتے تھے اور یہ کچھ انہی کے ہاتھوں مختص نہیں. جو لوگ بھی ایسا کریں گے ان کا انجام ایسا ہی ہوگا ــــــ ان سے کہو کہ یہ ہے عذاب (تباہی) جس سے تمہیں متنبہ کیا جاتا تھا. سو اب تم اس کا مزہ چکھو اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ حق و صداقت کی مخالفت کرنے والوں پر کس طرح "عذاب النار" آتا ہے۔

ضمناً یہاں یہ بھی دیکھئے کہ "عذاب النار" یا جہنم کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف اُخروی زندگی سے ہے. لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے جنت اور جہنم کا سلسلہ اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے. جو معاشرہ، مستقل اقدار کے مطابق متشکل ہو جاتا ہے اس کی زندگی جنت بداماں ہوتی ہے. جو اسکی مخالفت کرتے ہیں وہ جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہوتے ہیں. یہی وہ جہنمِ ارضی ہے جس میں 'نااہل لیڈر' قوموں کو دھکیل کر لے جاتے ہیں (۲۸ ــ ۱۴/۲۹).

ہاں! تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ حق و صداقت کے مقابلہ میں، قومِ مخالف کی شکست کو "خدا کا عذاب" کہا گیا ہے جو اس دنیا میں سامنے آجاتا ہے. سورۂ توبہ میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ (۹/۱۴)

"تم ان کے ساتھ جنگ کرو، خدا انہیں تمہارے ہاتھوں سے "عذاب" دے گا، انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہوگی." وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (۹/۲۶) اور جو لوگ بھی حق و صداقت کے نظام کی مخالفت میں جنگ پر اُتر آتے ہیں، ان کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے. صلح حدیبیہ کے وقت جماعت مومنین کو قریش کے خلاف جنگ کرنے سے روک دیا گیا تھا. کہا کہ یہ اس لئے تھا کہ مکہ میں کچھ مسلمان بھی بستے تھے. جنگ کی صورت میں وہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے. لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ٥ (۴۸/۲۵) اگر یہ مسلمان وہاں نہ ہوتے تو پھر ان مخالفین کو "الم انگیز عذاب" کا مزہ چکھایا جاتا. (نیز ۵۹/۱۵).

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ خیال کہ انسانی اعمال کا نتیجہ صرف اُخروی زندگی میں سامنے آتا ہے صحیح نہیں. (اُخروی زندگی میں اعمال کے نتائج کا سامنے آنا اپنی جگہ برحق ہے. اس کی تفصیل آگے چل کر ہمارے سامنے آئے گی. لیکن) اس دنیا میں بھی اعمال کے نتائج سامنے آجاتے ہیں. یہ صحیح

نہیں کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا حیطۂ اقتدار (JURISDICTION) صرف اخروی زندگی ہے اور دنیا' اس کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ خدا کے قوانین' دنیا اور آخرت دونوں میں یکساں کارفرما ہیں' البتہ اعمال کے مشہود شکل میں سامنے آنے کے لئے (خود خدا کی طرف سے) کچھ ضوابط مقرر ہیں۔ ان ضوابط کے مطابق' ایسے اعمال بھی ہیں جن کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال اس کی بیّن مثال ہے۔

قوموں کی اجل

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے قوموں کی موت و حیات کے لئے بھی "خفت و ثقل موازین" کا اصول بتایا ہے۔ اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کسی قوم کے تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری رہتا ہے' وہ قوم زندہ رہتی ہے۔ جب تخریبی امور کا پلڑا بھاری ہوجاتا ہے تو قوم پر تباہی مسلط ہوجاتی ہے۔ کبھی یہ تباہی وقتی ہوتی ہے جس میں ہنوز گنجائش ہوتی ہے کہ وہ قوم مزید تعمیری کاموں سے اس پلڑا کو جھکا لے۔ لیکن جب اس قوم میں اس پلڑے کے جھکانے کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ ہلاک ہوجاتی ہے۔ اس وقفہ کو اس قوم کی اجل کہا جاتا ہے ـــ یعنی اس کی زندگی کے عرصہ کو بھی اور جب اس کی ہلاکت کا وقت آپہنچے اسے بھی اس کی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نہ اس سے پہلے وہ قوم ہلاک ہوتی ہے نہ اس کے بعد زندہ رہ سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اصولی طور پر بتادیا کہ

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ (۱۰/۴۹)؛ (۷/۳۴)۔

ہر قوم کی زندگی کی ایک مدت ہوتی ہے۔ جب وہ مدت ختم ہوجاتی ہے تو پھر اس کے خاتمہ میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔

"ایک مدت ہوتی ہے" سے یہ مراد نہیں کہ یہ بات پہلے سے مقدر ہوچکی ہوتی ہے کہ فلاں قوم نے اتنا عرصہ تک زندہ رہنا ہے اور فلاں نے اتنا عرصہ۔ ہر قوم اپنی اجل آپ متعین کرتی ہے۔ اس کے لئے ایک قانون مقرر ہے لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ و

يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ (۱۳/۳۹) اس قانون کے مطابق اشیائے کائنات اور اقوامِ عالم کا محو و ثبات ہوتا رہتا ہے۔ جو قوم اس قانون کی پابندی کرتی ہے وہ محکم اور ثابت رہتی ہے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتی ہے مٹ جاتی ہے۔ یہ قانون انسانوں کا خود ساختہ نہیں۔ اس کا سرچشمہ مشیّت خداوندی ہے۔ سورۃ الحجر میں اسے کتابِ معلوم (۱۵/۴) کہا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ قانون ایسا نہیں جس کا علم کسی کو نہ ہو سکے۔ علمائے عمرانیت، فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ سے اس قانون کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ قانون بتا سکتا ہے کہ کس قوم نے آگے بڑھ جانا ہے اور کس نے پیچھے رہ جانا ہے (۱۵/۲۴)۔ یہ اس قانونِ مہلت (اجل) کا نتیجہ ہے کہ کسی قوم کو اس کی پہلی ہی لغزش پر تباہ نہیں کر دیا جاتا۔ اسے بازآفرینی اور تلافیٔ مافات کی مہلت دی جاتی ہے۔ لیکن جب اس کے تباہ کن اعمال کا پلڑا جھک جاتا ہے تو پھر ان کے آخری فیصلہ میں ایک ثانیہ کی کمی بیشی نہیں ہوتی (۱۶/۶۱؛ ۲۳/۴۳)۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) قوموں کی عمر دنوں، مہینوں یا برسوں کے حساب سے نہیں ماپی جاتی۔ یہ صدیوں کے حساب سے ماپی جاتی ہے۔ ان کے لئے (YARD-STICK) "ایام اللہ" ہے۔ اور "ایام اللہ" کی کیفیت یہ ہے کہ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۲۲/۴۷) خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ ایک قوم نے ظلم و استبداد کی روش اختیار کر رکھی ہے اور وہ بدستور پنپتی جا رہی ہے تو وہ دل میں کہتے ہیں کہ (اگر خدا کا قانونِ مکافات برحق ہے تو) یہ قوم تباہ کیوں نہیں ہوتی اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ (۲۶/۲۰۴) لیکن یہ صرف قانونِ اجل کی وجہ سے ہے۔ جب اس کی تباہی کا پلڑا جھک جائے گا تو مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ۝ (۲۶/۲۰۷) تو ان کا سامانِ زیست انہیں اس تباہی سے قطعاً نہیں بچا سکے گا (۲۰۸-۲۶/۲۰۹)۔ سورۂ عنکبوت میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ اے رسولؐ! یہ لوگ جلدی مچاتے ہیں اور تجھ سے کہتے ہیں کہ ان پر وہ تباہی کیوں نہیں آتی جس سے انہیں اس طرح دھمکایا جاتا ہے۔ ان سے کہو کہ وَ لَوْلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ اگر ہمارا قانونِ اجل کارفرما نہ ہوتا تو ان پر فوراً تباہی آ جاتی۔ اب یہ لوگ (بجائے اس کے کہ اس مہلت کے وقفہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر لیں) اپنی غلط روش میں آگے ہی آگے بڑھے چلے جا رہے

ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ٥ ایک دن وہ تباہی ان کے سامنے اچانک آن کھڑی ہوگی اور ان کی عقل و فکر میں بھی یہ بات نہیں آسکے گی کہ یہ آکس راستے سے گئی! اس کے بعد کہا (اور کس قدر لطیف انداز میں کہا) کہ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ۔ یہ لوگ جلدی مچاتے ہیں کہ وہ تباہی آ کیوں نہیں جاتی۔ اگر ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ٥ (۲۹/۵۴-۵۳) تباہی کا جہنم تو انہیں اس وقت بھی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن یہ اسے دیکھ نہیں پاتے۔ جسے یہ تباہی کہہ کر پکارتے ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ٥ (۷۹/۳۶) یہی جہنم جو اس وقت انہیں دکھائی نہیں دیتا اس وقت محسوس شکل میں ان کے سامنے آجاتا ہے۔

اَلسَّاعَة

جب کسی قوم پر اس قسم کے انقلاب کا وقت آجاتا ہے۔ (یعنی اس کی اجل ختم ہو کر، تباہی اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے، خواہ اس کی شکل کچھ بھی ہو) قرآنِ کریم اسے السّاعۃ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی انقلاب کی گھڑی ــــ ہمارے ہاں عام طور پر "السّاعۃ" سے مراد قیامت لی جاتی ہے (اور اس کا ترجمہ ہی قیامت کی گھڑی کیا جاتا ہے)، لیکن قرآنِ کریم میں یہ اصطلاح ظہورِ نتائج کے وقت کے لئے آئی ہے، خواہ اس دنیا میں ہو یا بعد کی زندگی میں۔ چونکہ اس وقت ہم اعمال کے صرف انہی نتائج کا ذکر کر رہے ہیں جن کا ظہور اس دنیا میں ہو جاتا ہے۔ اس لئے سرِدست الساعۃ کے بھی صرف اسی گوشے کو سامنے لایا جائے گا جس کا تعلق اس دنیا میں "انقلاب کی گھڑی" سے ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ہے يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ٥ جب السّاعۃ سامنے آن کھڑی ہوگی تو جو لوگ حق کو چھوڑ کر باطل کی روش اختیار کئے ہوئے تھے، وہ تباہ ہو جائیں گے۔ وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ تف تو اس وقت دیکھے گا کہ ہر (باطل پرست) قوم گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہوگی۔ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ ہر قوم کو اس کے اعمالنامہ کی طرف بلایا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (۴۵/۲۸-۲۷) اب تمہارے اعمال

کے بدلے کا وقت آیا ہے۔ اس سے چند آیات بعد ہے کہ الساعۃ وہ ہے جس میں وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ (۴۵/۳۳) ان کی غلط روش کے نتائج ابھر کر ان کے سامنے آجائیں گے اور جس تباہی کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے وہ انہیں ہر طرف سے گھیر لے گی۔

جب حضرت موسیٰؑ کو (سب سے پہلے وحی دیتے وقت) کہا کہ تم فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنی سرکشی میں حدود فراموش ہو چکا ہے۔ اس سے تمہارا ٹکراؤ ہوگا' تو حضرت موسیٰؑ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ فرعون کے ساتھ' جو اس قدر قوت و سطوت کا مالک ہے' میرے مقابلہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ تو اس کے جواب میں کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا. وہ انقلاب جس کے متعلق تم سے کہا جا رہا ہے' آکر رہے گا۔ وہ اس وقت عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل' ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا ہے (IN THE COURSE OF BECOMING) ہے۔ اب قانونِ مکافات کے مطابق وقت آگیا ہے کہ اسے محسوس طور پر سامنے لے آیا جائے۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ○ (۲۰/۱۵) تاکہ ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ مل جائے۔ خود حضور رسالتمآبؐ کی مکی زندگی کے بعد کہا گیا کہ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ○ (۱۵/۸۵) ان سے جو کچھ کہنا تھا کہا جا چکا ہے۔ یہ اپنی روش میں تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لئے اب تم ان سے حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جاؤ کیونکہ اس کے بعد وہ انقلاب آجائے گا جس سے انہیں متنبہ (WARN) کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد (حضورؐ کی مدنی زندگی میں) الساعۃ (انقلاب) کی آمد آمد شروع ہوگئی۔ اس سلسلہ میں جب' اپنی ابتدائی شکستوں کے بعد' مخالفین قریش نے یہ منصوبہ بنایا کہ عرب کی تمام قوتیں ایک متحدہ محاذ کی شکل میں مسلمانوں پر حملہ کر دیں' تو رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ انقلاب جس کے متعلق آپ اتنے عرصہ سے کہتے چلے آ رہے ہیں (کہ اسلام کا غلبہ ہوگا اور مخالفین کو پھر سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوگی) کب آئے گا؟ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ. ان سے کہہ دو کہ اس کا یقینی طور پر علم تو خدا ہی کو ہے وہ کب ظہور پذیر ہوگا۔ لیکن وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ○ (۳۳/۶۳) قرآن بتا رہے ہیں کہ کہ غالباً وہ وقت قریب آ رہا ہے۔ سورۃ شوریٰ میں ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِيْزَانَ ؕ یہ ضابطۂ قوانین جسے خدا نے نازل کیا ہے' مبنی بر حق و صداقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت ہے۔ ان مخالفین کی تباہی ہو کر رہے گی۔ لیکن ظہورِ نتائج کے لئے اصول تو میزان کا

ہے جب ان کی تخریبی کارروائیوں کا پلڑا جھک جائے گا تو وہ انقلاب آجائے گا۔ وَمَا یُدۡرِیۡكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیۡبٌ ○ ہو سکتا ہے کہ وہ وقت قریب ہی ہو۔ یَسۡتَعۡجِلُ بِهَا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِهَا ۚ اس لئے جلدی وہی مچاتے ہیں جنہیں اس کے آنے کا یقین نہیں۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مُشۡفِقُوۡنَ مِنۡهَا وَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهَا الۡحَقُّ ؕ (۴۲/۱۷-۱۸)۔ ان کے برعکس، جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک حقیقت ہے جو واقع ہو کر رہے گی لیکن چونکہ انہیں اس کا بھی علم ہے کہ انقلابی کشمکش میں کس قدر جگر گداز تصادمات ہوتے ہیں، اس لئے وہ اس سے خائف بھی رہتے ہیں۔

دوسری جگہ کہا کہ انتظار کرنے کے لئے تو معلوم انہیں کتنے عرصہ تک انتظار کرنا پڑے لیکن جب وہ آئے گی تو بَغۡتَةً آئے گی (۶/۳۱) یعنی اس طرح اچانک کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو کہ ان کی تباہی کا وقت آگیا ہے۔ سورۃ یوسف کی ایک آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں پہلے چھوٹے چھوٹے جھٹکے آتے رہتے ہیں تاکہ وہ ان سے عبرت پکڑیں لیکن جب وہ اپنی اصلاح نہیں کرتے تو پھر آخر میں وہ انقلاب (السّاعۃ) آجاتا ہے جس سے ان کی داستانِ حیات کا آخری ورق الٹ جاتا ہے۔ (۱۲/۱۰۷)

سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ

یہی ان قوموں کا عبرت انگیز انجام ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَکۡثَرَ مِنۡهُمۡ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ○ (۴۰/۸۲)۔

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں جو انہیں، اقوامِ سابقہ کی تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات سے نظر آجاتا کہ ان سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ وہ تعداد میں ان سے زیادہ تھے اور قوت و حشمت اور وسائل و ذرائع میں بھی ان سے کہیں آگے۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے نتائج کا وقت آیا تو یہ چیزیں ان کے کسی بھی کام نہ آسکیں۔

اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثات نہیں تھے۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ ۚ وَ

خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۴۰/۸۵). یہ تو خدا کا اٹل قانون ہے جو شروع سے اسی طرح چلا آرہا ہے.
دوسری جگہ ہے کہ

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ (۲۲/۴۶)

کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں تاکہ ان کھنڈرات کی اینٹوں پر منقوش عبرت آموز داستانوں کو دیکھ کر ان کے دیکھنے سننے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتیں. انسان کے چہرے کی آنکھیں تو طبیعی طور پر کام کرتی رہتی ہیں لیکن دل کی آنکھیں جو اندھی ہو جائیں تو ان میں بینائی پیدا کرنے کے یہی طریق ہیں.

یہ ان کے انجام کو دیکھیں اور پھر اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ چیز کسی خاص زمانے اور خاص مقام سے مختص نہیں وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷/۱۰). دنیا میں جو لوگ جس زمانے میں بھی مستقل اقدارِ خداوندی سے، انکار کریں گے، ان کا انجام ایسا ہی ہوگا.

ان آیات سے یہ حقیقت آئینہ کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ اقوام کے اعمال کے نتائج اس دنیا میں ان کے سامنے آجاتے ہیں. اس سلسلہ میں آیات تو اور بھی بے شمار ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے درج کرنے کی چنداں ضرورت نہیں. اس لئے ہمیں اب آگے بڑھ جانا چاہیئے.

دسواں باب

دُنیا اور آخرت دونوں میں عذاب

دنیاوی زندگی میں ظہورِ نتائج کے تذکرہ کے بعد، ہمیں اُخروی زندگی کی طرف آجانا چاہیئے تھا لیکن قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں دنیاوی اور اُخروی، دونوں زندگیوں میں جزائے اعمال کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) قرآنِ کریم اس دنیا کی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کے سامان ومتاع سے فائدہ اٹھانے کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب کسی دنیاوی فائدہ اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو جائے اور ان میں سے ایک ہی باقی رہ سکتا ہو، تو اس وقت دنیاوی مفاد کے مقابلہ میں مستقل قدر کے تحفظ کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اسے وہ "مفادِ آخرت" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی عاجلہ مفاد کو قربان کر کے مستقبل کے مفاد کو حاصل کر لینا۔ اس مستقبل کی زندگی (حیاتِ اُخروی) کا تفصیلی تذکرہ آئندہ ابواب میں سامنے آئے گا۔ اس جگہ آپ صرف ان ہر دو اصطلاحات کا قرآنی مفہوم سامنے رکھ کر، متعلقہ آیات کو دیکھئے۔

دنیا اور آخرت دونوں چاہنے والے

ہم اس سے پہلے ضمناً لکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کی صحیح زندگی یہ ہے کہ اسے اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور مستقل اقدار سے ہم آہنگی کی وجہ سے آخرت کی زندگی کی سربلندیاں اور مرفہ الحالیاں بھی۔ ربطِ مضمون کی خاطر، اس سلسلہ میں چند ایک

اور آیات کا سامنے لانا غیر از محل نہ ہوگا. سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ جو جماعتیں حق و صداقت کی خاطر نبرد آزما ہوتی ہیں. فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۳/۱۴۸). اللہ انہیں دنیاوی آسائشوں کا حصہ بھی دیتا ہے اور اُخروی زندگی کی نعمار کا حصہ بھی، جو اوّل الذکر سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے. حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والوں کو خدا پسند کرتا ہے. سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کی یہ دعا مذکور ہے کہ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ (۷/۱۵۶) ہمارے لئے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی لکھ دے اور آخرت کی خوشگواریاں بھی. سورۂ ابراہیم میں ہے. يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ (۱۴/۲۷) جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، خدا انہیں، اپنے محکم قانونِ حیات کی رُو سے، اس دنیا کی زندگی میں بھی ثبات و استحکام عطا کرتا ہے اور اخروی زندگی میں بھی.

سورۂ نحل میں ہے کہ مخالفین جماعتِ مومنین سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے خدا نے جو ضابطۂ حیات تمہیں عطا کیا ہے اس کے اتباع سے تمہیں ملے گا کیا؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ (۱۶/۳۰) اس کے اتباع سے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں گی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی. ذرا آگے چل کر، مہاجرین کے متعلق کہا کہ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ (۱۶/۴۱) انہیں اس دنیا میں بھی بڑا عمدہ ٹھکانہ ملے گا اور آخرت کے اجر کا تو پوچھنا ہی کیا. وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا.

خدا نے جماعتِ مومنین کو "اولیاء اللہ[1]" کہہ کر پکارا ہے. ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ. ان کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی خوشگواریوں کی نویدِ جانفزا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی. اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی ہنگامی بات نہیں کہ کبھی ایسا ہوگیا اور کبھی نہ ہوا. یہ خدا کا قانون ہے. لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (۱۰/۶۴) اس کے قانون میں کوئی تبدیلی

---

[1] واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "اولیاء اللہ" کا کوئی الگ گروہ نہیں. جماعتِ مومنین جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے، اولیاء اللہ کہلاتی ہے.

نہیں کرسکتا۔ ان کی زندگی اس قسم کی ہوگی کہ وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۞ (۴۱/۳۱-۳۲) وہ جو کچھ چاہیں گے ہوگا، جو کچھ مانگیں گے ملے گا۔ یہ" دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی نصرت سے بہرہ یاب ہوں گے" (۲۲/۱۵)۔ حضرات انبیائے کرامؑ تو جماعتِ مسلمین کے سرخیل ہوتے تھے اس لئے ان کی بھی اس دنیا کی زندگی سرفرازیوں کی زندگی ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا کہ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ (۲/۱۳۰) ان کی اس دنیا کی زندگی بھی برگزیدگی کی زندگی تھی اور آخرت میں بھی ان کا شمار صالحین کے زمرے میں ہوگا۔ یہ" دنیا میں برگزیدگی" کی زندگی کیا تھی؟ اس کی تفسیر میں کہا کہ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۞ (۴/۵۴) آلِ ابراہیمؑ کو ضابطۂ حیات دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ عظیم مملکت بھی۔ اسی کو فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۶/۱۲۲)۔ یہ اس دنیا میں ان کے اعمال کا اجر تھا (۲۹/۲۷)۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ، جن کے متعلق اناجیل کا بیان ہے کہ انہوں نے (معاذاللہ، معاذاللہ) دنیا میں بڑی بےکسی و بےبسی اور" ذلّت و خواری" کی زندگی بسر کی ـــ ان کے متبعین بڑے فخر سے ایسا کہتے ہیں اور دنیا کے سامنے ان کی ایسی تصاویر پیش کرتے ہیں جن میں دکھایا جاتا ہے کہ ان کی ساری زندگی بےنوا فقیروں کی سی گذری اور عمر کے آخری لمحات میں یہودیوں اور رومی سپاہیوں نے ان سے سخت ہتک آمیز سلوک کیا ـــ قرآنِ کریم ان کے متعلق بھی کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (۳/۴۴) انہوں نے اس دنیا میں بھی نہایت باعزّت زندگی بسر کی اور آخرت میں بھی وہ ایسے ہوں گے۔

متاعِ حیات (دنیاوی آسائشوں اور آرائشوں) سے بہرہ یاب ہونا تو اس کے نزدیک اتنا ضروری ہے کہ وہ ان سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں سے، جو دولت سمیٹنے کی ہوس میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ (اور تو اور) خود اپنی ذات پر بھی چار پیسے خرچ نہیں کرتے، حسرت آمیز انداز میں کہتا ہے کہ بدنصیبو! تم نے اپنی آخرت تو تباہ کر ہی لی تھی، کم از کم دنیاوی زندگی ہی آرام سے گذار لی ہوتی! (۲۸/۷۷)۔

(۰)

صرف دُنیا طلبی

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ لوگ آتے ہیں جن کا منتہائے زندگی صرف دنیا طلبی ہوتا ہے۔

اور وہ اسکی ہوس میں مستقل اقدارِ خداوندی کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں ان کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ (۲/۸۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حیاتِ اُخروی کے بدلے دنیاوی زندگی خرید لی ہے۔ (نیز ۴/۷۴)۔ کہیں کہا کہ یہ لوگ حیاتِ اخروی کے مقابلہ میں دنیاوی زندگی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں (۱۴/۳؛ ۱۶/۱۰۷؛ ۳۸/۷۹؛ ۱۶ ۱۷/۸۷) اور سورۂ کہف میں کہا کہ ان کی ساری سعی و کاوش دنیاوی مفاد کے حصول میں ضائع ہو جاتی ہے (۱۸/۱۰۳) اس لئے کہ انہیں دنیاوی زندگی بڑی خوشنما بن کر دکھائی دیتی ہے (۲/۲۱۲)۔ یہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں (۱۰/۷)۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) انہیں ان کی سعی و کاوش کے بدلہ میں دنیاوی سامانِ زیست حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ـــــ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ (۲/۱۰۳)؛ (۳/۷۶)۔ سورۂ ہود میں ہے۔

> مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا وَ زِیۡنَتَہَا نُوَفِّ اِلَیۡہِمۡ اَعۡمَالَہُمۡ فِیۡہَا وَ ہُمۡ فِیۡہَا لَا یُبۡخَسُوۡنَ ○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَیۡسَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ ۫ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِیۡہَا وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○ (۱۵-۱۱/۱۶)؛ (نیز ۴۲/۲۰)۔
>
> جو شخص اس دنیا کا ساز و سامان اور آرائش و زیبائش چاہتا ہے اور اس کے لئے کام کرتا ہے تو اسے اس کے کام کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جاتی۔ لیکن ان لوگوں کا مستقبل کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہاں کا سب کیا کرایا وہاں رائگاں چلا جاتا ہے۔

سورۂ احقاف میں کہا گیا کہ یہ لوگ اُخروی زندگی میں کہیں گے کہ ہمیں اس سے کچھ حصہ کیوں نہیں دیا جاتا تو اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ تم نے اپنی سعی و کاوش کا مقصود دنیاوی مفادات کو قرار دیا تھا۔ وہ تمہیں مل گئے اور اس طرح تمہاری محنتوں کا ماحصل وہیں ختم ہو گیا۔ اب اس میں سے کچھ باقی ہی نہیں رہا تو تمہیں ملے کیا؟ تم نے تو اپنا سارے کا سارا حصہ وہیں ختم کر لیا تھا۔ اب کیا مانگتے ہو؟ (۴۶/۲۰؛ ۵۳/۲۹)۔ دنیاوی مفادات کے دروازے مومن و کافر سب کے لئے کھلے تھے۔ وہاں دونوں گروہوں کو، ان کی سعی و کاوش کے تناسب سے حصہ مل گیا۔ اُخروی زندگی کے لئے یہ انہی کے لئے مخصوص

ہیں جنہوں نے وہاں، دنیاوی مفادات کے ساتھ ساتھ اُخروی زندگی کے مفاد کا بھی خیال رکھا تھا (۷/۳۲، ۱۸/۴۶)۔ تم سے وہاں کہا جاتا تھا کہ تم صرف مفادِ عاجلہ ہی کیوں مانگتے ہو، خدا کے ہاں سے مفادِ عاجلہ اور حیاتِ مستقبل کے مفادات دونوں مل سکتے ہیں۔ تم ان دونوں کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں بڑی وضاحت سے بتایا جاتا تھا کہ دنیاوی زیبائش و آرائش اور ساز و براق بڑے جاذب ہیں، تم انہیں ضرور حاصل کرو، لیکن اس حقیقت کو نہ بھولو کہ مستقبل کی زندگی اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہے اس لئے اس کے ساتھ اسے بھی طلب کرو (۳/۱۴)۔ متاعِ حیات کے حصول کے ساتھ آخرت طلبی سے مراد یہ ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی دنیاوی مفاد اور مستقل قدر میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو اس وقت تم دنیاوی متاع کو یہ کہہ کر چھوڑ دو کہ، یہ حیاتِ اُخروی کے مقابلہ میں کوئی شے ہی نہیں۔ اس وقت تم یہ کہہ دو کہ

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ۭ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹/۶۴؛ ۴۷/۳۹)

اس دنیا کا ساز و سامان، بایں ہمہ کشش و جاذبیت، کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ زندگی کہلانے کی مستحق تو اخروی زندگی ہی ہے۔ وہ کونسا سمجھ دار آدمی ہے جو زندگی کو بیچ کر کھیل تماشے کا ٹکٹ خریدے گا؟[1]

ان دونوں کے تقابل میں متاعِ حیات کی مثال برسات کی روئیدگی کی سی ہے جو چند دنوں تک لہلہانے کے بعد، پژمردہ ہو کر خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتی ہیں (۱۰/۲۴؛ ۵۷/۲۰)۔ اسی تقابل کو سامنے لانے کے لئے کہا کہ جنگِ احد میں ایک طرف مالِ غنیمت نگاہوں میں چکا چوند پیدا کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنے فرض کا تقاضا تھا کہ اپنا مقام نہ چھوڑا جائے۔ وہ "متاعِ دنیا" تھی یہ "متاعِ آخرت"۔ سو تم میں سے بعض پر مالِ غنیمت کی کشش غالب آ گئی اور انہوں نے اپنی ڈیوٹی کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی پوزیشن چھوڑ دی (۳/۱۵۱)۔ ایسے تصادمات کے وقت ترجیح متاعِ آخرت کو دینی چاہیئے۔ ورنہ عام حالات میں دنیاوی مفاد کے حصول کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے سعی و کاوش کرنا مومنین کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ (۶۲/۱۰)

---

[1] اسی سلسلہ میں ان آیات کو بھی دیکھیے (۴/۷۷؛ ۶/۳۲؛ ۷/۱۶۹؛ ۹/۳۸؛ ۱۰/۷۰؛ ۱۳/۲۶؛ ۲۰/۱۳۱؛ ۲۸/۶۰؛ ۳۰/۷؛ ۴۲/۳۶)۔

دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب

اب ہمارے سامنے تیسرا گروہ آتا ہے جس کے متعلق کہا کہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب ملتا ہے۔ ان میں ایک گروہ تو ان کا ہوتا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اس لئے دنیا میں مفلسی اور محتاجی، ناداری اور لاچاری، بےکسی و بےبسی، محکومی و غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ گروہ بالعموم مذہب پرست لوگوں کا ہوتا ہے جنہیں اس فریب میں مبتلا رکھا جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی جاذبیتیں قابلِ نفرت ہیں۔ ان سے دور رہنا اللہ والوں کا شیوہ ہے۔ یہ دنیا کفار کے لئے ہے۔ خدا پرستوں کے حصے میں اگلی دنیا آتی ہے۔ دوسرا گروہ ان قوموں پر مشتمل ہوتا ہے جو عروج کے بعد قعرِ مذلت میں گر جاتی ہیں اور اس طرح محتاجی و محکومی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ دونوں گروہ اس دنیا میں عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کی اس دنیا کی زندگی عذاب کی ہو (اور وہ اسے دور کرنے کی کوشش نہ کریں) ان کی اُخروی زندگی بھی عذاب کی ہوتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (۲۰/۱۲۴)۔

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے تو ہم اس کی روزی تنگ کر دیتے ہیں۔ (وہ اس دنیا میں بھی عذاب کی زندگی بسر کرتا ہے اور) قیامت میں بھی اسے اندھا اٹھائیں گے۔

دوسری جگہ ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا○ (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ بلکہ وہاں اس کی حالت یہاں سے بھی زیادہ گئی گذری ہوگی۔ اس لئے کہ عاقبت تو سنورتی ہی اس کی ہے جس نے کائنات کو سنوارنے میں کچھ حصہ لیا ہو۔ جو اپنی اس زندگی کو سنوار نہیں سکا اس کی اخروی زندگی کس طرح سنوری ہوئی ہوگی۔

اس دنیا میں "خدا کا عذاب" کن شکلوں میں آتا ہے اس کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآن کریم نے اسے دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جہاں کہا کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) ان لوگوں پر "خوف اور بھوک" کا عذاب طاری ہو جاتا ہے ــــ خوف اور بھوک کا عذاب! آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے ان دو بنیادی لفظوں میں عذاب کی ساری تفصیلات کو کس طرح سمٹا کر

رکھ دیا ہے۔ یہ ہے اس دنیا کا عذاب۔ اُخروی عذاب کی نوعیت کیسی ہوگی اسے اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ اس مقام پر صرف اتنا دیکھئے کہ جو لوگ اس دنیا میں عذاب میں مبتلا ہوں گے ان کی آخرت کی زندگی بھی عذاب کی ہوگی اور یہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے عین مطابق ہوگا۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ غلط روش اختیار کریں گے ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ○ (۲/۸۵) دنیا میں ذلت و رسوائی ان کے حصہ میں آئے گی اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ (نیز ۲/۱۱۴؛ ۵/۴۱؛ ۲۲/۹؛ ۳۹/۲۶)۔
سورۂ قلم میں غلط معاشی نظام کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتانے کے بعد کہا کہ یہ تو اس دنیا کا عذاب تھا۔ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (۶۸/۳۳[1]) اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہوگا۔ سورۂ مائدہ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کے باغیوں کو اس دنیا میں بھی ان کے جرم کی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی (۵/۳۳)۔ (نیز دیکھئے ۲۴/۱۹؛ ۲۴/۲۳)۔

حق و باطل کی کشمکش میں، حق کے مخالفین کو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں جو شکست ہوتی ہے اسے بھی "عذابِ دنیا" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان کے لئے اخروی عذاب کی بھی تصریح آئی ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں، اسلام کے مخالفین، کفار اور منافقین عرب کے خلاف جنگ کرنے کے احکام کے سلسلہ میں کہا گیا کہ اگر یہ لوگ اپنی مخاصمانہ روش سے باز آجائیں تو ان کے لئے اچھا ہوگا۔ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ○ (۹/۷۴) لیکن اگر یہ اس سے روگردانی کریں تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت میں الم انگیز عذاب دیگا اور پھر دنیا میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا۔ انہی کے متعلق آگے چل کر کہا ہے کہ انہیں دو مرتبہ عذاب دیا جائے گا اور پھر انہیں عذابِ عظیم کی طرف لوٹایا جائے گا (۹/۱۰۱)۔ سورۂ رعد میں ہے کہ ان کی تمام تدابیر ناکام ہوکر رہ جائیں گی (اور) "انہیں دنیاوی زندگی میں بھی عذاب ملے گا اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ شدید ہوگا" (۱۳/۳۴)۔ سورۂ کہف میں ہے کہ ذوالقرنین نے قوم مخالف سے کہا کہ اگر وہ ظلم و استبداد سے باز نہیں آئے گی تو ہم اسے سزا دیں گے اور اس کے بعد وہ خدا کی طرف جائیں گے تو

---

[1] دنیا اور آخرت میں دونوں میں سزا کے سلسلہ میں یہ آیات بھی دیکھئے (۳/۵۶؛ ۹/۷۴؛ ۱۳/۳۴؛ ۳۳/۵۷)۔

انہیں عبرت انگیز سزا ملے گی (۱۸/۸۷). سورۂ احزاب میں ہے کہ جو لوگ رسول اللہ (اور جماعت مومنین) کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں محرومی کی زندگی ہے (۳۳/۵۷). مخالفین عرب کے متعلق کہا گیا کہ ان سے پہلے بھی مختلف اقوام نے انبیائے کرامؑ کی دعوت کی تکذیب کی تھی. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹/۲۶) اللہ نے ان پر دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری کا عذاب وارد کر دیا اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں بڑا ہوگا. اے کاش! یہ مخاطبین اس سے سبق سیکھتے. جب مدینہ کے یہودیوں (بنی نضیر) نے عہد شکنی کی، تو ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں جلا وطن کر دیا جائے. اس سلسلہ میں کہا کہ اگر ان کے لئے جلا وطنی کا فیصلہ نہ کیا جاتا تو لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۖ وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۵۹/۳) انہیں اس دنیا میں سخت سزا ملتی اور آخرت میں ان کے لئے جہنم کا عذاب ہوتا. ظاہر ہے کہ یہاں "دنیاوی سزا" سے مراد جنگ میں ہزیمت خوردگی ہے. دوسرے مقام پر بہ ہیئتِ مجموعی اصولی طور پر کہہ دیا کہ جو لوگ حق و صداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَ هُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ (۲۷/۵) تو یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا میں بدترین عذاب ملے گا اور آخرت میں یہ سخت نقصان اٹھائیں گے. سورۂ سجدہ میں ہے وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۳۲/۲۱) انہیں، سب سے بڑے عذاب سے پہلے قریبی عذاب ملے گا. شاید یہ اس طرح صحیح روش کی طرف آجائیں. اس "قریبی عذاب" سے یا تو یہ مراد ہے کہ قوموں کی آخری تباہی سے پہلے، ان کی بربادی کے ہلکے ہلکے آثار سامنے آتے ہیں تاکہ وہ ان سے عبرت حاصل کر کے سنبھل جائیں یا پھر "عذابِ اکبر" سے مراد اُخروی زندگی کا عذاب ہے. اسی کو دوسرے مقام پر "عذاب فوق عذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۶/۸۸).

وہ لوگ جنہیں اس دنیا میں بھی اپنے اعمال کی سزا مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی سزا ملے گی، وہ ہیں جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ز (۳/۲۱) یہ وہ ہیں کہ جن کے اعمال اس دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں، رائگاں گئے. یہ لوگ اس دنیا میں جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کی زندگی. ان کے برعکس، جو لوگ صحیح روش اختیار کرتے ہیں ان کی اس دنیا کی زندگی بھی جنت کی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی جنت کی. اس حقیقت

کو سورۂ فتح کی رو آیات میں نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سورہ میں مخالفین قریش کے ساتھ آخری تصادمات کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ۙ (۴۸/۵) تاکہ خدا مومن مردوں اور عورتوں کو سدابہار جنت کی زندگی عطا کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہ جنت کی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۖ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ (۴۸/۶) اور تاکہ خدا، منافق مردوں اور عورتوں کو، جو خدا کے متعلق عجیب عجیب بدگمانیوں کا شکار ہیں، عذاب دے۔ اب یہ لوگ اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں کے چکر میں پھنسیں گے یہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں گے۔ ان کی مخالفانہ جدوجہد کی کھیتیاں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گی اور تباہیوں اور بربادیوں کا جہنم ان کے لئے تیار ہوگا۔ ان کا ٹھکانہ بہت بُرا ہوگا۔

يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی بعض آیات میں ہے کہ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ (۴۸/۱۵) (نیز ۲/۲۸۴؛ ۳/۱۲۸)۔ ان (اور اس قسم کی دیگر آیات) کا ترجمہ (عام طور پر) یہ کیا جاتا ہے کہ "خدا جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے"۔ یعنی اس کے ہاں جزا اور سزا، عذاب و مغفرت، کے لئے کوئی قاعدہ، قانون یا اصول و معیار مقرر نہیں۔ یہ سب اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ جسے چاہا عذاب میں پکڑ لیا، جسے چاہا چھوڑ دیا۔

اس سوال کا تعلق نظریۂ تقدیر سے ہے جو اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے[1] لیکن اتنا تو واضح ہے کہ ان آیات کا یہ مفہوم قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی ساری

---

[1] مسئلۂ تقدیر کے متعلق میں شرح و بسط سے اپنی دیگر تصانیف میں لکھ چکا ہوں۔ بالخصوص اس خطاب میں جس کا عنوان ہے "خدا کی مرضی"۔ اور اب "کتاب التقدیر" تو اس موضوع پر خود کفیل تصنیف ہے۔

تعلیم، قانونِ مکافاتِ عمل کے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ لہٰذا "مَنْ يَّشَآءُ" کے یہ معنی ہو نہیں سکتے کہ عذاب و مغفرت محض خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ ان آیات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خدا نے عذاب و مغفرت (تباہی سے حفاظت) کے لئے اصول و قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ سو جس کا جی چاہے ان سے انحراف کر کے اپنے لئے تباہی خرید لے اور جو چاہے ان کی نگہداشت سے سامانِ حفاظت حاصل کر لے۔ لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ ان آیات میں "مَنْ يَّشَآءُ" کا فاعل خدا ہی ہے تو اس صورت میں بھی ان آیات کا مفہوم یہ ہو گا کہ عذاب و مغفرت کا تعلق خدا کے "قانونِ مشیت" سے ہے اور اس کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

خود قرآنِ کریم کی بعض آیات میں بھی اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ قانونِ مشیت درحقیقت قانونِ مکافات ہی کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چاہیتی اولاد ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ ان سے پوچھو کہ اگر تم خدا کی ایسی چاہیتی اولاد ہو تو فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (۵/۱۸) تو وہ تمہیں تمہارے جرائم کے بدلے میں سزا کیوں دیتا ہے؟ اور اس کے بعد ہے۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (۵/۱۸)۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا مطلب یہی ہو کہ وہ جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے، تو پہلے جو کہا گیا ہے کہ "يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (تمہیں تمہارے جرائم کی وجہ سے سزا ملتی ہے) تو دونوں آیات ایک دوسرے کی مخالف ہو جائینگی۔ لہٰذا اس آیت کا یہ مفہوم درست نہیں۔

اور اس باب میں سورۂ نساء کی وہ آیت تو گویا قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ (۴/۱۴۷) اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آؤ اور سپاس گذار ہو، تو خدا نے تمہیں عذاب دے کر کیا لینا ہے! سزا تو تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۰)

اس وقت تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی ہے کہ

(۱) افراد یا اقوام کی حالت، ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنی حالت نہیں بدلتی خدا اس کی حالت کو نہیں بدلتا (۸/۵۳؛ ۱۳/۱۱)۔

(۲) انسانی اعمال کا ظہورِ نتائج، اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی۔ جنّت اور جہنّم کی زندگی یہیں سے شروع ہوجاتی ہے اور مرنے کے بعد تک ساتھ جاتی ہے۔

دنیاوی زندگی میں ظہورِ نتائج کی ماجریات ہمارے سامنے آچکیں۔ اب ہم اُخروی زندگی کی طرف بڑھتے ہیں۔

گیارہواں باب

ثواب ـــــ نجات

ہمارے ہاں عام طور پر، عذاب کے مقابلہ میں ثواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ عذاب سے مراد لی جاتی ہے گناہوں کی سزا اور ثواب سے، نیکیوں کی جزا۔

لفظ ثواب کا مادہ (ث۔ و۔ ب) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا واپس مل جانا۔ ثاب الماءُ کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر پانی نکلا تھا اتنا ہی اور آ گیا۔ ثاب جسمهٗ کے معنی ہیں بیماری کے بعد اس کا جسم پھر سے اصلی حالت پر آ گیا۔ یعنی جس قدر توانائی زائل ہوئی تھی وہ واپس آ گئی۔

آپ جو کام بھی کرتے ہیں اس میں آپ کا کچھ صرف ہوتا ہے۔ روپیہ پیسہ نہ بھی صرف ہو، تو بھی آپ کا وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے۔ اگر وہ کام قاعدے کے مطابق کیا گیا ہے تو جس قدر آپ کا صرف ہوا ہے، وہ واپس مل جائے گا۔ اسے آپ کے عمل کا ثواب کہا جائے گا۔ اسے کاروباری زبان میں (RETURN) کہیں گے اور قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، اس کا مطلب، انسان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اس لئے یہ لفظ، قرآنِ کریم میں "عمل کے بدلے" کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ مثلاً هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ٥ (۸۳/۳۶) کفار کو وہی کچھ ملے گا جو انہوں نے کیا ہوگا۔ (نیز ۳/۱۵۲)۔ ان معانی میں بعض مقامات پر مَثُوْبَةٌ کا لفظ بھی آیا ہے (۵/۶۰ ؛ ۲/۱۰۳)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں حسنِ عمل کا نتیجہ، دنیاوی زندگی کی خوشحالی اور خوش بختی، سرفرازی و سربلندی

دولت وثروت، حکومت واقتدار کی شکل میں سامنے آتا ہے اور ان اعمال کا جو اثر انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے اس کا نتیجہ اُخروی زندگی میں نمودار ہوتا ہے. اس اعتبار سے قرآن کریم میں "ثواب الدنیا" اور "ثواب الآخرت" کی اصطلاحات آئی ہیں. لہٰذا، ہم نے اگر دیکھنا ہو کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ کارِ ثواب (ثواب کا کام) ہے یا نہیں تو اس کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان اعمال کا درخشندہ نتیجہ اس زندگی میں مرتب ہو رہا ہے یا نہیں. یعنی ثواب کسی ذہنی تصور یا نظری عقیدہ کا نام نہیں جو محسوس طور پر سامنے نہ آسکے. یہ دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں کا نام ہے اور اس کے بعد اخروی زندگی کی سرفرازیوں کا. سورۂ آلِ عمران میں ہے.

وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ (۳/۱۴۴)

جو دنیاوی زندگی کا ثواب چاہتا ہے اسے وہ مل جاتا ہے. جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے اسے وہ دے دیا جاتا ہے.

اس کے یہ معنی نہیں کہ جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے اسے دنیاوی زندگی میں ثواب نہیں ملتا. آخرت کا ثواب چاہنے والے کو اس دنیا کا ثواب بھی ملتا ہے اور آخرت کا بھی.

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ (۴/۱۳۴)

جو دنیا کا ثواب چاہتا ہے (اس سے کہہ دو کہ) خدا کے ہاں دنیا کا ثواب بھی ہے اور آخرت کا بھی.

یعنی جو لوگ، قوانینِ طبعی کے مطابق محنت کرتے ہیں، لیکن مستقل اقدارِ خداوندی کی پرواہ نہیں کرتے، انہیں دنیاوی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اُخروی زندگی میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہوتا. لیکن جو قوانینِ طبعی اور مستقل اقدار دونوں کی نگہداشت کرتے ہیں، انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں ثواب ملتا ہے اور یہی مومنین کا شعار ہے. اس قسم کے (دنیا اور آخرت کے) ثواب کو "باقیات الصالحات" کہہ کر پکارا گیا ہے جو ثواب کی بہترین شکل ہے (۱۸/۴۶؛ ۱۹/۷۶). اسی لئے کہا کہ "جو ثواب اللہ کے ہاں سے ملے" وہ بہترین ہوتا ہے (۲۸/۸۰). ثواب تو ہر طرح کا "اللہ ہی کے ہاں سے" ملتا ہے — یعنی اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کام کے نتائج — لیکن قرآنی مفہوم کے مطابق اللہ کے ہاں سے بہترین ثواب ملنے سے مراد ہے، ایسا ثواب جس سے انسان کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی. اس لئے کہا کہ "خدا بہترین ثواب

دینے والا اور بہترین انجام مرتب کرنے والا ہے" (۱۸/۴۴)۔ اس قسم کا ثواب، ہجرت، جہاد اور نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے، مصائب و مشکلات برداشت کرنے سے ملتا ہے (۳/۱۹۴)۔ یعنی حق و باطل کی کشمکش میں اگر جنگ کی نوبت آجائے تو اس میں ثابت قدم رہنے سے (۱۴۶ ۔ ۳/۱۴۷)۔ اس سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہوتا ہے اور آخرت میں دارالخلد بھی۔ اسی لئے (سورۂ کہف میں) جنت کی نعماء ۔۔۔ سرفرازیوں کی علامات (سونے کے کنگن)، حریر و اطلس کے ملبوسات، تختِ حکومت وغیرہ کے تذکرہ کے بعد کہا نِعۡمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ۝ (۱۸/۳۱)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو کچھ آپ کو اس دنیا میں ملے (ثَوَابَ الدُّنۡیَا) اس میں سے تو آپ اس دنیا میں کسی اور کو بھی کچھ دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے حسنِ عمل کا جو نتیجہ آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہے (ثواب الآخرت) اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، یہ جو ہمارے ہاں "ایصالِ ثواب" کا عقیدہ (یا رسم) ہے ۔۔۔ یعنی کچھ پڑھ کر یا نذر نیاز دے کر اس کا ثواب مردے کو پہنچانے کا عقیدہ ۔۔۔ تو یہ تصور، قرآن کے خلاف ہے۔ مرنے والا جس حالت میں اپنی ذات کو لے کر یہاں سے گیا ہے، اس میں کوئی دوسرا کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا ۔۔۔ نہ اس دنیا میں، نہ مرنے کے بعد، مرنے والے کو جو کچھ ملے گا اس کے اپنے اعمال کے نتیجہ میں ملے گا۔ یہاں والے اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ حتّیٰ کہ اس کے لئے دعائے خیر بھی صرف ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے (جو ہر مومن کے دل میں، دوسرے مومن کے لئے ہونی چاہئیں)۔ اس سے دعا کرنے والوں کو تو ایک نفسیاتی فائدہ (ثواب) ہو جاتا ہے لیکن مردے تک یہ ثواب نہیں پہنچتا۔ البتہ اگر زندہ انسان کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کیا جائے، تو اس سے اسے ایک قسم کی نفسیاتی تقویت مل جاتی ہے۔ مردے کی صورت میں اس کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ، جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، مُردوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔

(۰)

ثواب کے ساتھ ہی دوسرا تصور ہمارے سامنے نجات کا آتا ہے۔ آپ کسی اہلِ مذہب سے

پوچھئے کہ وہ مذہبی احکام کی پابندی کیوں کرتا ہے۔ وہ اس قدر مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے۔ اتنی صعوبات برداشت کیوں کرتا ہے۔ اس قدر پُرمحن ریاضتوں میں اپنی جان کیوں گھلاتا ہے۔ ان سب کا ایک ہی جواب ہوگا اور وہ یہ کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ اس کی کسی طرح نجات ہو جائے۔ نجات، مکتی (SALVATION) نروان، سب ایک ہی تصور کے مختلف نام ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک یا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا اس کا مقصودِ زندگی ہے اسی کے لئے وہ اس قدر (مذہبی) مشقتیں اٹھاتا ہے۔ اس ضمن میں:-

(۱) عیسائیت کا تصور یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اوّلیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دنیا میں آتا ہے۔ اس کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ کسی طرح اس گناہ کی آلائش سے نجات حاصل کرلے۔ اس کا ذریعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔

(۲) ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے جنم لیتا ہے۔ ان گناہوں کے بوجھ سے مکتی حاصل کرنا مقصدِ زندگی ہے اور یہ مذہب کی تجویز کردہ مشقتوں ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

(۳) بدھ مت (اور اس کے ساتھ جین مت) والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے آتا ہے۔ جب تک وہ اس قدر ترکِ آرزو نہیں کرتا کہ آرزو کا خیال تک بھی اس کے دل میں نہ آئے اس وقت تک اسے نروان (مکمل سکون) حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ نروان فنائے خویش سے حاصل ہوگا۔ مذہبی صعوبات سے یہی مقصود ہے۔

(۴) ویدانت (ہندو فلسفہ یا تصوّف) کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کی روح (آتما) خدا کی روح (پرماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ روح، اپنی اصل سے جدا ہو کر، مادی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اس دلدل سے چھٹکارا حاصل کر کے اس جزو کا اپنی اصل سے مل جانا' مقصودِ حیات ہے اور یہ دھرم کی جانکاہ مشقتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی تصور ہمارے تصوّف نے ویدانت سے مستعار لیا اور انسانی روح کے "واصل بالحق" ہو جانے (حق کے ساتھ مل جانے) کو حاصلِ مراد قرار دیا' جو تصوّف کی پُراز صعوبات ریاضتوں کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ ہے مذاہبِ عالم کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود۔ یعنی انسان دنیا میں آکر جس مصیبت میں پھنس

گیا ہے' اس سے چھٹکارا حاصل کرنا. ہمارے اہلِ طریقت (اربابِ تصوّف) تو بعینہٖ یہی عقیدہ رکھتے ہیں. لیکن اہلِ شریعت یہ کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں آکر جو گناہ کرتا ہے اس سے اس کا دامن آلودہ ہو جاتا ہے. اس کے لئے اسے جہنّم کی سزا بھگتنی پڑے گی. اس سزا سے نجات حاصل کرنا مذہب کا مقصود ہے.

آپ نے دیکھا کہ نجات کے ان تمام تصوّرات میں کس طرح وہ بنیادی مفروضہ مشترک ہے کہ انسان کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے. اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا مذہب کا ماحصل ہے.

قرآنِ کریم نے مذہب کے اس بنیادی مفروضہ ہی کو ختم کر دیا. اس نے کہا کہ ہر انسانی بچّہ ایک سفید لوح (CLEAN SLATE) لے کر دنیا میں آتا ہے. اسے قدرت کی طرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ہیں. اگر وہ ان صلاحیتوں کی مناسب نشو ونما کر لیتا ہے تو اس کی اس دنیا کی زندگی بھی خوشحالیوں اور سرفرازیوں کی زندگی ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد وہ زندگی کی موجودہ سطح سے بلند سطح کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے. جو ایسا نہیں کرتا اس کی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا. ان صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے کہ انسان فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کرکے' ان کے ماحصل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرے.

اس سے آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصد کچھ حاصل کرکے' موجودہ زندگی کو زیادہ حسین بنانا اور بلند سطح پر لے جانا ہے. کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں. اس میں "نجات" سے مراد' زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہ کر' اگلی منزل تک پہنچنا ہے. نہ کہ کسی ایسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا جس میں انسان پہلے سے گرفتار ہو. یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانی تگ وتاز کا مقصد "فوز" (ACHIEVEMENT) بتایا ہے. نجات (SALVATION) نہیں قرار دیا. تفصیل اس اجمال کی آپ کو آئندہ ابواب میں ملے گی.

بارھواں باب

آخرت کا تصوّر

جیسا کہ آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھا ہے، دینؔ کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین کا فطری اور لازمی نتیجہ ایمان بالآخرت ہے۔ اس سلسلہ میں لفظِ آخرتؔ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔

اٰخِرُ (جس کا مؤنث اٰخِرَۃٌ ہے) ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کسی سلسلہ کی آخری کڑی ہو اور اس کے بعد جو کڑی آئے وہ پہلی کڑیوں جیسی نہ ہو۔ لہٰذا، آخرت، کسی ایک سلسلہ کے اختتام اور اس سے متصل دوسرے سلسلہ کے آغاز کا نام ہوگا۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ دوسرا سلسلہ پہلے سلسلہ سے مختلف ہو۔ اسی جہت سے لفظ اٰخَرُ (خار کے زبر کے ساتھ) ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو دیگر اشیاء سے مختلف ہو۔

(۲) تاخّر، تقدّم کی بھی ضد ہے۔ تقدّم کے معنی ہوتے ہیں پہلے واقع ہونا۔ لہٰذا، تاخّر کے معنی ہوں گے، بعد میں واقع ہونا۔ اسی لحاظ سے قرآنِ کریم میں مستقدمین کے مقابلہ میں مستاخرین آیا ہے (۱۵/۲۴)۔ مستقدمین، جو پہلے جا چکے ہوں اور مستاخرین، جو لوگ ان کے بعد آئیں ـــ مستقبل میں آنے والی نسلیں۔

(۳) نیز قرآنِ کریم میں اٰخِرَ، عاجلہ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے۔ عاجلہ کے معنی ہیں پیش پا افتادہ مفاد۔ اور اٰخِرَ کے معنی ہوں گے مستقبل کے مفادات (۱۸ ـــ ۱۹/۱۷)؛ (۲۷/۷۶)۔

(۴) دنیا کے مقابلہ میں آخرت، قرآنِ کریم میں عام طور پر آیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے

۱۔ ایک فرد کی زندگی میں، امروز کے مقابلہ میں فردا، اس کا مستقبل (یعنی آخرت) ہے۔

۲۔ ایک قوم کی زندگی میں، اس کی موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسلیں آخرت میں داخل ہیں۔

۳۔ نوعِ انسانی کے لئے آنے والی انسانیّت، آخرت ہے ــــ اور

۴۔ ان سب کے لئے، مرنے کے بعد، دوسری زندگی حیاتِ آخرت ہے۔

لہٰذا، جب جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں؛

(۱) جو مفادِ عاجلہ کے مقابلہ میں مستقبل کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۲) ان میں ہر فرد اپنے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔

(۳) من حیث القوم، یہ اپنے مفادات ہی کا تحفظ نہیں کرتے بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کے مفاد کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

(۴) ان کے پیشِ نظر مفادِ خویش ہی نہیں ہوتا، یہ پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ چاہتے ہیں ــــ اور

(۵) ان کے سامنے صرف اسی دنیا کی زندگی کا مفاد نہیں۔ یہ مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے قانونِ مکافاتِ عمل پر ان کا یقین محکم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسانی اعمال کے نتائج کا ظہور اسی دنیا تک محدود نہیں۔ اس کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔

بنا بریں، جب قرآنِ کریم میں آخرت کا ذکر آئے گا تو اس سے مراد صرف مرنے کے بعد کی زندگی نہیں ہوگی۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس موقع پر، مذکورہ صدر مفاہیم میں سے کونسا مفہوم مقصود ہے۔

(۶) اسی طرح، جہاں قرآنِ کریم نے "حیات بعد الممات" کا ذکر کیا ہے، وہاں اس سے مراد، ایک فرد کی مرنے کے بعد کی زندگی ہی نہیں۔ وہ قوموں کے زوال کو ان کی موت سے تعبیر کرتا ہے اور جو قومیں زوال کے بعد پھر عروج حاصل کر لیتی ہیں، وہ اسے حیات بعد الممات کہہ کر پکارتا ہے۔ نیز، اس نے ان افراد کو بھی "مردہ" کہا ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

(۷) اسی سلسلہ میں قرآنِ کریم میں چند ایک اور اصطلاحات بھی آتی ہیں. مثلاً قیامت، بعث، حشر وغیرہ. ان کا تعلق بھی صرف مرنے کے بعد کی زندگی سے نہیں. یہ اصطلاحات، اس دنیا میں قوموں پر وارد ہونے والے بعض حوادث کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں.

آیندہ صفحات میں یہ اصطلاحاتِ قرآنیہ مذکورہ صدر معانی میں سامنے آئیں گی.

ایمان بالآخرت

سورۂ بقرہ کے شروع میں، مومنین کی خصوصیات میں یہ بھی آیا ہے کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (۲/۴) وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اس راستے پر چلتے ہیں جو انہیں ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا اور انہی کی سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی۔ (نیز ۲۷/۳؛ (۴-۵/۳۱)۔

(۲) قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان کے پانچ اجزاء ہیں۔ یعنی ان پانچ باتوں پر ایمان لانے سے ایک شخص جماعتِ مومنین کے حلقہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ[۱]۔ انبیاء[۲]۔ کتب[۳]۔ ملائکہ[۴] اور آخرت[۵] پر ایمان سے (۲/۱۷۷) اور ان میں سے کسی ایک کے انکار سے وہ اس سوسائٹی کی رکنیت سے خارج ہو جاتا ہے (۴/۱۳۶)۔

(۳) کہیں ان پانچ اجزا کے بجائے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً (۲/۲۳۲)؛ (۳/۱۱۳)؛ (۴/۳۹)؛ (۴/۵۹)؛ (۵/۶۹)؛ (۹/۹۹)۔

کہیں اللہ اور آخرت کے ساتھ ایمان بالکتب کا بھی ذکر آیا ہے (۴/۱۶۲)۔

(۴) بعض مقامات پر صرف آخرت سے انکار کا ذکر ہے۔ مثلاً (۶/۱۱۴)؛ (۶/۱۵۱)۔ یہ اہلِ جہنّم ہیں (۷/۴۵)۔ ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا ہے (۷/۱۴۷)؛ (۱۶/۲۲)؛ (۱۶/۶۰)؛ (۱۷/۱۰)؛ (۳۴/۸)۔

(۵) قرآنی تعلیم سے وہی نفع اندوز ہو سکتا ہے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو (۱۷/۴۵)۔ جو آخرت پر ایمان نہ رکھے وہ صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتا (۲۳/۷۴)؛ (۲۷/۴)۔

(۶) اللہ اور آخرت پر ایمان کا عملی مظاہرہ، قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے اور کرلنے سے ہوتا ہے (۲۴/۲)۔

(۷) علم و بصیرت کی رُو سے حیاتِ آخرت کی بات سمجھ میں آ سکتی ہے (۲۷/۶۶)؛ (۲/۲۱۹)۔

(۸) ابلیس انہی کو بہکا سکتا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (۳۴/۲۱)۔

(۹) حیاتِ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے مشرک ہیں (۷۔ ۴۱/۶) ؛ (۲۷/ ۵۳)۔
(۱۰) انبیاء کا اسوہ انہی کے لئے چراغِ راہ بن سکتا ہے جو آخرت پر ایمان رکھیں (۶۰/۶)۔
(۱۱) جو آخرت پر ایمان نہ رکھیں ان سے دوستداری کے تعلقات نہیں رکھے جا سکتے (۶۰/۱۳)۔
(۱۲) جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کے نیک اعمال درحقیقت لوگوں کو دکھانے کے لئے ہوتے ہیں (۲/۲۶۴)۔ اس لئے کہ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہ ہو تو اعمال کا جذبۂ محرکہ شہرت حاصل کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟
(۱۳) منافق' زبان سے آخرت کا اقرار کرتا ہے۔ دل سے اس کی صداقت پر یقین نہیں رکھتا (۲/۸)۔
(۱۴) حیاتِ آخرت پر ایمان رکھنے والا' بلند مقصد کے حصول کے لئے جان تک ہنسی خوشی دے دیتا ہے۔ وہ ایسے مواقع کی انتظار میں رہتا ہے جب وہ جان دے کر کسی مستقل قدر کو محفوظ رکھ سکے۔ یہود ایسا نہیں کر سکتے تھے (۲/۹۴)۔
(۱۵) مستقبل کی تباہی کا احساس رکھنے والا صحیح راستے پر چل سکتا ہے (۱۱/۱۰۳) ؛ (۵۳/۷۴)۔
(۱۶) مفادِ عاجلہ کو پسند کرنے والے' آخرت کو نظر انداز کر دینے والے ہیں (۲۰۔۲۱/۷۵) ؛ (۷۶/۲۷)۔
(۱۷) اجرِ آخرت زیادہ نفع بخش ہوتا ہے (۱۲/۵۷)۔
(۱۸) نظامِ خداوندی سے وابستگی سے دنیا کے مفاد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور آخرت کے بھی۔ یہ ہے مراد اس سے کہ آخرت و اولیٰ دونوں خدا کے لئے ہیں (۵۳/۲۵) اور مستقبل کی حمد و ستائش تو بہرکیف اسی کے لئے ہے (۱/۳۴)۔ قوانینِ خداوندی سے انکار کرنے والوں کی اولیٰ اور اُخریٰ دونوں تباہ ہو جاتے ہیں (۷۹/۲۵)۔
(۱۹) جو جماعتیں آسمانی انقلاب کی داعی ہوں انہیں اپنے پروگرام کے ابتدائی مراحل میں بڑی جانگداز مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن آخرالامر کامیابی انہی کے لئے ہوتی ہے (۶/۹۳)۔

قیامت

قِیَامٌ کے معنی ہیں کھڑا ہونا. اس لفظ کے ساتھ (ۃ) کے اضافہ سے قِیَامَۃٌ بنا ہے جس کے معنی ہیں یکبار گی کھڑا ہو جانا.

قیامت کے متعلق عام طور پر تصور یہ ہے کہ یہ دنیا آخر الامر فنا ہو جائے گی. اس سے قیامت آجائے گی. جہاں تک دنیا (ہی نہیں بلکہ جملہ کائنات) کا تعلق ہے' اس کی مدت کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہو' اسے آخر الامر ختم ہونا ہے. قرآنِ کریم میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اسے ایک مدتِ معینہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے. كُلٌّ يَجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۵/۱۳) یہ کارگہ کائنات ایک معینہ مدت کے لئے سرگرم عمل ہے. (نیز ۲۹/۳۱؛ ۵/۳۹). دوسری جگہ ہے. مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ سلسلۂ ارض وسما کو ہم نے "بالحق" پیدا کیا ہے. "بالحق" بڑی جامع اصطلاح ہے. اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس کی تخلیق یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آگئی. یہ ایک اسکیم کے مطابق' ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے. اس کی تخلیق (PURPOSEFUL) ہے. نیز اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ یہ (افلاطونی فلسفہ کے مطابق) سایہ بدیوار نہیں. سراب نہیں. (یا ویدانت کے فلسفہ کے مطابق) مایا (فریب) نہیں. ایشور کا خواب نہیں. پرماتما کی رچائی ہوئی لیلا (کھیل) نہیں. یہ فی الواقعہ موجود ہے. اس کا وجود ایک حقیقتہ ثابتہ (REALITY) ہے. لیکن یہ پیدا کی گئی ہے. وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۶/۳) ایک مدتِ معینہ کے لئے. اسے خدا کی طرح ابدیت حاصل نہیں. ایک وقت ایسا تھا جب اس کا کوئی وجود نہ تھا. خدا نے اسے پیدا کیا ایک مدتِ معینہ کے لئے. اس کے بعد یہ ختم ہو جائے گی. قرآنِ کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں کہ ان کے الفاظ کے اگر (مجازی نہیں) حقیقی معانی لئے جائیں تو ان سے ایک ایسا منظر سامنے

آتا ہے جس میں آسانی کرتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے ہیں. چاند اور سورج بے نور ہو جاتے ہیں. پہاڑ، دُھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے ہیں. زمین، ریت کے ذرّوں کی طرح غبارِ راہ بنی ہوئی نظر آتی ہے. سمندر متلاطم ہیں. فضائیں ہمہ تن بگولے بن رہی ہیں. غرضیکہ نظم و نسق کائنات اس طرح درہم برہم ہوتا دکھائی دیتا ہے. كَاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا. گویا یہ کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہ تھی.

لیکن اس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے نہیں. قانونِ مکافاتِ عمل کا تعلق تو اس سے ہے کہ یہ کائنات باقی رہے یا نہ رہے. لیکن انسان مرنے کے بعد بھی باقی رہے. لہٰذا قیامت کا تعلق نظم و نسقِ کائنات کے درہم برہم ہونے سے نہیں. اس کا تعلق " انسان کے اُٹھ کھڑے ہونے" سے ہے.

اور" انسان کے اُٹھ کھڑے ہونے" کا مقام یہ دنیا بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی. اس دنیا میں مستبد قوتیں، کمزوروں اور ناتوانوں کو اس طرح دبائے رکھتی ہیں کہ ان میں اُٹھنے کی سکت تو ایک طرف اس کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا. لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک ہنگامہ خیز انقلاب آتا ہے اور یہی دبی ہوئی انسانیت، یکبارگی اٹھ کھڑی ہو جاتی ہے. یہ اس دنیا میں قِیَامَۃ ہے. یہ انقلاب اگر اس جماعت کے ہاتھوں رونما ہو جو مستقل اقدارِ خداوندی کی حامل ہے، تو معاشرہ میں ظلم و استبداد کی جگہ عدل و احسان کا دَور دَورہ ہوگا. ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے گا، کوئی اسے غصب نہیں کر سکے گا. ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا. حق، باطل پر غالب آجائے گا. اس قسم کا انقلاب، نبیٔ اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاءؓ کے ہاتھوں اس قدر نمایاں طور پر رونما ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی. قرآنِ کریم نے اسے بھی القیامۃ سے تعبیر کیا ہے. اس کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل بتائی ہیں.

(۱) رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت دنیا میں، دینِ خداوندی اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں باقی نہیں رہا تھا. وہ ہر جگہ مذہب سے بدل گیا تھا. نتیجہ اس کا یہ تھا کہ تمام اہلِ مذاہب کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خدائی تعلیم اپنی حقیقی شکل میں موجود ہے لیکن ایک کی تعلیم دوسرے سے ملتی نہیں تھی. ان میں باہمی اختلافات موجود تھے. لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں تھا جو حق و باطل

میں امتیاز کر کے، ان نزاعات کو مٹا سکے. اس لئے ان میں باہمی جنگ وجدل جاری رہتی تھی. قرآن کریم نے کہا کہ اس انقلاب سے ایک معیار سامنے آجائے گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کونسی تعلیم فی الواقعہ خدا کی دی ہوئی ہے اور کونسی انسانوں کی خود ساختہ. اس طرح ان کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں گے. چنانچہ مختلف مذاہبِ عالم کے پیروؤں (یہود. نصاریٰ. مجوس وغیرہ) نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے اختلافات مٹ گئے. قرآنِ کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ "یَوْمَ الْقِیَامَۃِ" میں ان کے اختلافات مٹ جائیں گے تو اس سے یہی مراد ہے. (عربی زبان اور قرآنِ کریم کی رُو سے 'یَوْمَ' کے معنی دن ہی نہیں ہوتے. اس سے مراد' زمانہ' دور' عہد بھی ہوتے ہیں. اس نسبت سے "یوم القیامۃ" سے مراد ہو گا وہ انقلابی دَور جو قرآن کی رُو سے سامنے آیا تھا). اس انقلابی دَور میں' ان اہلِ مذاہب کے اختلافات رفع ہوئے تھے. ورنہ اگر ان آیات میں' قیامت سے مراد' مرنے کے بعد کا زمانہ لیا جائے' تو وہاں اختلافات مٹنے سے کیا حاصل ہو گا؟ ان تصریحات کی روشنی میں قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات پر غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے. مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی' نصاریٰ کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کے پاس سچا دین نہیں اور یہی بات نصاریٰ یہود کے متعلق کہتے ہیں اور دونوں کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتابیں ہیں. (اور یہ کتابیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں) سو بحالاتِ موجودہ ان کے باہمی اختلافات کے مٹ جانے کی کوئی صورت نہیں. لیکن فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ٥ (۲/۱۱۳) اس دَورِ قیامت (انقلابی زمانہ) میں خدا انکے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا. یعنی خدا کی کتاب (قرآن) بتا دے گی کہ خدا کی صحیح تعلیم کیا ہے. سورۃ آلِ عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے انجام کے متعلق یہود اور نصاریٰ میں سخت اختلاف ہے. اس انقلابی دَور (القیٰمۃ) کے آنے تک' عیسائی' اس باب میں یہودیوں پر غالب رہیں گے. لیکن اس کے بعد اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ٥ (۳/۵۴) یہ لوگ ہماری طرف رجوع کریں گے تو ان کے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا. سورۃ نساء میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ مخالفین کے ساتھ جماعتِ مومنین کی جنگ کی صورت میں' ان (منافقین) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ انتظار میں' بیٹھے رہتے ہیں کہ دیکھیں کس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے. پھر جب تمہیں فتح حاصل ہوتی ہے تو یہ جھٹ سے آگے بڑھ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ تھے. اس کے بعد ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ

یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ (۴/۱۴۱) تھوڑا سا وقت اور انتظار کرو۔ اس انقلاب کو پوری طرح مسلّط ہو لینے دو۔ منافقین کی منافقت کا پردہ چاک ہو جائے گا اور تمام امور کا دوٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اس وقت حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ؕ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ قوانینِ خداوندی کے خلاف جانے والے ان لوگوں پر غالب آجائیں جو ان کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

مختلف اہلِ مذاہب میں ایک طرف، خود ایک ہی مذہب کے پیروؤں میں بے حد اختلاف پیدا ہو چکے تھے۔ ان اختلافات کے متعلق بھی کہا کہ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰/۹۳) اس انقلابی دور میں خدا ان کے باہمی اختلافات کا بھی فیصلہ کر دیگا۔ (نیز ۱۶/۱۲۴؛ ۳۲/۲۵؛ ۳۹/۳؛ ۴۵/۱۷)۔

مختلف اہلِ مذاہب ہی، مختلف اقوامِ عالم کے متعلق کہا کہ ان کی بھی اس وقت یہ کیفیت ہے کہ ایک قوم، دوسری قوم پر چڑھ دوڑتی ہے، اور ہر قوم کا دعوے یہ ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے بھی اس وقت کوئی خارجی معیار موجود نہیں۔ لیکن اب یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ میں ان امور کی بھی وضاحت ہو جائے گی (۱۶/۹۲)۔ اس انقلاب کی حامل قوم کو شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ بنایا گیا ہے۔ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگراں ہو گی اور جو قوم اپنی حد سے تجاوز کرے گی اسے وہیں روک دیا کرے گی۔ اس طرح کوئی قوم ناحق دوسری قوم پر چڑھ نہیں دوڑا کرے گی۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ مختلف اہلِ مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ یوم القیٰمۃ میں ہو جائے گا۔ سورۂ حج میں یہ بات یہود۔ نصاریٰ۔ صابئین۔ مجوسی اور مشرکین کا تصریحاً ذکر کرتے ہوئے کہی گئی ہے۔ ان کا نام لے کر کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (۲۲/۱۷) اللہ ان میں، اس انقلابی دور میں فیصلہ کر دے گا۔ حتّٰی کہ اس دور میں اس امر کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ انسان کو دوستداری کے تعلقات کن لوگوں سے وابستہ رکھنے چاہئیں۔ قرآنِ کریم نے یگانوں اور بیگانوں کے لئے ایک بنیادی معیار مقرّر کیا۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ ایمان (آئیڈیالوجی) میں مشترک ہوں، وہ اپنے ہیں، خواہ ان میں اور کوئی باہمی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ اور جو اس میں اشتراک نہ رکھیں، وہ بیگانے ہیں خواہ وہ ماں باپ۔ بہن بھائی۔ حتّٰی کہ میاں بیوی بھی کیوں

نہ ہوں۔ اس انقلاب نے انسان اور انسان میں یہ حدِ فاصل اور خطِ امتیاز قائم کردیا۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے تفصیلی ہدایت دینے کے بعد کہا کہ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ (۶۰/۳)۔ اب اس دَور میں جب یگانگت کا معیار ہی بدل گیا ہے، کسی کا بیٹا یا باپ ہونا، کچھ فائدہ نہیں دے سکے گا۔ خدا کے قانون کی رُو سے ان میں بُعد اور فصل ہو جائے گا۔ اس سے واضح ہے کہ یہاں یوم القیٰمہ سے مراد یہی انقلابی دَور ہے جو قرآن کی رُو سے وجود میں آیا تھا۔

سورۂ بقرہ میں ایک مقام پر ہے کہ قانونِ خداوندی سے انکار کرنے والوں کی نگاہ میں، دنیاوی زندگی کی متاع بڑی جاذب بن جاتی ہے اور وہ جماعتِ مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (۲/۲۱۲) "جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، وہ "یوم القیامت" میں ان لوگوں پر فائق ہوں گے۔ خدا اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق، لوگوں کے اندازوں سے بھی بڑھ کر سامانِ زیست عطا کرتا ہے"۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں، تقویٰ شعار لوگ منکرینِ قوانینِ خداوندی کے مقابلہ میں یقیناً بلند مدارج کے حامل ہوں گے لیکن اس آیت میں ایسا نظر آتا ہے کہ یہ فوقیت اس دنیا کی ہے۔ اس لئے یہاں بھی یوم القیامۃ سے مراد وہ دَور ہے جو اس آسمانی انقلاب کے بعد رونما ہونے والا تھا۔ قرآنِ کریم میں اور بھی ایسی آیات ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ان میں قیامت سے مراد وہ انقلاب ہے جس میں ایک جماعت، غلط نظام کو الٹنے کے لئے یکبارگی اُٹھ کھڑی ہو۔ سورۂ تطفیف میں اس انقلاب کو "یوم عظیم" کہہ کر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳/۶) جس دن (یا جس زمانے میں) لوگ خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اب ہم ان آیات کی طرف آتے ہیں جن سے مستنبط ہوتا ہے کہ قیامت سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی میں اُٹھ کھڑے ہونا بھی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ وہ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھیں اور دوسرے حصے سے انکار کریں تو فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ

اَلْعَذَابِ ط (۲/۸۵) ان کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی دنیاوی زندگی ذلت و رسوائی کی ہو اور قیامت کے دن انہیں سخت ترین عذاب کی طرف لے جایا جائے۔ یہاں 'قیامۃ' کا لفظ حیٰوۃ الدنیا کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اسی طرح متعدد اور آیات میں بھی 'دنیا کے مقابلہ میں قیامت کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۷/۳۲؛ ۱۱/۶۰؛ ۹۸ — ۱۱/۹۹؛ ۲۲/۹)؛ (۲۸/۴۱)۔ بعض آیات میں قیامت کا لفظ بلا امتیاز و تخصیص آیا ہے لیکن وہاں بھی قرآن سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے مثلاً

(۱) قیامت کے دن خدا "ان سے بات نہیں کرے گا" اور نہ ہی انہیں سامانِ نشوونما ملے گا۔ ان کے لئے الم انگیز عذاب ہوگا (۲/۱۷۴)؛ (۳/۷۶)۔

(۲) قیامت کے دن خیانت کرنے والوں کی خیانت سامنے آجائے گی اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی (۳/۱۶۰)۔ [معاشرہ کا یہ انداز اس انقلاب کے بعد بھی ہو سکتا ہے جو مستقل اقتدار کی حامل جماعت کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ اس قسم کی دیگر آیات میں بھی یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے]۔

(۳) مومنین کی دعائیں کہ ہمیں قیامت کے دن ذلت نصیب نہ ہو (۳/۱۹۴)۔

(۴) قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ اپنی امت کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ایسے ایسے عقائد وضع کر لئے تھے جنہیں (حضرت عیسیٰؑ نے) انہیں نہیں دیا تھا (۴/۱۵۹)۔

(۵) قیامت کے دن مال و دولت دے کر عذاب سے چھٹکارا انہیں مل سکے گا (۵/۳۶)۔

(۶) خدا تمہیں یوم القیامۃ میں جمع کرے گا (۶/۱۲؛ ۴۵/۲۶)۔ [اس کی وضاحت "حشر" کے عنوان میں کی جائے گی]۔ (نیز ۱۷/۹۷)۔

(۷) جو لوگ اپنے جی سے کچھ باتیں وضع کرتے ہیں اور انہیں منسوب کر دیتے ہیں خدا کی طرف، یوم القیامۃ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ (۱۰/۶۰)۔ یہاں یوم القیامۃ سے مراد خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔

(۸) جو لوگ دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، قیامت کے دن وہ اپنے جرائم کے ساتھ، ان لوگوں کے جرائم کا بوجھ بھی اپنے کمر پر لادے ہوں گے (۱۶/۲۵)؛ (۲۹/۱۳)۔

(۹) سورۂ نحل میں، اقوامِ سابقہ کی اس دنیا میں تباہی کے بعد کہا ہے کہ یوم القیامۃ میں

وہ ذلیل ورسوا ہوں گے ۱ ۲۶ ـ ۲۷/ ۱۶)۔

(۱۰) اس وقت ہر انسان کا اعمال نامہ لپٹا ہوا اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ قیامت میں وہ کھُل کر سامنے آجائے گا (۱۳ـ۱۴/۱۷)۔ اس سے مراد ظہورِ نتائج کا وقت ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ دنیا میں اور خواہ مرنے کے بعد۔

(۱۱) جن لوگوں کے اعمال رائگاں جاتے ہیں، ان کے لئے یوم القیامۃ کو میزان کھڑی نہیں کی جائے گی (۱۰۵/۱۸)۔ (اس سے بھی مراد ظہورِ نتائج کا وقت ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ حبط اعمال کی وضاحت اس سے پہلے کی جا چکی ہے)۔

(۱۲) سورۂ مریم میں ہے وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ (۹۵/۱۹)۔ یہ آیت ایک عظیم حقیقت سامنے لاتی ہے جس کی تشریح کا یہ مقام نہیں۔ اسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ اس کے جہاں یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ قیامت کے دن، انسان کی بیوی، بچے، اعزہ واقارب، دوست احباب، حتیٰ کہ جنہیں وہ اپنی نجات کا ضامن سمجھا کرتا تھا، ان میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہو گا۔ وہ تنہا عدالتِ خداوندی میں حاضر ہو گا۔ وہاں اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جن چیزوں کو انسان 'میری' کہتا ہے وہ سب یہاں رہ جاتی ہیں ـــــ مثلاً میرا مال، میری اولاد، میرا جسم، حتیٰ کہ میری جان ـــــ اور صرف انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) آگے جاتی ہے۔ اُس زندگی کا تعلق انسانی ذات ("میں") سے ہے۔ "میری" سے نہیں۔ "میری" میں تمام اضافی چیزیں آجاتی ہیں۔ ذاتی شے صرف انسان کی "میں" ہے اور اسی کو مرنے کے بعد آگے جانا ہے۔

(۱۳) قیامت کے دن مجرم اپنے جرائم کا بوجھ ساتھ لے کر حاضر ہوں گے (۱۰۰ـ۱۰۱/۲۰) اور انہیں تولنے کے لئے "عدل کے ترازو" کھڑے کئے جائیں گے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہو گا۔ عملِ انسانی کا ذرہ ذرہ سامنے آجائے گا (۴۷/۲۱)۔

(۱۴) معاشرتی جرائم کی سزا (معاشرتی نظامِ عدل کی رُو سے) اس دنیا میں بھی مل سکتی ہے لیکن اس سے آخرت کا عذاب ٹل نہیں سکتا۔ اس لئے کہ خلافِ قانون عمل کا جو اثر انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے وہ دنیاوی سزا سے مٹ نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یوم القیامۃ میں سامنے آئے گا اور وہ عذاب یہاں

کی سزا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگا (۲۵/۶۹)۔

(۱۵) قیامت میں انسان کے دوست بھی اس کے دشمن ہو جائیں گے (۲۹/۲۵)۔

(۱۶) نقصان کا سودا ان کا ہے جو قیامت کے دن (ظہورِ نتائج کے وقت) دیکھیں گے کہ انہوں نے (اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ اس سے بڑا نقصان اور ہو نہیں سکتا۔ (۳۹/۱۵)؛ (۴۲/۴۵)۔

(۱۷) غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے حفاظت، قانونِ خداوندی کی پناہ میں آجانے سے مل سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی (دیگر) تدابیر سے حفاظت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں (۳۹/۲۴)۔

(۱۸) یوم القیامت کی ذلت کو روسیاہی سے تعبیر کیا گیا ہے (۳۹/۶۰)۔

(۱۹) جو قیامت کے دن امن میں رہے، اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے (۴۱/۴۰)۔

(۲۰) قیامت کے دن (ظہورِ نتائج کے وقت) انسان کے پوشیدہ راز بھی بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے (۵۸/۷)۔

(۲۱) سورۃ القیامۃ میں، قیامت کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے اور اس سوال کے جواب میں کہ قیامت کب آئے گی، جو تفصیل دی گئی ہے اس سے کائنات میں طبیعی تغیرات بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ وہ انقلاب بھی ظہورِ اسلام کے بعد عرب اور ایران میں رونما ہوا اور مرنے کے بعد کی قیامت بھی (۷۵/۱۵-۱)۔

(۲۲) سورۃ زمر میں ہے۔ وَ الْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ (۳۹/۶۷)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ارض اس کے قبضہ میں ہوگی اور سماوات اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ اگر ان الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کیا جائے تو اس سے کوئی عظیم کائناتی تغیر مراد ہو سکتا ہے لیکن اگر ان الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اس آسمانی انقلاب میں جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں رونما ہوگا، دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق مٹ جائے گی۔ انسان کی معاشی زندگی سے متعلق امور (ارض) اور سماوی اقدار، دونوں یکجا ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہوں گے۔

(۲۳) سورۃ اسرائیل میں ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○ (۱۷/۵۸)

اور کوئی بستی نہیں جسے ہم یوم القیٰمۃ سے پہلے تباہ نہیں کردیں گے یا اسے کسی اور سخت عذاب میں مبتلا نہیں کردیں گے۔ یہ چیز خدا کے ضابطۂ قوانین میں لکھی ہوئی ہے۔

اس سے عام طور پر وہ مفہوم لیا جاتا ہے جسے ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ قیامت سے پہلے یہ سارا سلسلۂ کائنات تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو قوم بھی غلط نظام اختیار کرے گی وہ یا تو اس طرح تباہ ہو جائے گی کہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور یا اس پر ایسا زوال آجائے گا، جس میں بازآفرینی کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ اس میں یوم القیٰمۃ سے مراد وہی انقلاب ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں اُس انقلاب کی طرف ہی اشارہ ہو جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں عرب میں رونما ہوا تھا۔ اس میں مخالف جماعتیں یا تو تباہ و برباد ہو گئی تھیں یا بالکل بے بال و پر ہو کر رہ گئی تھیں اور ہر جگہ غلبہ اس نظام کا ہو گیا تھا۔

ہم اپنے ہاں اکثر کہتے ہیں — "تم قیامت تک بھی اسے جیت نہیں سکتے:" اس سے مراد یا تو یہ ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے اور یا کافی لمبا عرصہ۔ قرآنِ کریم کی بعض آیات میں "قیامت" کا لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کہ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۳/۵۴) جو لوگ تیرا اتباع کریں گے انہیں میں، قیامت تک، ان لوگوں پر فائق رکھوں گا جو تجھے نہیں مانتے۔ یہاں متبعین حضرت عیسیٰؑ سے مراد عیسائی اور آپ کے مخالفین سے مراد یہودی ہیں۔ عیسائیوں کی یہودیوں پر فوقیت (برتری) تو ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ برتری ابدی طور پر رہے گی۔ اس لئے یہاں اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ سے مراد مدتِ مدید ہو سکتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں باہمی بغض و عداوت "اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ" رہے گی (۵/۱۴)۔ اسی

طرح یہودیوں کے متعلق بھی کہا ہے (۵/۶۴).

سورۂ قصص میں ہے کہ اگر اللہ ایسا کردے کہ رات آئے تو پھر "یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" تک رات ہی رہے۔ دن چڑھے ہی نہیں۔ تو وہ کونسی قوت ہے جو رات کی تاریکی کو دُور کر کے سورج طلوع کردے (۲۸/۷۱)۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی "قیامت تک" سے مراد ہمیشگی ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے کہ جن معبودانِ باطل (مُردوں) کو یہ لوگ مدد کے لئے بلاتے ہیں وہ قیامت تک ان کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے (۴۶/۵)۔ سورۂ قلم میں غلط کار لوگوں کے متعلق ہے کہ کیا ان لوگوں نے ہم سے قیامت تک کے لئے پٹہ لکھوا رکھا ہے کہ ان کا ہر فیصلہ تسلیم کرلیا جائے گا؟ (۶۸/۳۹)۔ یہاں بھی "اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" سے مراد "ہمیشہ ہمیشہ کے لئے" ہے۔

بعض آیات میں یوم القیٰمۃ اور یوم البعث کو مرادف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل "بعث" کے عنوان میں ملے گی۔

حشر بھی، آخرت، قیامت، ساعت، بعث کی طرح، قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح ہے۔ اس کے بنیادی معنی لوگوں کو جمع کرنا اور ہانک کر کسی طرف لے جانا ہوتے ہیں۔ اسی نہج سے اس لفظ کا اطلاق جنگ اور اس میں جمع ہونے والے لشکروں یا وہاں گرفتار ہو جانے والے قیدیوں پر بھی ہوتا ہے۔ محشر، اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اس قسم کا اجتماع ہو۔ سورۂ نمل میں ہے۔ وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ (۲۷/۱۷) سلیمان کے لشکر جمع ہو گئے۔ جب جماعتِ مومنین کا یہودیوں کے ساتھ پہلا تصادم ہوا ہے جس کے نتیجہ میں انہیں مدینہ سے باہر نکال دیا گیا تھا تو اسے قرآنِ کریم نے اَوَّلِ الْحَشْرِ کہہ کر پکارا ہے (۵۹/۲)۔ سورۂ آلِ عمران میں جنگِ بدر کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۝ (۳/۱۱) ان مخالفین سے کہہ دو کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے۔ پھر تمہیں اکٹھا کر کے، ہانک کر تباہی کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ بہت بری جگہ ہو گی ٹھہرنے کے لئے۔" اس کے بعد دونوں فریقوں کے میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آنے کا ذکر ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہاں مخالفین کے "حشر" سے مراد انکی شکست کے بعد انہیں قیدی بنا کر" ہانک کر لے جانا ہے۔" (ضمناً اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جہنم اس دنیا میں بھی ہوتا ہے جہاں قومیں مغلوب ہو کر ذلت کی زندگی بسر کرتی ہیں)۔

لیکن قرآنِ کریم میں 'حشر' کا لفظ مرنے کے بعد' نتائجِ اعمال کے لئے بھی آیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو بنیادی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) جیساکہ ہم "رجعت الی اللہ" کے عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں، "خدا کی طرف جانے" سے مراد یہ نہیں کہ خدا کسی مقام میں رہتا ہے اور انسان مرنے کے بعد اُس مقام میں اس کے پاس جائے گا. خدا کی ذات، مکان اور زمان کی نسبتوں سے بلند ہے. اس لئے کسی انسان کا "اس کے پاس" جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. رجعت الی اللہ یا خدا کی طرف جانے سے مراد، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق، ظہورِ نتائج ہے خواہ وہ اس دنیا میں ہو اور خواہ مرنے کے بعد کی زندگی میں.

(۲) جیساکہ "روزِ جزا سے متعلق تفاصیل" کے باب میں بتایا جائے گا. قرآنِ کریم محض سمجھانے کی خاطر، اس قسم کا نقشہ پیش کرتا ہے. گویا ایک عدالت کا میدان ہے جہاں تمام متعلقہ لوگ (فریقین گواہ، پولیس کے افراد وغیرہ) جمع ہیں. مقدمہ پیش ہوتا ہے. شہادات طلب کی جاتی ہیں. ریکارڈ سامنے رکھا جاتا ہے. الزامات کی فہرست مرتب کی جاتی ہے. ملزم کو صفائی کا موقعہ دیا جاتا ہے پھر فیصلہ سنایا جاتا ہے. مجرمین کو ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جاتا ہے. یہ سب قانونِ مکافاتِ عمل کی نتائج پذیری کو سمجھانے کا وہ طریق ہے جس طرح دنیا میں مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں. اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد، ایک دن ــــ اوّل سے آخر تک کے، تمام انسان کسی میدان میں جمع کئے جائیں گے اور وہاں ان کی جزا اور سزا کا فیصلہ ہو گا. قرآنِ کریم میں جہاں "خدا کے ہاں جمع ہونے" کا ذکر آیا ہے اس سے مراد، انسانی اعمال کے نتائج کا ظہور ہے.

لہٰذا حشر کا لفظ یا تو اِس دنیا میں حق و باطل کی قوتوں کے تصادم کے لئے آیا ہے اور یا مرنے کے بعد کی زندگی میں ظہورِ نتائج کے لئے. اس کی وضاحت ذیل کی آیات سے ہو گی.

جمع ہونے کا دن

(۱) خدا انہیں اس دن جمع کرے گا جس کے واقع ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہو گا (۳/۲۴)؛ (۳/۸)؛ (۹/۲۲)؛ (۶/۵۱)؛ (۱۰/۲۸)؛ (۱۵/۲۵)؛ (۳۴/۴۰)؛ (۲۶/۳۲).

(۲) اسے یوم القیمۃ بھی کہا گیا ہے (۶/۱۲؛ ۱۶/۹۷) اور آخرت بھی (۱۱/۱۰۳) اور یوم مشہود بھی (۱۱/۱۰۳).

(۳) سورۂ دخان میں اسے یوم الفصل (فیصلہ کا دن) کہا گیا ہے (۴۴/۴۰)؛ (۷۷/۳۸) اور سورۂ تغابن میں اسے یوم التغابن سے تعبیر کیا گیا ہے (۶۴/۹)۔ یعنی جس دن ایک دوسرے کے تقابل سے معلوم ہو جائے گا کہ کس میں کس قدر کمی رہ گئی تھی۔

(۴) تم قتل کر دیئے جاؤ یا طبیعی موت مر جاؤ۔ خدا کی طرف سب کو جمع ہونا ہے (۳/۱۵۷)۔

(۵) جس دن انہیں اکٹھا کیا جائے گا تو انہیں یوں محسوس ہوگا گویا دن کی ایک گھڑی تک رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے (۱۰/۴۵)۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ انہیں ایسا محسوس ہوگا گویا ایک گھڑی تک رہے ہیں، اس کی تشریح اپنے مقام پر آگے چل کر ملے گی۔

(۶) سورۂ ابراہیم میں کہا ہے وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۱۴/۲۱) وہ سب، نمایاں طور پر خدا کے حضور، جمع ہو جائیں گے۔ یہ اس دن ہوگا جب یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا (۱۴/۴۸)۔

(۷) ان (مجرمین) اور شیاطین کو اکٹھا کیا جائے گا اور یہ سب جہنّم کے کنارے گھٹنوں کے بل جھکے ہوں گے (۱۹/۶۸)۔ دہشت کے مارے ان کی آنکھیں نیلی ہو جائیں گی (۲۰/۱۰۲)؛ (۱۹/۴۱)۔ انہیں اور ان کے باطل معبودوں کو اکٹھا کیا جائے گا (۲۵/۱۷)۔ تمام ہم مسلک لوگ یک جا ہوں گے (۳۷/۲۲)؛ (۴۶/۶)؛ (۲۵/۳۴)۔

(۸) ہر امت سے ایک ایک گروہ کو اکٹھا کیا جائے گا اور انہیں الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا (۲۷/۸۳)۔

(۹) مومن، معزز مہمانوں کی طرح خدا کے ہاں جمع ہوں گے اور مجرمین کو ہانک کر جہنّم کی طرف لے جایا جائے گا (۸۵ — ۱۹/۸۶)۔

(۱۰) اس طرح جمع کرنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں (۵۰/۴۴)۔

(۱۱) بعض مقامات پر حشر کے معنی صرف اٹھا کھڑا کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو شخص قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۱۲۴ — ۲۰/۱۲۵) اور اسے قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔

(۱۲) سورۂ مومنون میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (۲۳/۷۹) خدا نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے اور تم اس کی طرف جمع ہونے والے ہو۔ (نیز ۲۴/۱۶۷)۔

(۱۳) سورۂ کہف میں یاجوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لئے ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی تھی، اس کے سلسلہ میں کہا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دیوار گر جائے گی اور پھر یہ قومیں موج در موج ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں گی۔ وَ جَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸/۹۹) اور ہم ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماع، اسی دنیا میں قوموں کے لشکروں کا کسی جنگِ عظیم میں ایک دوسرے کے سامنے آنا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ اس وقت جہنم کو سامنے نمودار کر دیا جائے گا۔ یہ جہنم بھی اسی دنیا کی تباہی کا تمثیلی بیان ہے۔

بہرحال، جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، حشر سے مراد اس دنیا میں قوموں یا جماعتوں کا باہمی تصادم بھی ہے اور مرنے کے بعد، قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ظہورِ نتائج کا محسوس بیان بھی۔

بعث

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ' بعث ' کی اصطلاح بھی ہے ۔ بَعْثٌ کے بنیادی معنی ہیں ' جو چیز کسی کی آزادانہ نقل و حرکت کے راستے میں حائل ہو ' اسے راستے سے ہٹا دینا اور اس طرح ان موانع کو دُور کر دینا جو اس کی حرکت کو روکے ہوتے تھے ۔ قرآنِ کریم میں اس کا استعمال متعدد مفاہیم کے لئے آیا ہے ۔ مثلاً

(۱) جب حق کی علمبردار جماعت ' معاشرہ میں انقلاب لانے کے لئے اٹھتی ہے تو مخالف جماعتیں ' اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں اور اس طرح اس انقلاب کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں ۔ ان جماعتوں کو راستے سے ہٹا کر ' اس انقلاب کے لئے راستہ ہموار کر دینے کے لئے بھی یہ اصطلاح آئی ہے ۔ مثلاً سورۂ تطفیف میں ہے کہ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ (۸۳/۵-۴) یہ سرمایہ دار جماعتیں قرآنی نظامِ معیشت کی راہ میں روک بن کر کھڑی ہیں ۔ کیا انہیں اس کا خیال نہیں آتا کہ ہمارا قانونِ مکافات اس قدر قوت اور غلبہ کا مالک ہے کہ یہ انہیں پرکاہ کی طرح راستے سے ہٹا کر الگ کر دے گا ؟ یہ کچھ ہوگا لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ ایک عظیم انقلابی دَور کے آنے کے لئے ۔ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ (۸۳/۶) وہ دَور جس میں نوعِ انسانی ربوبیتِ عالمینی کے نظام کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہو گی ۔

(۲) یہ اصطلاح زوال آمادہ قوموں کو حیاتِ نَو عطا ہونے کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے ۔ یعنی ان کی حرکت و عمل کے راستے میں جو موانع تھے انہیں دُور کر کے ' ان اقوام کو ازسرِ نَو کھڑے کر دینا ۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کی (بابل کی) قریب سوسالہ غلامی کی زندگی کے بعد ' انہیں حیاتِ تازہ عطا ہونے

کے سلسلہ میں کہا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ (۲/۲۵۹) سو برس تک ان پر موت طاری رہی۔ اس کے بعد انہیں اٹھا کھڑا کیا۔ (عام طور پر کسی کو صاحبِ اختیار بنا کر بھیجنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کسی رسول کی بعثت)۔

(۳) موت، انسان کی حرکت وعمل کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ اسے دُور کرکے، اس فرد کو پھر سے زندگی عطا کر دینے کے لئے بھی یہ اصطلاح آتی ہے۔ یہ حیاتِ نَو ملتی کس طرح ہے اس کا ذکر تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گا۔ اس وقت ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کے لئے بھی بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یوم القیامۃ کی طرح اسے یوم البعث یا یوم یبعثون کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے اور ہر مقام پر غور و تدبر سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس جگہ بعث سے کیا مراد ہے۔ مثلاً

(۱) سورۂ انعام میں ہے وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (۶/۳۶) مُردوں کو خدا ضرور اٹھا کھڑا کرے گا۔

(۲) کفار بَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے (۷/۱۱)۔ یہ قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ جس پر موت وارد ہو جائے اسے خدا حیاتِ نَو عطا نہیں کر سکتا۔ یہ غلط ہے۔ خدا نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے اور اس کے سب وعدے سچے ہوتے ہیں (خدا کے وعدہ کو قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے)۔ اس لئے ایسا ہو کر رہے گا (۱۶/۳۸)۔ انہیں دلائل سے سمجھایا گیا کہ ایسا کس طرح ممکن ہے (۲۲/۵)۔ اسے السّاعۃ سے تعبیر کیا گیا اور کہا گیا کہ خدا انہیں ضرور حیاتِ نَو عطا کرے گا جو قبروں میں ہیں (۲۲/۷)۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ جب ہم گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷/۹۸)۔ (نیز ۲۳/۳۷)۔ کیا ہم ایک نئی مخلوق بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ جواب میں کہا کہ تمہاری خلق اور بعث تو یوں سمجھو جیسے ایک نفس (نفسِ واحدہ) کی خلق اور بعث ہو۔ مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ (۳۱/۲۸)۔

(۳) اس طرح حیاتِ نَو مل جانے کے وقت کو يَوْمِ الْبَعْثِ کہا گیا ہے (۳۰/۵۶)۔ اسی کو یوم الدّین بھی کہا گیا ہے۔ یعنی اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کا وقت (۸/۷۔ ۳۸/۷۹)؛ (۳۶۔ ۱۵/۳۸) اور يَوْمِ الْقِيٰمَةِ بھی (۱۷/۴۲؛ ۲۳/۱۵) اور يَوْمِ الْخُرُوْجِ بھی (۵۰/۴۲)۔ یعنی نمودار ہونے کا

دن۔ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا (۵۸/۶) جس دن خدا ان سب کو اٹھا کھڑا کرے گا اور بتائے گا کہ انہوں نے کیا کام کئے تھے۔ (نیز ۵۸/۱۸)۔

(۴) اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے (۲۷/۶۵) اور نہ ہی مُردوں کو اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق رہتا ہے۔ اس لئے کہ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ٥ (۲۳/۱۰۰)۔ یوم بعث تک ان کے پیچھے ایک پردہ حائل ہوتا ہے۔

(۵) حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ مجھ پر سلامتی ہی سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا تھا جس دن مجھے وفات ہوگی اور جب پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا (۱۹/۳۳)۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا تھی کہ جس دن میں اٹھایا جاؤں مجھے رسوائی نصیب نہ ہو (۲۶/۸۷)۔

(۶) قرآنِ کریم میں اصحابِ کہف کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ خدا مست انقلابیوں کی جماعت تھی۔ اپنے پروگرام کے ابتدائی دور میں جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ہنوز مستبد قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو وہ ایک بہت بڑے غار میں جا چھپے اور وہاں تیاریاں شروع کر دیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ باہر کے حالات سازگار ہو گئے ہیں تو وہ پھر باہر نکل آئے۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی ان کی بعث سے تعبیر کیا ہے (۱۸/۱۹)۔ ویسے رات کو سو کر صبح کے وقت اٹھنے کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے ۶/۶۰)۔

نفخِ صُور

اس ضمن میں ایک اصطلاح " نفخِ صُور" کی بھی آئی ہے۔ اس لفظ (صُور) کے دو معنی ہیں۔
(۱) پہلے زمانہ میں لڑائی کے وقت نرسنگھا بجایا کرتے تھے۔ اسے صور کہتے تھے (آجکل اسے بگل کہا جائے گا)۔ اس اعتبار سے صور پھونکنے کے معنی ہوں گے۔ اعلانِ جنگ کرنا۔ جنگ شروع کرنا۔ جب اس اصطلاح کا تعلق (اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کے معنی حق و باطل کی جماعتوں میں جنگ کا آغاز ہوں گے۔

(۲) لفظ " صورت " کے معنی ہیں کسی شئے کی ہیئت۔ اس کا پیکر۔ اس کی جمع صَوَرٌ بھی آتی ہے اور صُوَرٌ بھی۔ اس اعتبار سے صُوَرٌ کے معنی ہوں گے انسانی پیکر اور نفخِ صُور سے مراد ہوگی' انسانی پیکروں میں تازہ روح پھونک دینا۔ اس دنیا میں اگر کسی زوال پذیر قوم کو از سرِ نَو زندگی عطا ہو جائے تو استعارہ کی زبان میں کہیں گے کہ اس قوم کے پیکرانِ آب و گل میں رُوحِ تازہ پھونک دی گئی۔ اس لئے مُردہ قوموں کو حیاتِ نَو مل جانے کے لئے بھی یہ اصطلاح استعمال ہوگی اور جب مُردوں کو دوبارہ زندگی ملے گی (جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) تو اسے بھی نفخِ صُور سے تعبیر کیا جائے گا۔ قرآنِ کریم میں جن آیات میں نفخِ صُور کا ذکر آیا ہے ان میں غور و تدبّر سے اس اصطلاح کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔ مثلاً یاجوج ماجوج کے ضمن میں جو آیت (" حشر " کے عنوان میں) درج کی گئی ہے اس میں بھی " نفخِ صور " کا ذکر آیا ہے (۱۸/۹۹)۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد لڑائی کا بگل ہے جو قوموں کی

عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں بجے گا۔ دیگر آیات درج ذیل ہیں:

(۱) سورۂ انعام میں ہے۔ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (۶/۷۴) جب نفخِ صور ہوگا تو تمام اختیار و اقتدار قوانینِ خداوندی کے لئے مرکوز ہوجائے گا۔

(۲) سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا (۲۰/۱۰۲) جس دن صور پھونکا جائے گا تو اس دن مجرمین جمع کئے جائیں گے اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ ڈر کے مارے ان کی آنکھیں نیلی ہوجائیں گی۔

(۳) سورۂ مومنون میں ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو تمام رشتے ناطے منقطع ہوجائیں گے اور کوئی ایک دوسرے کا پرسانِ حال نہیں ہوگا (۲۳/۱۰۱)۔

(۴) دوسرے مقام پر ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہوں گے وہ ڈر کے مارے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے (۲۷/۸۷)۔ پھر دوسری بار نفخِ صور ہوگا تو وہ کھڑے ہوکر دیکھ رہے ہوں گے (۳۹/۶۸)۔

(۵) نفخِ صور کے بعد، مردے اپنی قبروں سے لپک کر خدا کی طرف جائیں گے (۳۶/۵۱)۔ اس طرح کہ ہر ایک کے ساتھ ایک ("پولیس کا سپاہی" ہوگا جو اسے) پیچھے سے ہانک رہا ہوگا اور ایک گواہ یا نگران ہوگا۔ اسے یوم الوعید کہا گیا ہے (۵۰/۲۱-۲۰)۔

(۶) ایک مقام پر نفخِ صور کے ساتھ ارض و سماء و جبال میں ہوشربا تغیرات کا ذکر آیا ہے اور اسے الواقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے (۶۹/۱۷-۱۳)۔ نیز (۷۸/۲۱-۱۸)۔

(۷) سورۂ مدثر میں صُور کی جگہ ناقُور آیا ہے۔ معنی اس کے بھی وہی ہیں (۷۴/۸)۔

قرآنِ کریم میں، جہاں اقوامِ سابقہ کی تباہی کا ذکر آیا ہے، وہاں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ ایک فضا کو چیر جانے والی اور دل ہلا دینے والی "آواز" آئی اور وہ قوم راکھ کا ڈھیر ہوکر رہ گئی۔ جن قوموں کی تباہی طبیعی حوادث (مثلاً زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کی سنگ باری) سے ہوئی تھی، ان میں یہ چیخ کی آواز بھی طبیعی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اس سے مراد بھی تباہی کی آمد کا پتہ دینے والی کوئی علامت ہوگی۔ سورۂ یٰسین میں ہے اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ (۳۶/۲۹)

بس ایک چیخ کی آواز اُبھری اور وہ قوم راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ (نیز ۳۶/۴۹)۔ (۳۸/۱۵)۔ قومِ ثمود کے سلسلہ میں بھی یہی آیا ہے (۵۴/۳۱)۔ دوسری جگہ نفخِ صور کے ساتھ صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً کا ذکر آیا ہے (۳۶/۵۳)۔ اسے یوم الخروج کہا گیا ہے (۵۰/۴۲)۔ دوسرے مقام پر اسے زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ کہا گیا ہے (۳۷/۱۹)۔ اس میں آواز کے ساتھ ڈانٹنے کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ (نیز ۱۳—۱۴/۶۹)۔

تیرھواں باب

حیاتِ نو

اب ہم اپنے موضوع کے اہم ترین اور نازک ترین گوشے کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی دو بنیادی نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن کریم :

(۱) ان لوگوں کو بھی مُردہ کہتا ہے جو طبیعی طور پر زندہ ہوتے ہیں اور دوسرے انسانوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی انسانی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ انہیں حیاتِ تازہ، قرآنِ کریم میں غور و فکر سے مل سکتی ہے۔

(۲) وہ ان قوموں کو بھی مُردہ کہتا ہے جو زوال پذیر ہو چکی ہوں۔ ان میں اگر دوبارہ عروج حاصل کرنے کی استعداد و صلاحیت باقی ہوتی ہے تو وہ قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے سے دوبارہ زندگی حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ بھی حیات بعد الممات کہلاتی ہے۔ اور

(۳) افراد کی طبیعی موت کے بعد، دوسری زندگی کو بھی "موت کے بعد کی زندگی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی اس موضوع کا اہم ترین اور نازک ترین گوشہ ہے۔ لیکن باقی دو گوشے بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کم توجہ کے مستحق نہیں۔

زراعت کی تشبیہ

قرآنِ کریم نے حیاتِ نَو کو کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مثال

(یا تشبیہہ) بڑی ہی بلیغ و لطیف ہے۔ آپ اس زمین کو دیکھئے جو افتادہ (یا بنجر) ہو۔ اس میں سبزی، شادابی، شگفتگی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اسے کہا ہی زمینِ مردہ جاتا ہے۔ لیکن بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں روئیدگی آنکھیں ملتی ہوئی ابھر آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین، زندگی اور تازگی کا حسین منظر بن جاتی ہے۔ یا مثلاً گیہوں کے ایک دانے کو دیکھئے۔ وہ بالکل خشک نظر آئے گا اور اس میں نمو اور زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیں گے۔ لیکن اس بیج کو جب فطرت کے قانون کے مطابق، اس مٹی میں ملا دیا جائے گا جس میں کسی شادابی اور شگفتگی کا نشان نہ تھا، تو اس بیج سے حیاتِ تازہ کونپل کی شکل میں ابھر کر، ایک دانہ کو سو سو دانوں میں منتقل کر دے گی۔ اگر کسی شخص نے بنجر زمین سے روئیدگی پیدا ہوتے یا دانہ کو کونپل بنتے نہ دیکھا ہو تو وہ کبھی باور نہیں کرے گا کہ ایسا ممکن ہے۔

لیکن یہ حیاتِ تازہ اسی زمین کو حاصل ہوگی جس میں روئیدگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اور کونپل اسی بیج سے پھوٹ سکے گی جس میں اگنے کی استعداد ہوگی۔ اس "اُگنے کی صلاحیت" سے کیا مراد ہے؟ یہی کہ اس بیج کے اندر زندگی موجود ہوتی ہے لیکن خوابیدہ شکل میں۔ اس کے بعد وہ بیدار ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے مضمر تھی پھر مشہود ہوگئی۔ پہلے مستتر تھی پھر بارز ہوگئی۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آئی۔ اس کے اندر موجود تھی لیکن ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ پہلے وہ (POTENT) تھی، پھر (ACTUALISE) ہوگئی۔ اگر اس بیج میں زندگی کی یہ صلاحیت باقی نہ رہے تو پھر اس سے کونپل نہیں پھوٹے گی۔ قرآنِ کریم نے اس تشبیہہ کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى (۷/۵۷)[1] "اور اسی طرح ہم مردوں کو حیاتِ نو عطا کر دیتے ہیں۔" (نُخْرِجُ — یعنی جو زندگی ان کے اندر مستور تھی اسے باہر نکال لاتے ہیں۔ جس کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہو اس سے باہر کیا نکلے گا؟) سورۂ نحل میں ہے کہ خدا بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۱۶/۶۵) پھر اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا ہو جاتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں یہ کچھ بیان کرنے کے بعد کہا کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى (۲۰/۵۴)

---

[1] (۲۲/۶۳؛ ۲۵/۴۸؛ ۳۰/۲۴؛ ۳۵/۵)۔

اس محسوس مثال میں اربابِ عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کے نشاناتِ راہ موجود ہیں[1] سورۃ حج میں ہے کہ اگر تمہیں مردوں کو زندگی عطا ہونے کے معاملہ میں شک ہو تو تخلیقِ انسانی کے مختلف مراحل پر غور کرو کہ بے جان مٹی سے اس کی ابتدا کر کے اسے کس طرح پیکرِ انسانی تک پہنچایا۔ یا پھر زمین کی تازگی و سرسبزی دیکھو کہ وہ کس طرح نمودار ہوتی ہے۔ اسی طرح سے مُردوں کو زندگی مل سکتی ہے (۲۲/۶)۔ سورۃ عنکبوت میں ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو بادلوں سے بارش برسا کر زمینِ مُردہ کو نئی زندگی عطا کر دیتا ہے تو یہ کہہ دیں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے (۲۹/۶۳)۔ سورۃ روم میں ہے فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ خدا جس لطیف انداز سے سامانِ نشوونما عطا کرتا ہے اسے سمجھنا ہو تو یہ دیکھو کہ زمینِ مُردہ کو کس طرح حیاتِ تازہ ملتی ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ بس اسی طرح وہ مردہ انسانوں کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۳۰/۵۰) یہ سب کچھ ان پیمانوں (قوانین) کے مطابق ہوتا رہتا ہے جنہیں اس نے اپنے اختیار و ارادہ سے وضع کر رکھا ہے۔ (نیز ۴۱/۳۹)۔ سورۃ قٓ میں اسی مثال کے بعد کہا کہ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۚ (۵۰/۱۱) اسی طرح مردہ انسان دوبارہ جی اٹھتے ہیں۔ ان کی زندگی کی صلاحیت ابھر کر باہر آجاتی ہے۔

سورۃ فاطر میں زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا ہو جانے کی مثال کے بعد کہا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵/۹)۔ اس لفظ (نشور) میں بجائے خویش حیاتِ نو کے لئے اسی طریقِ عمل کا مفہوم مضمر ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی، کسی چیز کے کھل جانے اور شاخ در شاخ ہو جانے کے ہیں۔ لیکن اس کا اطلاق، موسمِ بہار میں درختوں کے نئے نئے پتے لے آنے پر ہوتا ہے۔ اَلنَّشْرُ اس خشک گھاس کو بھی کہتے ہیں جو گرمی کے آخر میں بارش پڑنے سے دوبارہ اُگ آئے۔ نَشَرَتِ الْاَرْضُ نُشُوْرًا کے معنی ہیں، موسمِ بہار کے آنے سے زمین میں جان آگئی اور خوب پودے اُگے۔ سورۃ زخرف میں ہے کہ خدا ایک اندازے کے مطابق بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ (۴۳/۱۱) پھر اس سے زمینِ مردہ پر تازہ بہار آجاتی ہے۔ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ (۴۳/۱۱) اسی طرح، تمہاری

---

[1] (۷ — ۸/ ۲۶)؛ (۳۳/ ۳۶)۔

زندگی کی شاخِ خزاں دیدہ پر بھی بہارِ نَو گُل فشاں اور برگ ریز ہوسکتی ہے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے، حیاتِ نَو مردہ اقوام کو بھی حاصل ہوتی ہے جب نبیٔ اکرمؐ نے دعوتِ انقلاب عام کی تو مخالفینِ عرب اس کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جماعت مومنین کا دعوے تھا کہ فریقِ مخالف ان کے ہاتھوں شکست کھائے گا اور ان کی جماعت غالب رہیگی۔ مخالفین کو اپنی قوت اور شوکت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ جماعتِ مومنین کے اس دعوے کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ کمزوروں اور ناتوانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت' یہ مُردے' ہم پر کیسے غالب آسکیں گے۔ قرآنِ کریم نے اکثر مقامات پر ان کے اس طنز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں معلوم نہیں کہ خدا کا قانونِ حیات و ممات' کس طرح مُردوں کو حیاتِ نَو عطا کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ یہ لوگ ابھی کرلیں گے۔ سورۂ سجدہ میں پہلے کہا گیا کہ کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی قومیں' جو حق و صداقت کا مقابلہ کرتی تھیں' تباہ و برباد ہوگئیں (۳۲/۲۶)۔ اس کے بعد ہے کہ کیا یہ لوگ اس کا مشاہدہ نہیں کرتے کہ زمینِ مُردہ کو کس طرح حیاتِ تازہ مل جاتی ہے۔ اسی قانون کے مطابق اس جماعت میں توانائیاں اُبھر آئیں گی (۳۲/۲۷)۔ اس کے بعد ہے کہ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ان لوگوں کو یہ فتح کب نصیب ہوگی (۳۲/۲۸)۔ جواب میں کہا کہ ان سے کہو کہ وہ دن ضرور آئے گا اور اس دن ان کا پچھتانا کسی کام نہیں آسکے گا۔

ان آیات میں' کمزور و ناتواں جماعت کے غلبہ و نصرت کو حیاتِ نَو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ حیاتِ نَو تھی جس کی طرف رسول اللہ دعوت دیا کرتے تھے۔ سورۂ انفال میں ہے — اے جماعتِ مومنین! تم خدا اور رسولؐ کی اس دعوت پر لبیک کہو۔ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴) جب وہ رسول تمہیں اس پروگرام کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کردے گا۔ خود قرآنِ کریم کے متعلق کہا کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) "تم اس کے ذریعے انہی لوگوں کو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرسکتے ہو جن میں زندگی کی رمق ہو۔"

وہ لوگ جن میں فکر و تدبّر کی صلاحیتیں مفقود ہوچکی ہوں یا جو ان صلاحیتوں سے کام ہی نہ لینا چاہیں' انہیں بھی قرآنِ کریم نے مُردہ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝...... اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا..... (۲۷/۸۰) تو نہ مُردوں کو سنا سکتا ہے اور نہ ہی تو بہروں کو سنا سکتا ہے بالخصوص جب

وہ پیٹھ موڑ کر چل دیں۔ تو تو انہی لوگوں کو سنا سکتا ہے جو آیاتِ خداوندی پر ایمان لائیں۔ (نیز ۵۲-۵۳/۳۰)۔
اس قسم کے مُردوں کو زندگی ملنے سے مراد' ان کا راہِ ہدایت اختیار کر لینا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے عرض کیا تھا کہ وہ انہیں وہ طریقہ بتائے جس سے "مردہ" زندہ ہو سکتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اسی قسم کے "مردوں" کو حیاتِ نو عطا کرنا تھا (۲/۲۶۰) اور جب حضرت عیسٰیؑ نے کہا تھا کہ (اَنِّیْ) اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ (۳/۴۸) میں قانونِ خداوندی کے مطابق مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں' تو اس سے ان کی مراد بھی بنی اسرائیل جیسی مردہ قوم کو حیاتِ نو عطا کرنا تھا۔ اس قوم کو جب' بابل کی اسیری کے بعد دوبارہ وطن آنے کی اجازت ملی ہے اور اس طرح انہیں پھر سے اجتماعی زندگی نصیب ہوئی ہے' تو اسے بھی ان کی "موت کے بعد زندگی" سے تعبیر کیا گیا ہے (۲/۲۵۹)۔

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آتا ہے یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ (۱۰/۳۱ ؛ ۶/۹۶)۔ اس کا عام ترجمہ ہے کہ "خدا مردہ سے زندہ نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ"۔ سورۂ روم میں ان الفاظ کے بعد ہے وَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ (۳۰/۱۹) وہ زمینِ مردہ کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور اس طرح تمہیں نکال کھڑا کرے گا۔ ان الفاظ کا مفہوم یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ

(۱) ہر جاندار جسم میں یہ سلسلہ ہر آن جاری و ساری رہتا ہے کہ اس میں لاکھوں کی تعداد میں (CELLS) مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے جرثومے بنتے رہتے ہیں۔ یا

(۲) نباتات میں روئیدگی کا سلسلہ کہ (بظاہر) مردہ تخم سے ترو تازہ فصلیں لہلہاتی ہیں اور پھر ان فصلوں سے اس قسم کے خشک دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا

(۳) زندہ قوموں کا زوال پذیر ہو جانا اور پامال شدہ قوموں میں از سرِ نو حیاتِ تازہ کی نمود ہو جانا یا

(۴) زندہ انسانوں کا مر جانا ــــ اور مُردوں کا پھر جی اٹھنا۔

سلسلہ موت و حیات

موت و حیات کا یہ سلسلہ خدا کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم میں متعدد

مقامات میں آیا ہے کہ وَ اللّٰہُ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ (۳/۱۵۵) وہی زندگی عطا کرتا ہے، وہی مارتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ هُوَ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (۱۰/۵۶)۔ (اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ. خدا کی طرف "جانے" کا مفہوم پہلے بیان ہوچکا ہے)۔ (یہی مضمون ان مزید آیات میں بھی آیا ہے (۲۲/۶؛ ۲۳/۸۰؛ ۲۶/۱۲؛ ۴۰/۶۸؛ ۴۲/۹؛ ۴۴/۸؛ ۵۰/۴۳؛ ۵۷/۲)۔ سورۂ روم میں ہے کہ اللہ نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر وہ تمہیں سامانِ زیست عطا کرتا ہے۔ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ (۳۰/۴۰) پھر وہ تم پر موت وارد کرتا ہے اور اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے معبودانِ باطل میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے؟ سورۂ جاثیہ میں ہے کہ خدا تمہیں زندگی عطا کرتا ہے اور پھر اس کے قانونِ طبیعی کے مطابق تم مرجاتے ہو۔ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ (۴۵/۲۶) پھر وہ تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ ("قیامت میں جمع کرنے کا" مفہوم پہلے بیان ہوچکا ہے)۔

موت ہر ایک کے لئے ہے

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں یہ بھی آیا ہے کہ موت ہر ایک کے لئے ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴)[۱]۔ خواہ کوئی شخص محکم قلعوں کے اندر بھی مستور و محصور کیوں نہ ہو، موت اسے وہاں بھی آدبوچے گی (۴/۷۸)؛ (۶۲/۸)۔ خود رسول اللہ کے متعلق کہا کہ اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ○ ($\frac{39}{31}$)۔ "تونے بھی مرنا ہے انہوں نے بھی مرنا ہے۔" سورۂ بقرہ میں ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ تم پھر مر جاؤ گے اور اس کے بعد تمہیں پھر زندگی ملیگی (۲/۲۸)۔ انہی کو سورۂ مومن میں "دو موتیں اور دو زندگیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے (۴۰/۱۱)۔

موت، خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق واقع ہوتی ہے اور جو امور قوانینِ طبیعی یا قوانینِ فطرت کے مطابق سرانجام پاتے ہیں انہیں قرآنی اصطلاح میں ملائکہ کی کارفرمائی قرار دیا جاتا ہے اسی لئے موت کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ یہ ملائکہ کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہے اور سکراتِ موت کے وقت مرنے والے پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اور جس طرح اس کی عمر گذشتہ کے تمام ایسے واقعات جنہوں نے اس کے شعور اور

---

[۱] نیز (۲۱/۳۵)؛ (۲۹/۵۷)۔

غیر شعور پر گہرے نقوش چھوڑے ہوں، سینما کی فلم کی طرح اس کے حافظہ کے قرطاس پر نمودار ہو جاتے ہیں. قرآن نے انہیں (محسوس طور پر سمجھانے کی غرض سے) ملائکہ کی گفتگو سے تعبیر کیا ہے. (مثلاً ۶/۹۴؛ ۷/۳۷؛ ۱۶/۲۸؛ ۳۲/۱۱؛ ۵۰/۱۹). کہیں اس تلخ یادداحساس زیاں کو عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے (۸/۵۰؛ ۴۷/۲۷)۔ ان کے برعکس، مومنین کی موت ہے جس میں انہیں موجودہ زندگی سے کہیں زیادہ خوشگوار اور پُر آسائش زندگی کی خوشخبریاں ملتی ہیں اس لئے وہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہیں (۱۶/۳۲)۔

زمین کے متعلق کہا ہے کہ اس میں انسانوں کے لئے جائے قرار (ٹھہرنے کی جگہ) ہے، لیکن ایک مدت معینہ کے لئے. ہمیشہ کے لئے نہیں. وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (۲/۳۶)؛ (۷/۲۴) "تمہارے لئے اس میں جائے قرار ہے اور ایک مدت تک کے لئے سامانِ زیست. دوسری جگہ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ کہا (۶/۹۸)؛ (۱۱/۶) یعنی زمین میں تمہارا عارضی مستقر ہے اور اس کے بعد یہی مستقر تمہیں، زندگی کے اگلے مرحلے کی سپردگی میں دے دیتا ہے (مُسْتَوْدَعٌ سے یہی مفہوم ہے)۔

چونکہ موت کے بعد انسانی جسم، منتشر ہو کر کسی نہ کسی شکل میں کرۂ ارض کے مادی اجزاء میں مل جاتا ہے (خواہ وہ دفن کرنے کے بعد ہو، جلانے کے بعد یا لاش کے ویسے ہی بوسیدہ ہو جانے کے بعد) اس لئے قرآن نے اکثر مقامات پر اسے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝ (۷/۲۵) تم اس زمین پر زندگی بسر کرو گے. اسی میں تمہیں موت آئے گی اور اسی سے تم پھر حیاتِ نَو حاصل کر کے نکالے جاؤ گے. (اس نکتہ کی وضاحت آگے چل کر آئے گی)۔

چودھواں باب

مُردوں کا زندہ ہونا

اب ہم اس موضوع کے اس گوشے تک آ پہنچے جس کا تعلق ایک فرد کی طبیعی موت کے بعد اس کے دوبارہ زندہ ہونے سے ہے. اسے حَیَاتِ بَعْدَ الْمَمَاتْ یاحیاتِ آخرت کہتے ہیں. یہ اس بحث کا نازک ترین گوشہ ہے. اس کے لئے پہلے انسان کی موجودہ زندگی کے متعلق کچھ سمجھ لینا ضروری ہے.

انسانی پیدائش

قرآنِ کریم میں ہے.

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝ (۷۶/۱).

کیا انسان پر ایک ایسا وقت نہیں گذرا جب یہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟

پھر وہ ہمیں بتاتا ہے کہ

(۱) انسانی تخلیق کی ابتدا "مٹی" (بے جان مادہ) سے ہوئی (۳۲/۷). لیکن بے جان مادہ (INORGANIC MATTER) میں تو زندگی کے آثار نہیں ہوتے، زندگی کا مدار پانی پر ہے. اس لئے کہا کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَىٍّ (۲۱/۳۰) ہم نے پانی سے ہر شے میں زندگی کی نمود پیدا کی. لہٰذا، زندگی کی ابتدا طین لازب — (پانی کے ساتھ ملی ہوئی چپچپی مٹی) سے

ہوئی (۱۱/۳۷)۔ یہ وہی مٹی ہے جو جوہڑوں کے کنارے جمی ہوئی سیاہ رنگ کا کیچڑ ہوتی ہے اور سوکھ کر کھنکنے لگ جاتی ہے (۱۵/۲۶)۔

(۲) اس طرح پانی اور مٹی کے ملنے سے، زندگی کا اوّلیں جرثومہ (LIFE CELL) وجود میں آیا جہاں سے زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی، شاخ در شاخ، آگے بڑھتی اور پیکر بدلتی چلی گئی زندگی کے اس اوّلیں جرثومہ کو اس نے "نفسِ واحدہ" کہہ کر پکارا ہے اس لئے کہ (UNI-CELLULAR) ہوتا ہے۔ اس میں ہنوز نر اور مادہ کی تفریق نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے جہاں کہا ہے کہ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۶/۹۹)، تو اس سے مراد زندگی کا یہی اوّلیں جرثومہ ہے۔

(۳) اس طرح زندگی، ارض (بے جان مادہ) سے اُگی اور اس کی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیل گئیں۔ ان میں سے ایک شاخ وہ تھی جس میں زندگی بذریعہ توالد و تناسُل (نطفہ کے ذریعہ) آگے بڑھتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۷۱/۱۷)۔ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ (۳۶/۷۷)۔ اس مقام تک، عام حیوانات اور انسان کی پیدائش کے مراحل مشترک ہیں۔ حتّٰی کہ انسانی بچہ بھی رحمِ مادر میں انہی مراحل میں سے گزرتا ہے جن میں سے دیگر حیوانات کے جنین گزرتے ہیں۔ اس کے بعد، انسان میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا ہوتی ہے جو اسے دیگر حیوانات سے منفرد کر دیتی ہے۔ یہ مقام بڑا غور طلب ہے کیونکہ یہی درحقیقت وہ مقام ہے جہاں سے قرآن کا عطا کردہ تصوّرِ حیات مادہ پرست مغرب کے تصوّرِ حیات سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سجدہ کی یہ آیات بڑی غور طلب ہیں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۳۲/۵) خدا کے عالمِ مشیّت میں ایک اسکیم طے پاتی ہے۔ اس کے بعد اُسے عملاً متشکّل کرنے کے لئے وہ اس کا آغاز زمین سے کرتا ہے۔ اس طرح اس اسکیم کا گویا بیج بویا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، بتدریج اپنے مقامِ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ وہ ان مراحل کو "خدا کے ایک ایک دن" میں طے کرتی ہے اور خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب اور شمار سے ہزار ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اسکیم ہزارہا سال کے عرصہ میں، اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسی اسکیم کی ایک کڑی انسانی تخلیق ہے وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ

مِنْ طِيْنٍ ۚ (۳۲/۷) تخلیقِ انسانی کی ابتدا بے جان مادہ سے ہوئی۔ اور اس طرح زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی حیوانی سطح پر آگئی جہاں جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ (۳۲/۸) انسان کی پیدائش بذریعہ تولید قرار پائی۔ یہاں تک انسان اور حیوانات کے سلسلہ تخلیق میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں ایک ہی مراحل سے گزر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد انسانی سلسلہ، حیوانی سلسلہ سے الگ ہو گیا اور وہ اس طرح کہ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹) خدا نے انسان میں ایک خاص اعتدال پیدا کر کے اس میں اپنی روح کا ایک شمہ ڈال دیا۔ یہ ہے انسان کا مابہ الامتیاز درجہ۔ یعنی اس میں الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) کا ایک شمہ آگیا۔ یہی وہ شے ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ صاحبِ اختیار و ارادہ انسان بن گیا۔ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ (۳۲/۹) اسے سماعت و بصارت (یعنی ذرائع علم) عطا کئے گئے اور اس کے ساتھ ہی فؤاد (MIND) بھی جس سے یہ فیصلے کرنے کے قابل ہو گیا۔ اور جب یہ خود فیصلے کرنے کے قابل ہو گیا تو اس پر اس کے اعمال کی ذمہ داری بھی عائد ہو گئی۔ ان آیات میں پہلے انسان کا ذکر غائب کے صیغہ (3RD PERSON) میں ہوتا چلا آرہا تھا لیکن اس "نفخ روح" کے بعد اسے مخاطب کے صیغے (2ND PERSON) ـــ لَكُمُ ـــ سے پکارا گیا۔ "تم" اسے ہی کہا جا سکتا ہے جو اپنے آپ کو "میں" کہہ سکے اور یہ انسان کی "میں" (1-AM-NESS) ہی ہے جو اسے منفرد حیثیت (INDIVIDUALITY) عطا کرتی ہے[1]۔

سورۂ مومنون میں، انسانی جنین کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (۲۳/۱۴) پھر ہم نے اسے ایک ایسی تخلیق عطا کی جو اس سلسلہ کی پہلی

---

[1] اس مقام پر ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ عصرِ حاضر کے مفکرین اور سائنسدان کس طرح اس کے معترف ہیں کہ انسان صرف اس کے جسم کا نام نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر میں نے اپنی کتاب "اسلام کیا ہے؟" میں تفصیلی گفتگو کی ہے یہاں صرف قرآن کی بیان کردہ تصریحات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کڑیوں سے بالکل مختلف تھی۔ یہ (انسانی ذات) نہ جسم کا حصہ ہوتی ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین کے تابع۔ اس لئے موت انسان کے جسم پر وارد ہوتی ہے اس کی ذات پر نہیں۔ اس لئے یہ جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے۔ اس کی بقا کا نام حیات بعد الممات ہے۔

انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے لیکن یہ ہوتی ہے غیر نشوونما یافتہ شکل (UN-DEVELOPED FORM) میں۔ انسان کے صحیح اعمال سے (جنہیں قرآن اعمالِ صالح کہہ کر پکارتا ہے) اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، اس میں اس طرح ارتکاز (CRYSTALLISATION) پیدا ہو جاتا ہے۔ سورۂ نوح میں ہے۔ وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۷۱/۱۴) خدا نے تمہیں مختلف مراحل میں سے گزار کر بتدریج پیکرِ انسانی تک پہنچایا ہے۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ (۷۱/۱۳) اب تمہیں یہ چاہیئے کہ خدا سے یہ چاہو کہ تمہاری ذات میں ایک "وقار" (ٹھیراؤ) پیدا ہو جائے۔ یہ اپنے مقام پر "بخود خزیدہ و محکم چوں کوہ ساراں" ہو جائے۔ اس میں استحکام (STABILITY) آ جائے۔ اسی کو حیاتِ جاوید (IMMORALITY) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے انسان کی موجودہ ہیئت، اس کے سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی نہیں۔ زندگی کی موجودہ سطح پر ارتقار کی سابقہ کڑیوں کے بعد، سلسلۂ جدید کی نئی کڑی کی نمود ہوئی ہے۔ اب جسم کی موت کے بعد، اس نئے سلسلہ کا ارتقا شروع ہوگا۔ اسے اُخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (۸۴/۱۹) تم درجہ بدرجہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔ دوسری جگہ اسے آغاز کے بعد گردشیں دیتے ہوئے آگے لے جانے سے تعبیر کیا گیا ہے (وَ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ (۸۵/۱۳)۔ لیکن انسانی زندگی کی یہ گردشیں، اس زمین پر نہیں ہوتیں۔ یعنی انسان، مرنے کے بعد دوبارہ اس زمین پر زندہ نہیں ہوتا۔ یہ یونانیوں (اور ان سے مستعار لے کر ہندوؤں) کا فلسفۂ تناسخ ہے جس کی رو سے وہ مانتے ہیں کہ موت کے بعد انسانی روح پھر اس دنیا میں، ایک نئے پیکر میں جنم لیتی ہے۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد، انسان اس دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتا۔ سورۂ مومنون میں ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ

اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ (۹۹—۱۰۰/۲۳)

تا آنکہ جب ان لوگوں کے سرہانے (جو غلط راستے پر چلتے تھے) موت آ کھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ لے میرے پروردگار! اگر تو مجھے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دے تو میں بہت اچھے اچھے کام کروں۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیری آرزوئے خام ہے۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ ان مرنے والوں کے پیچھے قیامت تک پردہ حائل ہے۔ اب یہ پیچھے نہیں جاسکتے۔

سورۂ شعراء میں ہے کہ اہلِ جہنم قیامت میں کہیں گے کہ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۲۶/۱۰۲) ہم کہیں ایک بار پھر دنیا کی طرف لوٹ سکیں تو ہم بھی ایمان والوں میں سے ہو کر بتائیں! (نیز ۵۸/۳۹؛ ۵۳/۷)۔ وقت کا دھارا پیچھے کی طرف مڑا ہی نہیں کرتا۔ یہ یا تو ایک مقام پر رُک جاتا ہے (جیسے جسم کی موت کے سلسلہ میں) اور یا آگے بڑھتا ہے۔ (انسانی ذات کے اس دنیاوی زندگی سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں) اقبالؒ کے الفاظ میں

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

انسانی ذات کی بیداری کا نام خود آگہی یا شعورِ خویش (SELF-CONSCIOUSNESS) ہے۔ یہی شعورِ خویش، مرنے کے بعد آگے چلتا ہے۔ سورۂ زمر میں اسے بڑے لطیف انداز سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا موت اور نیند دونوں حالتوں میں خدا تمہاری ذات (شعورِ خویش) کو معطل کر دیتا ہے۔ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ موت کی صورت میں اسے وہیں روک لیتا ہے، واپس نہیں آنے دیتا۔ لیکن نیند کی صورت میں اسے (بیداری کے وقت) واپس بھیج دیتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۳۹/۴۲) اس میں، ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں، حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ اسی شعورِ خویش کی بیداری سے انسان، انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ باقی نہ رہے تو انسان، حیوانات کی

سطح پر زندگی بسر کرتا ہے اور یہ شرفِ انسانیت کی انتہائی تذلیل، فلہٰذا ذی احساس انسان کے لئے شدید ترین الم انگیز عذاب ہے۔ اسی لئے جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا کہ وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ (۵۹/۱۹) دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے "خدا کو بھلا دیا" تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے آپ ہی کو فراموش کر بیٹھے۔ ان میں احساسِ ذات ہی مٹ گیا۔ وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ گئے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے کہ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں ان کی زندگی بس حیوانی سطح کی رہ جاتی ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زیست سے متمتع ہوتے ہیں۔

حیاتِ اُخروی کے منکرین کی عام دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جسم مرنے کے بعد گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ وہ مختلف عناصر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنے مادی مشتقات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس لئے انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (ان منکرین کے مختلف اعتراضات کا تفصیلی تذکرہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا)۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْھُمْ۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کا کونسا حصہ ہے جسے زمین کم کر دیتی ہے (اور کیا چیز باقی رہ جاتی ہے)۔ وَ عِنْدَنَا کِتٰبٌ حَفِیْظٌ ۝ (۵۰/۴) ہمارے پاس ایک قانون ایسا بھی ہے جو اس کے باقی رہنے والے حصے کو محفوظ کر لیتا ہے۔

اس محفوظ شدہ "شے" (انسانی ذات) کی تخلیقِ نو کس طرح ہو گی۔ اس کا پیکر کس قسم کا ہو گا۔ اس کی کیفیت کیا ہو گی۔ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہمارا احیطۂ ادراک تو محسوسات تک محدود ہے اور وہ زندگی اِس محسوس دنیا کی زندگی نہیں ہو گی۔ اس لئے ہم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن قرآنِ کریم نے (بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ وہ اس زندگی سے بالکل مختلف انداز کی ہو گی) اسے سمجھایا ہے موجودہ زندگی کی تشبیہات اور تمثیلات کی رُو سے۔ اس کے سوا، ہمارے لئے سمجھنے کا اور کوئی طریق ہو نہیں سکتا تھا۔ مثلاً عام انسان دیکھتے ہیں کہ انسانی لاش کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ تو قرآنِ کریم نے حیاتِ نو کو اس طرح سمجھایا جیسے وہ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ (مثلاً) بنی آدم کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ فِیْھَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْھَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْھَا

تُخْرَجُوْنَ ۝ (۷/۲۵) تمہیں اس زمین پر رہنا ہے، اسی میں مرنا ہے اور اس سے تمہیں پھر نکال کر کھڑا کیا جائے گا۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ (۲۰/۵۵) تمہیں ہم نے زمین سے پیدا کیا، اسی میں ہم تمہیں لوٹا دیں گے اور پھر اسی سے تمہاری تخلیقِ نو ہوگی۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ انسان کا پتلا بنا بنایا زمین سے باہر نہیں آگیا تھا۔ "زمین سے پیدا کرنے" سے مراد زندگی کا آغاز تھا۔ سو موت کے بعد، زمین سے بارِ دیگر پیدا کرنے سے بھی مراد یہ نہیں کہ قبروں سے انسانی جسم زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اس سے تجدیدِ حیات مقصود ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ (۷۱/۱۸-۱۷) خدا نے تمہیں زمین سے نباتات کی طرح اگایا۔ پھر تمہیں اسی میں لوٹا دیتا ہے اور پھر تمہیں دوبارہ نکالے گا۔ ایک (جدید انداز) کا نکالنا۔ کہیں کہا ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ ۝ (۲۲/۷) خدا انہیں کھڑا کرے گا جو قبروں میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ قبروں میں سے مردوں کو اٹھا کھڑا کرے گا، اس لئے کہ ایسی صورت میں ان مردوں کا کیا ہوگا جو قبروں میں دفن نہیں کئے جاتے ——— جلا دیئے جاتے ہیں۔ پانی میں بہا دیئے جاتے ہیں۔ یونہی پھینک دیئے جاتے ہیں۔ بجلی کی رَو سے راکھ بنا دیئے جاتے ہیں۔ مقصد اس سے بھی محض سمجھانا ہے۔ بعض مقامات پر قبور کے بجائے اَجداث کہا گیا ہے۔ (مثلاً ۳۶/۵۱؛ ۵۴/۷؛ ۷۰/۴۳)۔ سورۂ یٰسٓ میں مَرْقَد بھی کہا گیا ہے جس کے معنی خوابگاہ کے ہوتے ہیں (۳۶/۵۲)۔ کہیں کہا ہے کہ وہ تمہیں آواز دے کر بلائے گا اور تم زمین سے نکل کھڑے ہو گے (۳۰/۲۵)۔ ان لوگوں کے اعتراض میں (جو کہتے ہیں کہ جب جسمِ انسانی ریزہ ریزہ ہو جائے تو پھر انسان کس طرح دوبارہ زندہ ہو سکے گا) کہا کہ ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کی پور پور کو درست کر دیں (۷۵/۴)۔ یعنی ان تمام قوتوں میں از سرِ نو اعتدال پیدا کر دیں جن سے یہ اپنے امور پر گرفت کر سکتا تھا۔

لیکن ان محسوس مثالوں سے بات سمجھانے کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اُس زندگی میں یہ انسانی پیکر نہیں ہوگا۔ وہ اس قسم کی تخلیق (نشاۃ ثانیہ) ہوگی جسے تم اس وقت سمجھ نہیں سکتے کہا کہ ہم اس پر قادر ہیں۔

عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۵۶/۶۱-۶۰)

کہ تمہارے پیکروں کو بدل دیں اور تمہیں ایسی کیفیت کے ساتھ زندہ کریں جسے تم اس وقت سمجھ نہیں سکتے۔

سورۂ لقمان میں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیف اشارہ ملتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی تخلیق کی ابتدا کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اسے "نفسِ واحدہ" سے پیدا کیا۔ یعنی بے جان مادہ کے ساتھ پانی کی آمیزش سے زندگی کا پہلا جرثومہ ظہور میں آگیا۔ ظاہر ہے یہ جرثومہ اس آب و گل کے امتزاج ہی سے ظہور میں آیا تھا لیکن ان خصوصیات کا حامل تھا جو نہ آب میں تھیں نہ گل میں۔ یہ تخلیق نو ان سے یکسر مختلف تھی اس حقیقت کو سامنے لاتے ہوئے کہا کہ

مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸)

تمہاری (اوّلیں) تخلیق اور دوبارہ بعثت "نفسِ واحدہ" کی طرح ہے۔

جس طرح وہ اوّلیں جرثومہ حیات، اپنے غیر ذی حیات ذرائع کو پیچھے چھوڑ کر ایک جدید کیفیت کا حامل بن گیا تھا، اسی طرح انسانی ذات، اپنے موجودہ خاکی پیکر (یا مرکب) کو پیچھے چھوڑ کر سفرِ حیات کی ایک ایسی وادی میں داخل ہو جائے گی جس کا ہم اس وقت تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔

یہ جسمانی پیکر تو بدل جائے گا لیکن ہر فرد کا شعورِ خویش بدستور باقی رہے گا۔ اس لئے کہ شعورِ خویش کی حامل ذات، اس جسم کی کینچلی کو اتار کر آگے نکل جائے گی۔ انسان اپنی انفرادیت لئے آگے جائے گا۔

سورۂ انعام میں ہے۔

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ (۶/۵۵)

ہم نے جس طرح تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، تم اسی طرح اپنی انفرادیت لئے ہمارے پاس آؤ گے اور جو اضافی چیزیں تمہیں ملی تھیں ان سب کو پیچھے چھوڑ دو گے۔

دوسری جگہ ہے۔ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا (۱۹/۸۰ ؛ ۱۹/۹۵) تم اپنی انفرادیت کے ساتھ ہمارے پاس آؤ گے۔ انسان کا "اعمال نامہ" جو زندگی بھر ایک لپٹی ہوئی کتاب کی طرح تھا کھل کر سامنے آجائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ۔ تو اپنے اعمال نامہ کو آپ پڑھ۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ (۱۷/۱۴) آج تو اپنا محاسبہ کرنے کے لئے آپ کافی ہے۔ اس وقت انسان اپنے خلاف آپ

گواہی دے گا (۷/۲۴)۔ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ (۷۵/۱۴) وہ اپنے خلاف آپ صحیح صحیح بات بیان کر دے گا۔ سورۂ نحل میں ہے کہ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا (۱۶/۱۱۱) اس دن ہر شخص خود اپنے خلاف آپ جھگڑا کرے گا۔ اس دنیاوی زندگی میں اس کی مفاد پرستی نے جن کاموں کو بڑا مزین کر کے دکھایا تھا، وہ پکار اٹھے گا کہ وہ غلط تھے۔ سورۂ قٓ میں ہے کہ اس سے کہا جائیگا کہ فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ (۵۰/۲۲) اس وقت تیری آنکھوں پر پردے پڑے رہنے تھے جس کی وجہ سے تو حقیقت کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ آج وہ پردے اٹھ چکے ہیں اور تیری نگاہ اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ وہ ہر شے کے آر پار ہو سکتی ہے۔ اب کوئی بات تجھ سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (۸۶/۹) اس دن ہر راز افشا ہو جائے گا۔ جن لوگوں سے چھپا کر یہ کچھ کیا تھا وہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ (۱۰/۴۵) اور ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ جن غلط صلاح کار دوستوں کے بہکاوے میں آکر اس نے تخریبی کام کئے تھے، ان کے متعلق وہ کہے گا کہ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۝ (۲۵/۲۸) اے کاش! میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ جو منافقین یہاں اپنے رفقار کو دھوکے دیتے تھے، وہ ان کے سامنے ہوں گے۔ ان کی اصل حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔ وہ دوزخ میں ہوں گے اور مخلص مومنین جنت میں اور ان دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل ہو گی جس میں ایک دروازہ بھی ہو گا (۵۷/۱۳)۔ وہاں فریب کار مذہبی پیشواؤں اور ان کے سادہ لوح متبعین میں سخت کلامی ہو گی (۳۷/۲۲ ـ ۲۱)۔ لیڈروں میں اور عوام میں، جنہیں وہ اپنا آلۂ کار بنایا کرتے تھے، تو تکار ہو گی۔ اس کا ذکر قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً ۱۴/۲۱؛ ۴۸ ـ ۴۷/۳۳؛ ۳۳ ـ ۳۲/۳۴؛ ۳۸/۶۰؛ ۴۹ ـ ۴۷/۴۰)۔ اسی طرح مختلف جماعتیں جہنم میں ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گی اور کہیں گی انہوں نے انہیں گمراہ کیا تھا (۳۹-۷/۳۸)۔ اس وقت جو عذاب میں مبتلا ہوں گے (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) وہ باصد حسرت ویاس پکار اٹھیں گے کہ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا (۷۸/۴۰) اے کاش! میں انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودا ہوتا تو اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا۔

اس پہچان کی شکل کیا ہو گی۔ اس گفتگو کی صورت کیا ہو گی۔ اس کی کنہ و حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جس میں کسی قسم کے

شک وشُبہ کی گنجائش نہیں۔ اس زندگی پر ایمان' مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے اور یہ قانون مکافاتِ عمل پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآنِ کریم اس نقطۂ نگاہ سے بھی اس حقیقت کو سامنے لایا ہے۔

اخلاقی نقطۂ نگاہ سے تبیانِ حقیقت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' انسانی ذات اور حیات بعد الممات کی ساری بحث' قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ چونکہ ان نظریات کے بغیر قانونِ مکافاتِ عمل کا عقیدہ ناقابلِ تسلیم رہ جاتا ہے اس لئے ان نظریات کو "بطور دلیل" وضع کر لیا گیا ہے۔ "صورت یہ نہیں۔ خدا نے کائنات اور خود انسان کی تخلیق اس طرح سے کی ہے کہ اس میں قانونِ مکافاتِ عمل' انسانی ذات' حیات بعد الممات کے تصورات بطور حقیقت سامنے آجاتے ہیں۔ اگر یہ سلسلۂ تخلیق محض ہنگامی طور پر' بطور ایک حادثہ (ACCIDENTALLY) وجود میں آگیا ہوتا تو پھر یہ تمام تصورات بے بنیاد رہ جاتے۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ کائنات اور انسان کی تخلیق ایک عظیم مقصد کے مطابق وجود میں آئی ہے۔ یہ یونہی کھیل تماشے کے طور پر عمل میں نہیں لائی گئی۔ سورۂ دخان میں ہے۔ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ○ ہم نے اس کارگہ کائنات کو یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کر دیا۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (۳۸-۳۹/۴۴) انہیں بالحق پیدا کیا گیا ہے لیکن اکثر لوگ علم وبصیرت سے کام لے کر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ مقصدِ تخلیقِ کائنات کے متعلق کہا۔

> وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ○ (۴۵/۲۲)۔
>
> خدا نے سلسلۂ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر ظلم وزیادتی نہ ہو۔

خود انسان کے متعلق کہا کہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ○ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بلا مقصد (عبث) پیدا کر دیا ہے اور تم اپنے اعمال کے لئے ہمارے سامنے جواب دہ نہیں ہو"؟ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ (۲۳/۱۱۶) خدا جو مبنی برحقیقت قوت

واقتدار کا مالک ہے اس سے بلند ہے کہ اس کے متعلق اس قسم کا تصور قائم کیا جائے کہ وہ یونہی بلا مقصد اس قسم کے کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ (۷۵/۳۶) کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے بلا کسی منزل و مقصد اور غرض و غایت، شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس قسم کا تصور باطل ہے۔ کاروانِ زندگی بے منزل نہیں۔ انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اس کی زندگی کا ایک ایک سانس یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی طرف جا رہا ہے یا اس سے دُور ہٹ رہا ہے۔ اسے ہنوز بہت سے ارتقائی منازل طے کرنے ہیں اور سطحِ ارض پر اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی اس طرح نشوونما کرے کہ وہ اس کی طبیعی موت کے بعد آگے بڑھنے اور بلند ہونے کے قابل ہو جائے۔ موت درحقیقت اس امر کا (TEST) ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (۶۷/۲) موت اور حیات کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تمہیں حسنِ عمل کے مواقع میسّر ہوں۔ اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ (۱۰/۴) وہ (خدا) تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اسے گردش دیتا ہے تاکہ جو لوگ زندگی کے حقائق پر یقین رکھ کر صلاحیت بخش کام کرتے ہیں، انہیں اپنے اعمال کا عدل و انصاف کے ساتھ بدلہ مل جائے۔ حیات بعد الممات، اسی مقصد کو پورا کرنے کی اگلی کڑی ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ (۵۶/۹۵) اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

حیات بعد الممات سے انکار کرنے والے

چونکہ حیات بعد الممات دین کی بنیاد اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کے پروگرام کی لاینفک کڑی ہے اس لئے جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں، قرآنِ کریم نے ان کا بار بار ذکر کیا ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کو سامنے لایا جائے، ایک وضاحت ضروری ہے۔ میری اس تصنیف کا مقصد یہ نہیں کہ جو لوگ خدا، وحی، انسانی ذات، حیات بعد الممات وغیرہ کے قائل نہیں، انہیں ان کا قائل کرایا جائے اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اس تصنیف سے مقصد، ان حقائق کے متعلق قرآنی تصریحات کو پیش کرنا

ہے۔ اس لئے ان تمام مباحث میں دائرۂ سخن کو اسی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔ ورنہ ہمارے زمانہ میں اس مسئلہ (حیات بعد الممات) پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اگر ہم اسے زیر بحث لاتے تو وہ بجائے خویش ایک مستقل تصنیف بن جاتی۔ اس مقام پر صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ عصر حاضر میں علم النفس نے جس حد تک تحقیق کی ہے اس کی رُو سے وہ اگرچہ حیاتِ جاوید (IMMORTALITY) کے متعلق حتم و یقین سے کچھ نہیں کہتے، لیکن حیات بعد الممات (SURVIVAL AFTER DEATH) کے امکان سے انکار نہیں کرتے اور ان کی اتنی تحقیق بھی مادی نظریہ حیات کی تغلیط کے لئے کافی ہے۔

قرآنِ کریم اس حقیقت کے مخالفین کی ایک ذہنیت کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے اور وہ یہ کہ حیات بعد الممات کو تسلیم کرنے کے لئے ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ "تم مُردوں کو زندہ کرکے دکھاؤ" اور یہی ان کی جہالت ہے۔ جو چیز (انسانی ذات) مرنے کے بعد باقی رہتی ہے۔ اسے تو کسی زندہ انسان کے اندر بھی طبیعی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا چہ جائیکہ اسے مردوں میں محسوس طور پر دکھایا جا سکے۔ اسے صرف عقل و فکر کی رُو سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ وہ اس قسم کے معترضین کے متعلق کہتا ہے کہ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ وہ صرف اس محسوس دنیا کو جانتے ہیں وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (۳۰/۷) اور مستقبل کی زندگی سے وہ نا آشنا رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (۳۰/۸) کیا یہ لوگ اپنی ذات کے متعلق غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اس نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ جس طرح یہ لوگ دنیا میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اسی طرح آخرت کے متعلق بھی فکر و تدبر سے کام لیں تو حقیقت ان پر واضح ہو جائے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ (۲/۲۱۹) "اس طرح ہم اپنی آیات کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔" یعنی معترضین حیات بعد الممات کو اپنی محسوس آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اور قرآنِ کریم انہیں دیدہ بصیرت سے دیکھنے کی دعوت دیتا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ

ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ (۱۳/۵)

کیا جب ہم مر مرا کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمیں
ایک نئی زندگی ملے گی؟

سورۂ اسرائیل میں ہے۔

وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا (۱۷/۴۹)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہمارا صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ جائے گا اور سارا جسم ریزہ ریزہ ہو جائے گا تو کیا ہمیں پھر ایک نئی زندگی ملے گی![1]

اس کے جواب میں کہا۔

قُلْ کُوْنُوْا حِجَارَۃً اَوْ حَدِیْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَکْبُرُ فِیْ صُدُوْرِکُمْ ۚ (۱۷/۵۱—۵۰)

ان سے کہو کہ (ہڈیوں کا ڈھانچہ تو ایک طرف) اگر تم پتھر یا لوہا بھی بن جاؤ یا کسی اور ایسی شے میں تبدیل ہو جاؤ جس کے متعلق تمہیں خیال ہو کہ اس میں زندگی کی نمود قطعاً نہیں ہو سکتی، تو تم پھر بھی زندہ کئے جاؤ گے۔

سورۂ حج میں کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں شبہ ہو کہ ہمیں مرنے کے بعد زندگی کس طرح مل سکتی ہے تو تم اپنی موجودہ ہستی پر غور کرو۔ تم کچھ بھی نہیں تھے۔ پھر تمہاری زندگی کا آغاز تراب (بے جان مادہ سے) ہوا۔ تمہاری یہ زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی تک پہنچ گئی۔ پھر تمہارے جسم پر طبیعی اضمحلال طاری ہو جاتا ہے تو اس کی مشینری گھس گھس ختم ہو جاتی ہے۔ تم غور کرو کہ جب زندگی کا آغاز بے جان مادہ سے ہو سکتا ہے تو حیاتِ نو اسی طرح وجود میں کیوں نہیں آ سکتی؟ (۲۲/۸) موجودہ زندگی کو چونکہ تم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہو اس لئے اس پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا۔ اگر یہ زندگی تمہارے سامنے نہ ہوتی اور کوئی اس کا ذکر تم سے کرتا، تو تم اس کے امکان پر بھی اسی طرح متعجب ہوتے اور اس سے انکار کر دیتے۔ تو یہ تو کوئی معقول روش نہ ہوئی کہ ایک ہی قانون (طریقِ کار) کے محسوس نتیجہ کو تو برحق تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کے اسی قسم کے دوسرے نتیجے سے محض اس لئے انکار کر دیا جائے کہ وہ محسوس طور پر تمہارے سامنے نہیں آیا!

سورۂ یٰسٓ میں ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ ھِیَ رَمِیْمٌ ۚ (۳۶/۷۸)

---

[1] نیز دیکھئے۔ (۱۷/۹۸؛ ۱۹/۶۶؛ ۲۳/۳۷—۳۵؛ ۲۳/۸۲؛ ۳۲/۱۰؛ ۳۴/۷؛ ۳۶/۱۹؛ ۳۷—۴۷؛ ۵۶/۴۷؛ ۴۲/۴؛ ۵۰/۴—۳؛ ۷۵/۴۰؛ ۷۹/۱۱)۔

جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہوجائیں گی تو ہمیں پھر کون زندہ کرے گا. جواب میں کہا کہ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۳۶/۷۹) خدا کے جس قانونِ تخلیق کی رُو سے یہ ہڈیاں پہلی بار زندہ دائمی انسان بن گئی تھیں، اسی قانون کے مطابق انسان کو دوبارہ زندگی عطا ہوجائے گی۔ اب تو پھر بھی (جیسا کہ تم کہتے ہو) اس کی ہڈیاں موجود ہوں گی، پہلی مرتبہ کی تخلیق کے وقت تو کچھ بھی موجود نہیں تھا اور پھر بھی یہ ایک زندہ انسان بن گیا؟ اس لئے (اس دلیل کی بنا پر) حیاتِ نو سے انکار کی کونسی وجہ ہوسکتی ہے؟

سورۂ دخان میں ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ ہم تمہارے اس دعوے کو (کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوتا ہے) اس صورت میں صحیح تسلیم کریں گے کہ تم ہمارے مردہ آباؤ اجداد کو دوبارہ لاکر بتاؤ (۴۴/۳۶)۔

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ (۴۵/۲۴)۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے. ہمارے سامنے بچے پیدا ہوتے ہیں (بڑھتے پھولتے پھلتے جوان ہوتے ہیں. پھر بڑھاپا طاری ہوجاتا ہے تو بالآخر مرجاتے ہیں)۔ یہ سب زمانے کی گردش (مرورِ وقت) کی رُو سے ہوتا ہے۔ (اس سے اوپر کوئی اور قانون ہے ہی نہیں)۔ انہیں اس کا علم کوئی نہیں. یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔

ذرا آگے چل کر قرآن نے کہا ہے کہ زندگی اگر انسان کے طبیعی جسم کی زندگی ہے اور اس سے زیادہ انسان میں کچھ اور نہیں، تو پھر انسان اور حیوانات کی زندگی کی سطح ایک ہی ہے. اس نظریہ کی رُو سے یہ اپنے آپ کو حیوانوں سے تمیز کس طرح کرسکتے ہیں (۴۷/۱۲)۔

سورۂ قٓ میں (ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ جب جسم کے طبیعی اجزا مٹی میں جذب ہوجائیں گے تو پھر انسان کو زندگی کس طرح ملے گی) کہا کہ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ (۵۰/۴) ہم جانتے ہیں کہ زمین، انسانی ہستی میں کس چیز کو جذب کرکے کم کردیتی ہے اور کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے؟ اس سے ذرا آگے چل کر کہا کہ ان سے کہو کہ ہم انہیں پہلی بار پیدا کرنے

بعد تھک نہیں گئے کہ ان کا دوبارہ پیدا کرنا ہمارے لئے مشقت طلب ہوگا (۵۰/۱۵) ہم تو اس کی ایک ایک پور کو دوبارہ پیدا کر سکتے ہیں (۷۵/۴)۔

ان معترضین کے مختلف اعتراضات کو سامنے لانے کے بعد کہا کہ ان کے اس انکار کی اصل وجہ کچھ اور ہے اور وہ ان کے تحت الشعور کا یہ چور ہے کہ اِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (۷۸/۲۷)۔ یہ اپنے اعمال کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے۔ یہ نہیں چاہتے کہ انہوں نے جو دھاندلیاں مچائی ہیں ان کے نتائج ان کے سامنے آئیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ان کا یہ اطمینان (جو درحقیقت اطمینان نہیں بلکہ فریبِ نفس ہے) ان سے چھن جائے کہ ہم جو جی میں آئے کرتے جائیں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حیات بعد الممات کا تصور انسان کے دل میں ذمہ داریوں کا احساس ابھارتا ہے اور یہ اس احساس کو بیدار نہیں ہونے دینا چاہتے۔ لیکن ان کے اس انکار سے حقیقت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا کسی کے آنکھیں بند کر لینے سے سورج روشنی دینا چھوڑ دیتا ہے؟ اس لئے ان سے کہہ دو کہ تم موت کے بعد کی زندگی کے تصور سے لاکھ جی چراؤ، یہ واقعہ ہوگی۔ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ۝ (۸۲/۵) اور ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کیا پیچھے چھوڑا ہے اور کیا آگے بھیجا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان تمام اعتراضات کی بنیاد، مادی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) پر ہے۔ یعنی اس تصور پر کہ انسان عبارت ہے فقط اس کے طبیعی جسم سے۔ جب تک اس کے جسم کی مشینری طبیعی قوانین کے مطابق چلتی رہتی ہے، وہ زندہ رہتا ہے اور جب موت اس مشینری کو ساکن کر دیتی ہے تو انسان ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس تصورِ حیات کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ (مثلاً) اگر ایک شخص اس کا انتظام کر لے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے وہ معاشرہ کی گرفت میں نہ آئے، تو پھر کوئی قوت اسے ظلم و استبداد اور مکر و فریب سے روک نہیں سکتی۔ پھر نہ مستقل اقدار کا کوئی تصور باقی رہ سکتا ہے، نہ اپنے خود ساختہ آئین و قوانین سے برتر کسی غیر متبدل خارجی قانون کا احساس۔ اور اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں آج دنیا (اسی مادی نظریۂ حیات کی رُو سے) اس بُری طرح جُھلس اور جل رہی ہے۔ اس سے آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم ایمان بالآخرت پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے اور اعمال کے صحیح ہونے کے لئے ایمان

کی ضرورت کس قدر لاینفک ہے۔

ایک اہم نکتہ

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے،

(۱) ہر انسان کو اس کی ذات (PERSONALITY) ملتی ہے۔ یہ ذات، غیر نشوونما صورت میں ہوتی ہے اور اس سطحِ ارض پر انسانی زندگی کا مقصد اس ذات کی اس حد تک نشوونما کرنا ہے جس سے یہ، زندگی کا اگلا ارتقائی مرحلہ طے کرنے کے قابل ہو جائے۔

(۲) انسانی ذات کا فطری نتیجہ، انسان میں اختیار و ارادہ کی صلاحیت کی نمود ہے۔ اس سے یہ باقی حیوانات سے متمیز ہوتا ہے۔

(۳) انسان جو کام اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اس کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اگر یہ "اچھے کام" ہیں تو ان کے اثرات کے مجموعی نتیجہ کی نسبت سے اس کی ذات نشوونما حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ان اثرات کا پلڑا بھاری ہے تو وہ ذات نشوونما یافتہ کہلاتی ہے (اور آخرت میں اسے جنت کی زندگی کا اہل قرار دیا جاتا ہے)۔ اگر یہ پلڑا ہلکا ہے تو وہ غیر نشوونما یافتہ رہ جاتی ہے۔ (آخرت میں اسے جہنم کی زندگی کہا جاتا ہے)۔

(۴) کسی کام کے "اچھے یا بُرے" ہونے کا معیار، خدا کی وحی ہے جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(ا) انسان کی ذات پر صرف اس عمل کا اثر مرتب ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کرے۔ جس فیصلے یا عمل میں اس کا اپنا اختیار و ارادہ شامل نہیں، اس کے لئے وہ جواب دہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا، اس کا اثر اس کی ذات پر کس طرح مرتب ہو سکتا ہے۔

(ب) وحی نے اچھے اور بُرے کا جو معیار مقرر کیا ہے، اگر کسی انسان کے سامنے وہ معیار ہی نہیں آ سکا، تو وہ اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جن کاموں کو اپنی دانست میں اچھا سمجھے ان پر کاربند رہے اور

جنہیں اپنی دانست میں غلط سمجھے ان سے مجتنب رہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس کام کو اس نے اپنی دانست میں اچھا سمجھا ہے وہ فی الواقعہ اچھا ہو۔ دنیا میں سینکڑوں غلط کام ایسے ہیں جنہیں لوگ نہایت دیانت داری اور خلوص سے اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کاموں کا نتیجہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ غلط کام کا نتیجہ غلط ہی ہوگا خواہ اسے کتنا ہی حُسنِ نیت سے کیوں نہ کیا جائے کتنی غلط دوائیں ہیں جو نہایت نیک نیتی سے مریضوں کو دے دی جاتی ہیں لیکن وہ اپنا ہلاکت انگیز اثر مرتب کر کے رہتی ہیں۔

(ج) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وحی کا یہ معیار کسی شخص تک پہنچ جائے لیکن اس میں اس کے سمجھنے یا فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو ــــ مثلاً بچے، پاگل یا ایسی اقوام و افراد جن کی ذہنی سطح ہنوز بہت پست ہو۔ (جن میں عقل و فکر کی صلاحیت تو ہو لیکن وہ اس صلاحیت سے کام نہ لیں اور اپنے فیصلے جذبات کے تابع کریں، ان پر ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ذمہ داری اس شخص پر عائد ہو سکتی ہے جس تک وحی کی تعلیم پہنچ چکی ہو اور اس میں اسے سمجھ سوچ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو لوگ اس زمرے میں نہیں آتے وہ مرفوع القلم ہیں۔ ان کا شمار اشیائے کائنات یا حیوانات میں ہوگا۔ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات سے ان ہر دو نکات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں تک خدا کی وحی پہنچ چکی ہو۔ سورۂ مومن میں ہے کہ اہلِ جہنم، جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ اس عذاب میں کچھ تخفیف کرادو۔ وہ ان سے کہیں گے کہ "کیا تمہارے پاس خدا کے پیغامبر واضح قوانین لے کر نہیں آئے تھے؟" وہ کہیں گے کہ بلی۔ وہ آئے تو تھے۔ تو وہ ان سے کہیں گے کہ پھر اب اس واویلا مچانے سے کیا حاصل ہے (۴۹ ــ ۴۰/۵۰)۔ سورۂ ملک میں بھی اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے (۸ ــ ۶۷/۹)۔ سورۂ قٓ میں ہے کہ قیامت میں مجرمین ایک دوسرے کو ملزم گردانیں گے کہ انہی نے انہیں گمراہ کیا تھا۔ خدا کی طرف سے ارشاد ہوگا کہ "ہمارے حضور اس قسم کے جھگڑے مت کرو"۔ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ (۵۰/۲۸) "میں نے تمہاری طرف پہلے ہی تنبیہ (وارننگ) بھیجدی تھی"۔

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں بھی اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جب تک کسی قوم کو غلط اور صحیح راستہ متمیز طور پر دکھا نہیں دیا جاتا، اسے تباہ نہیں کیا جاتا۔ (اس

سلسلہ میں دیکھئے۔ ۱۷/۱۵؛ ۲۰۸ - ۲۶/۲۰۹؛ ۳۰/۹؛ ۹/۱۱۵؛ ۶/۱۳۲)۔ سورۂ قصص میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ رسول اس ملک کے مرکزی مقام۔ فِیْٓ اُمِّهَا ۔ میں آتا تھا (۲۸/۵۹)۔

ظاہر ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد، یہی فریضہ اس قوم کے ذمہ عائد ہوتا ہے جسے خدا کی کتاب (قرآن کریم) کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ یعنی امتِ مسلمہ کے ذمے۔ کہ وہ دیگر اقوامِ عالم تک اس ہدایت کو پہنچائے [1]۔

جہاں تک دوسرے نکتہ کا تعلق ہے کہ ذمہ داری اس کی ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ سو اس باب میں قرآن کریم کی تعلیم واضح ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جہنم میں وہ لوگ جائیں گے" جو آنکھیں رکھنے کے باوجود ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھنے کے باوجود ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ دل رکھنے کے باوجود ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ انسان نہیں، حیوان ہیں (۷/۱۷۹)۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دیکھنے بھالنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود سمجھ سوچ سے کام نہیں لیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ جو ان صلاحیتوں سے محروم ہوں گے انہیں مکلف ہی قرار نہیں دیا جائے گا۔ سورۂ ملک میں ہے کہ اہلِ جہنم کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (۶۷/۱۰) اگر ہم عقل و فکر سے کام لیتے تو اہلِ جہنم میں سے کیوں ہوتے؟ تباہ ہونے والی قوموں کے متعلق بھی یہی کہا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود، عقل و فکر سے کام نہیں لیتی تھیں (۲۹/۳۸؛ ۴۶/۲۶)۔ خود قرآنی حقائق کے متعلق کہا کہ ان سے وہی عبرت حاصل کر سکتے ہیں جن کے سینے میں سمجھنے سوچنے والا قلب ہے یا وہ بات کو غور سے سن کر اس کی نگرانی کرتے ہیں (۵۰/۳۷)۔ لہٰذا ذمہ داری اس کی ہے (۱)۔

(۱) جس تک خدا کا پیغام پہنچ چکا ہو۔

---

[1] لیکن جو قوم خود ہی راہ گم کردہ ہو وہ دوسروں کو کیا ہدایت دے گی؟ یہ وجہ ہے کہ ہم (مسلمان) خدا کے دوہرے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ ہم نے قرآن کا صحیح راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے اس لئے کہ ہماری اس روش سے دیگر اقوامِ عالم بھی غلط راہوں پر پڑی رہیں۔ لیکن اس دور میں جبکہ علم عام ہو چکا ہے، کم از کم مغرب کی مہذب قومیں تو نہیں کہہ سکتیں کہ ان تک خدا کا پیغام نہیں پہنچ سکا تھا۔

(۲) وہ اسے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور

(۳) وہ کام اس نے برضا و رغبت (دل کے ارادے کے ساتھ) کیا ہو (۳۳/۵) ; (۱۶/۱۰۶)۔

اور یہی وہ کام ہیں جن کا اثر انسان کی ذات پر مرتّب ہوتا ہے۔ اجمال اس تفصیل کی "جہنّم" کے عنوان میں ملے گی۔

پندرھواں باب

برزخ

ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے درمیان ایک وقفہ ہے جس میں مُردے کو عذاب (یا ثواب) ہوتا ہے۔ اسے عام اصطلاح میں عذابِ قبر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم سے اس تصور کی تائید نہیں ہوتی۔ اس کی رُو سے دو ہی موتیں ہیں اور دو ہی زندگیاں۔

قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ (۴۰/۱۱)۔

وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندگی۔

سورۂ بقرہ میں ہے کہ

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲/۲۸)

تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو کہ تم مردہ تھے۔ اس نے تمہیں زندگی عطا کی ہے۔ وہ تمہیں پھر مارے گا اور پھر زندہ کرے گا اور تم اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

یعنی اس دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت موت کی تھی۔ پھر انسان اس دنیا میں آیا تو اسے زندگی کہا گیا ہے۔ پھر اس دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اسے موت کہا گیا۔ اس کے بعد پھر زندگی عطا ہو گی

یہ (دوسری بار کی) زندگی کب عطا ہوگی؟ اس کے متعلق کہا۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

(۱۵-۲۳/۱۶)

تم اس زندگی کے بعد مر جاؤ گے اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اس سے واضح ہے کہ یہ دوبارہ زندگی 'قیامت کے دن' ہوگی۔ اس لئے اس دنیا سے جانے اور قیامت کے دن اٹھنے کے درمیان زندگی کا تصور قرآنی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب تک ہم اسے نہ سمجھ لیں کہ موت کیا ہوتی ہے، اور زندگی کسے کہتے ہیں قرآن کریم کے یہ حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے جو آواز نشر کی جاتی ہے وہ فضا کی کہربائی لہروں میں پھیل جاتی ہے لیکن ہمیں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ آواز ہمارے ریڈیو سیٹ کی وساطت سے محسوس طور پر ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے۔ ہمارے احساس کی گرفت میں آنے سے پہلے یہ آوازیں (یا لہریں) معدوم نہیں تھیں۔ یہ فضا میں موجود تھیں۔

خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ اس سے پہلے نہ مادی کائنات کا وجود تھا نہ اس میں زندگی کا وجود۔ پھر اس کے قانونِ مشیت کے مطابق، کائنات میں زندگی (LIFE) کی نمود ہوئی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب ظہور میں آئی اور کیسے۔ ہمیں اس کے وجود کا احساس اس وقت ہوا جب مادی پیکر کے ذریعے اس کی نمود ہوئی۔ پھر زندگی، نہ معلوم کس قدر لاتعداد مراحل سے گزرتی ہوئی پیکرِ انسانی تک پہنچی۔ ہمیں انسانی زندگی (HUMAN LIFE) کا احساس اسی مرحلہ میں آکر ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس مرحلہ کو حیات کہہ کر پکارا ہے اور زندگی کے اس سے قبل مراحل کو (ہمارے نقطۂ نگاہ سے) ممات سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد زندگی موجودہ مرحلہ سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ہم اپنے موجودہ ذرائع ادراک کی رو سے اس کا پھر احساس نہیں کرسکتے ــــ یہ نہیں کہ اس وقت زندگی معدوم ہوجاتی ہے۔ وہ تو موجود ہوتی ہے لیکن ہمارے ذرائع احساس کی گرفت سے باہر چلی جاتی ہے۔ یعنی (مذکورہ صدر مثال کے مطابق ہمارا ریڈیو سیٹ خراب ہوجاتا ہے اور کہربائی لہروں میں بہتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں نہیں آتی۔ وہ آواز اس

وقت بھی موجود ہوتی ہے۔ ہم اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ قرآنِ کریم نے اسے پھر موت کہہ کر پکارا ہے۔ ازاں بعد ہمارا ریڈیو سیٹ پھر درست ہو جاتا ہے[1] اور ہمارے نقطۂ نگاہ سے زندگی پھر آن موجود ہوتی ہے۔ اسے حیات بعد الممات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر ہم انسان کی طبعی موت کے بعد زندگی (LIFE) کو یکسر معدوم تصور کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس کے بعد (قیامت کو) ایک نئی زندگی عطا ہو گی جس کا سابقہ (یعنی موجودہ دنیا کی زندگی) سے کوئی تعلق نہیں ہو گا تو اس سے قرآن کے پیش کردہ تصورِ حیات کی تردید ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم صراحت سے بتاتا ہے کہ اُس زندگی (حیاتِ اُخروی) میں انسان کو اس دنیا کی ساری زندگی یاد ہو گی۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ یہاں کے باہمی معاملات کا علم و احساس ہو گا۔ اس سے تسلسلِ شعور (CONTINUITY OF CONSCIOUSNESS) ثابت ہو جاتا ہے۔ مادی نظریۂ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کے قائل، شعور (یا حافظہ) کا مرکز انسان کا طبعی دماغ (BRAIN) قرار دیتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ جب انسان کا موت سے دماغ ضائع ہو جائے تو پھر اس فرد کے لئے شعور یا حافظہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم اس کے برعکس، شعورِ خویش یا حافظہ کا مرکز انسانی ذات (HUMAN SELF) قرار دیتا ہے جو طبعی جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ یہ شعور درحقیقت ان تاثرات کا نام ہے جو انسانی ذات پر ہر آن منقوش یا مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی ذات ان نقوش کو ساتھ لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اُس زندگی میں ان نقوش کی نمود کا طریق کیا ہو گا، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن طریق کچھ بھی ہو، قرآن کی رُو سے اس شعورِ خویش کی نمود 'حقیقت' ہے۔ (اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انسانی ذات (نفس) اور شعورِ خویش کو مرادف قرار دیا ہے۔ دیکھئے سورۂ زمر کی ایک آیت میں اس حقیقت کو کیسے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا

---

[1] ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت اس ریڈیو سیٹ کی کیفیت کیا ہو گی۔ ایسے ریڈیو سیٹ بھی تو ہیں جو چاند پر پہنچنے والے راکٹ تک سے بھی لاسلکی رشتہ قائم رکھتے ہیں۔

فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۹/۴۲)

اللہ موت کے وقت. اور جو لوگ مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ان کے "نفس" کو لے جاتا ہے. پھر جس پر موت وارد ہو جاتی ہے اس کے نفس کو روک لیتا ہے اور دوسروں کے نفس کو ایک مدّتِ معینہ کے لئے واپس بھیجدیتا ہے. اس میں اربابِ فکر و تدبر کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں.

یہ ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں انسان کی طبیعی زندگی تو موجود ہوتی ہے. اس کا شعور معطّل ہوتا ہے. جاگنے پر وہ شعور روبہ عمل ہو جاتا ہے اور اسی کو قرآن نے "نفس" کہہ کر پکارا ہے. لہٰذا 'نفس اور شعورِ خویش مرادف ہیں. انسان کی طبیعی موت کے بعد اس نفس یا شعورِ خویش کو "روک لیا جاتا ہے" (فَيُمْسِكُ). یہ فنا نہیں ہو جاتا. اس لئے اسے معدوم کر کے از سرِ نو (ایک نئی زندگی) عطا کئے جانے کا تصور صحیح نہیں. شعورِ ذات مادی تصورِ حیات کی رُو سے' فنا یا معدوم ہو جاتا ہے. قرآنی تصورِ حیات کی رو سے' ایسا نہیں ہوتا یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

زندگی جوئے روان است و رواں خواھد بود
ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواھد بود

زندگی (یا شعورِ ذات) ایک مسلسل جاری رہنے والی ندی ہے جو اس دنیا کے بیابان سے اُخروی گلستان میں داخل ہو جاتی ہے اور موت اس باڑ کا نام ہے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے جس کی وجہ سے ہم (اس بیابان میں کھڑے) ندی کو باڑ سے آگے نہیں دیکھ سکتے. لہٰذا' یہ تصور صحیح نہیں کہ جتنے لوگ مرتے ہیں وہ (مرنے کے بعد) قبروں میں روک لئے جاتے ہیں اور پھر ان سب کو ایک دن اکٹھا اٹھایا جائے گا. اسے حشر یا قیامت کا دن کہا جاتا ہے. حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کی قیامت' اس کی موت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے. (حشر' قیامت وغیرہ کے متعلق تفاصیل پہلے گذر چکی ہیں).

لیکن قرآن کریم میں ایسے اشارات بھی ملتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ انسانی ذات کے تاثرات (شعورِ خویش) کی نمود کے موجودہ پیکر (VEHICALE) کو (موت کے بعد) جدید پیکر میں تبدیل ہونے کے لئے کچھ عبوری سا وقفہ درکار ہوگا. قبل اس کے کہ ہم اس سلسلہ میں

آگے بڑھیں، خود وقفہ یا وقت (TIME) کے متعلق ایک وضاحت ضروری ہے۔ فلسفیانہ اندازِ فکر کی رو سے وقت (TIME) کا مسئلہ زندگی اور کائنات کے مشکل ترین مسائل میں سے ہے۔ لیکن ہم اس کے اس پہلو کو ایک طرف رکھتے ہوئے، اس کے صرف ایک عمومی گوشے کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ وقت کا احساس اسے ہوتا ہے جس کا شعور بیدار ہو۔ سونے والے کو (نیند کی حالت میں) وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ احساس اسے ہوتا ہے جو جاگ رہا ہو۔ اسی طرح جسے کلوروفارم سنگھا دیا جائے اسے بھی وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اسے اصطلاحی زبان میں یوں کہیں گے کہ زمان (TIME) ایک اعتباری (RELATIVE) شے ہے۔ اسی لئے اہلِ فلسفہ، اُس زمان (TIME) کو جس کے گزرنے کا احساس نہ ہو (DURATION-LESS TIME) کہتے ہیں۔

بَرزَخ

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جس چیز کو ہم نے اس "وقفہ" سے تعبیر کیا ہے جس میں شعورِ خویش کے موجودہ پیکر (VEHICLE) کو ایک نئے پیکر میں تبدیل ہونا ہے، اس کا اُس فرد کو احساس نہیں ہوگا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ اپنے شعور کی نمود کے وقت حیرت سے کہے گا کہ مِنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶/۵۲) ہمیں، ہماری خوابگاہ سے کس نے جگا دیا؟ دیکھئے! اس میں، اس وقفہ کو نیند کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہی وہ وقفہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۲۳/۱۰۰)

ان کے پیچھے (یا آگے) یومِ بعث تک برزخ ہے۔

بَرزَخ، دو چیزوں کے درمیان اوٹ یا آڑ کو کہتے ہیں اور " وراء" کے معنی آگے اور پیچھے دونوں آتے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ، ان (مُردوں) کے آگے یا پیچھے، اس وقت تک ایک اوٹ ہو گی۔ اگر "وَرَآئِهِمْ" کے معنی "پیچھے" کے لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس عرصہ میں دنیاوی زندگی کی یاد سے غافل ہوں گے اور اگر اس کے معنی "آگے" لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آنے والی زندگی کے متعلق ان کا شعور ہنوز بیدار نہیں ہوگا۔ وہ گویا نیند کی حالت میں ہوں گے۔

مُردے ہماری سُن نہیں سکتے

لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، انسان کو مرنے کے بعد، اس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہتا. اُس وقت جب اس کے شعور کی بیداری ہو گی تو اسے اپنی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف کی تو یاد ہو گی لیکن اس کی موت کے بعد دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس کی اُسے کچھ خبر نہیں ہو گی. یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بصراحت کہا ہے کہ

وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۚ (۳۵/۱۳-۱۴)

اور تم لوگ اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہو وہ ذرہ برابر بھی اختیار و اقتدار نہیں رکھتے. اگر تم انہیں بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کو سُن نہیں سکتے اور اگر بفرضِ محال اسے سُن بھی لیتے تو تمہیں اس کا جواب نہ دے سکتے. اور وہ قیامت کے دن تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے.

اس لئے کہ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ (۶/۳۶) جواب تو وہی دے جو سُن سکے. فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۳۰/۵۲) اور تو مُردوں کو کبھی نہیں سُنا سکتا. وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ (۳۵/۲۲) تو انہیں نہیں سنا سکتا جو قبروں میں ہیں. وَ مَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (۳۵/۲۲) مُردہ اور زندہ، دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے. وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (۴۶/۵) جنہیں یہ لوگ قبروں کے سرہانے کھڑے ہو ہو کر پکارتے ہیں، انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ کون پکار رہا ہے اور وہ کیا کہہ رہا ہے. حتّٰی کہ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے (۱۶/۲۱؛ ۲۷/۲۵).

اور اس میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں. مُردہ ہونے کے اعتبار سے سب کی ایک ہی کیفیت ہوتی ہے. اور تو اور، قرآنِ کریم نے خود نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ (۳۹/۳۰) یہ یقینی بات ہے کہ تو بھی (ایک دن) مر جائے گا اور یہ بھی مر جائیں گے.

مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات

قرآن کریم نے مقتولین فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں قتل ہو جانے والوں) کے متعلق ایک جگہ

کہا ہے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ (۲/۱۵۴)۔

جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم (ان کی زندگی کی حقیقت کو) اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ (۳/۱۶۸)۔

اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ مت خیال کرو۔ وہ اپنے نشوونما دینے والے کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں سامانِ نشوونما بھی ملتا ہے۔

ان آیات میں دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) یہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی ایسی نہیں جیسی دنیا میں رہنے والے انسانوں کی زندگی ہوتی ہے کیونکہ دنیاوی زندگی کو ہم سمجھ سکتے ہیں اور اس زندگی کے متعلق کہا کہ تم اس کی کنہ و حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔ لہٰذا، وہ حیات، یہاں کی زندگی سے مختلف نوعیت کی ہے۔

(۲) وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس۔ لہٰذا ان کا اس دنیا سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ علاوہ بریں اسے بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآنِ کریم نے صراحت سے بتایا ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴) موت، ہر ذی حیات کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اس میں (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) حضرات انبیاء کرام کی بھی استثناء نہیں (۳۹/۳۰)۔ لہٰذا جسے ہم موت کہتے ہیں، وہ مقتولینِ فی سبیل اللہ پر بھی وارد ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی حیات کا تعلق اُخروی دنیا سے ہے اِس دنیا سے نہیں۔

مقتولینِ فی سبیل اللہ کی اس حیات کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے، لیکن تصریحاتِ بالا کی روشنی میں، ہم سمجھتے ہیں کہ موت کے بعد شعور کے عارضی تعطّل کے جس وقفہ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے،

لے (گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) انہیں عرفِ عام میں شھید کہا جاتا ہے۔

یہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما کا طریق یہ ہے کہ جب کسی مستقل قدر (حق) کے تحفظ اور دنیاوی مفاد میں تصادم ہو، تو جو شخص مستقل قدر کی حفاظت کی خاطر دنیاوی مفاد کو قربان کر دے، اس کا یہ عمل اس کی ذات کی نشوونما میں اضافہ کا موجب بن جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے تصادمات میں سب سے زیادہ صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں حق کی حفاظت کے لئے انسان کو اپنی جان دے دینی پڑے (کیونکہ جان سے زیادہ عزیز کوئی دنیاوی متاع نہیں ہو سکتی) سو جو شخص ایسے وقت میں ہنسی خوشی جان دے دیتا ہے اور اس طرح حق کی حفاظت کرتا ہے، اس کی ذات میں اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے اس عبوری وقفہ کے مرحلہ سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ان کے شعورِ ذات کے تسلسل میں ذرا سا بھی تعطل نہیں ہوتا۔

ہمارے اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے، (یعنی ۳/۱۶۸)۔ اس کے بعد ہے فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ وہ اپنے ان بلند مراتب کو دیکھ کر جو انہیں عنایاتِ خداوندی سے حاصل ہوئے ہیں، بہت خوش ہوتے ہیں۔ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳/۱۶۹) اور اس احساس سے کہ ان کی اس قربانی سے ان لوگوں کے لئے جو ابھی دنیا میں موجود ہیں ایسا معاشرہ قائم ہو گیا ہوگا جس میں وہ ہر طرح سے مامون و محفوظ ہیں، ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اِس دنیا کے متعلق ان کا شعور، موت کے ساتھ ہی بیدار ہو جائے گا۔ اس میں تعطل نہیں ہوگا۔

ضمناً اتنا اور بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص حق و صداقت کی خاطر جنگ میں شریک ہوتا ہے لیکن وہ قتل نہیں ہوتا بلکہ فاتح و منصور لوٹتا ہے تو وہ اس اجرِ عظیم سے محروم نہیں رہتا جو مقتولین کے حصہ میں آتا ہے۔ ایسے لوگوں کا مرتبہ بھی ایسا ہی بلند ہوتا ہے۔ (دیکھئے ۳/۱۵۶؛ ۴/۷۴؛ ۱۱۱ — ۹/۱۱۲)۔

اُخروی زندگی میں شعور کی سطح

قرآنِ کریم کے بعض مقامات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ زمان (TIME) کے متعلق اُخروی دنیا میں شعور کی سطح، اس دنیا سے مختلف ہوگی۔ چنانچہ اس دنیا میں رہنے کی مدت کے متعلق ان کے

اندازے (یہاں کے معیاروں سے) مختلف ہوں گے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ (۱۰/۴۵)؛ (۴۶/۳۵)۔

جس دن خدا انہیں اکٹھا کرے گا تو وہ خیال کریں گے کہ وہ (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔

سورۂ روم میں ہے کہ مجرمین بھی اُس وقت یہی خیال کریں گے کہ وہ ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے۔ لیکن صاحبانِ علم و ایمان کہیں گے کہ "تم یومِ بعث تک کتاب اللہ میں رہے ہو اور یہی یومِ بعث ہے" (۵۵ ـ ۳۰/۵۶)۔ یعنی وہ بھی اُس زمانے کو متعیّن نہیں کریں گے۔ بلکہ اتنا ہی کہیں گے کہ اس کا صحیح علم نوشتۂ خداوندی میں ہے۔

سورۂ مومنون میں ہے کہ خدا ان سے پوچھے گا کہ "تم دنیا میں کتنے برس رہے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہم تو صرف ایک دن یا اس کا ایک حصّہ وہاں رہے تھے۔ ہم تو اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ متعین طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان سے پوچھئے جو اس کا حساب رکھا کرتے تھے (۱۱۲ ـ ۲۳/۱۱۳)۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ ہم وہاں دس دن تک رہے تھے۔ ان میں سے بہترین دل و دماغ کا انسان بھی اتنا ہی کہہ سکے گا کہ ہم صرف ایک دن کے لئے وہاں رہے تھے (۱۰۳ ـ ۲۰/۱۰۴)۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہاں (کم از کم) زمان کے متعلق شعور کی سطح، یہاں کی زندگی سے مختلف ہوگی۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔

سولھواں باب
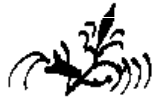
انقلابِ عظیم کی تفصیلات

یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ قرآنِ کریم میں تین قسم کے انقلابات کا ذکر آیا ہے۔

(۱) وہ انقلاب جو قوموں کی زندگی میں اس دنیا میں واقع ہوتا ہے۔ اس میں بلندیوں پر فائز قوتیں پستیوں میں گر جاتی ہیں اور قعرِ مذلت میں گری ہوئی قومیں بامِ عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ جب یہ انقلاب جنگ کے ذریعے آتا ہے تو اس (جنگ) کی ہولناکیوں کی تفصیل بھی قرآن میں آئی ہے۔ بعض اوقات طبیعی حوادث کے ذریعے بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی انقلاب کی ایک شکل ہے۔

(۲) قرآنِ کریم میں اس قسم کے کائناتی حوادث کا بھی ذکر ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اجرامِ فلکی ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ زمین، غبار بن کر فضا میں اڑ جائے گی۔ یہ عظیم کائناتی انقلاب ہوگا۔ اور

(۳) تیسرا انقلاب وہ ہے جب اُخروی زندگی میں، اعمال کے مطابق انسانوں کے فیصلے ہوں گے۔ ان کی ذات کی کیفیت کے مطابق ان کا مستقبل متعین ہوگا۔ قرآنِ کریم میں اس ہول انگیز منظر کی تفاصیل بھی آئی ہیں۔

قرآنِ کریم نے ان مناظر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بالتصریح نہیں بتایا کہ کونسی بات کا تعلق (مذکورہ صدر سہ انقلابات میں سے) کس انقلاب سے ہے۔ اسے اس نے ہمارے غور و تدبر پر چھوڑ دیا ہے ـــــ اور غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آ بھی جاتی ہے کہ فلاں منظر کا تعلق کس انقلاب

سے ہے۔

(دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ کثرت سے) عربی زبان میں الفاظ کے لغوی یا حقیقی معانی (LITERAL MEANINGS) بھی ہوتے ہیں اور مجازی (META PHORICAL) معانی بھی۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ جنگل میں شیر دھاڑا، تو وہاں "شیر" کے معنی لغوی یا حقیقی ہوں گے۔ لیکن جب ہم کہیں گے کہ وہ تو شیر ہے، تو وہاں شیر کے معنی مجازی (یعنی بہادر) ہوں گے۔ اس اعتبار سے، انقلاب ۲ کی تفاصیل کے اگر حقیقی معانی لئے جائیں تو ان سے مراد کائنات کا کوئی طبیعی حادثہ ہوگا جس کا ہمیں اس وقت علم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ان کے مجازی معانی لئے جائیں تو ان کا تعلق ان تصادمات سے ہوگا جو دنیا میں مختلف گروہوں اور یا قوموں میں رونما ہوتے ہیں۔ یعنی اس صورت میں ان کا تعلق انقلاب ۱ سے ہو جائے گا۔ جہاں تک انقلاب ۳ کی تفاصیل کا تعلق ہے، ان کے معانی بہر حال مجازی ہی لئے جائیں گے کیونکہ اُخروی زندگی کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے اسے تمثیلی رنگ ہی میں پیش کیا ہے۔ مثلاً وہاں اگر آگ (نار) کا ذکر ہے تو اس سے مراد وہ آگ نہیں جو یہاں چولھوں میں جلائی یا بھٹیوں میں بھڑکائی جاتی ہے۔ یہ ایک اضطرابی کیفیت کا تمثیلی بیان ہے۔ یہ وہ "خونِ آرزو" ہے جس کا رنگ و بو نہیں دیکھا جا سکتا[۱] لیکن یہ وہ کیف ہے جسے بادہ و ساغر کے پیکروں سے تشبیہہ دیئے بغیر بن نہیں پڑتی[۲]

میں نے (اپنی تالیف) "مفہوم القرآن" میں، قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات کے مجازی معانی متعین کرکے، ان کا مفہوم پیش کیا ہے اور وہی مفہوم میں یہاں بھی پیش کر سکتا تھا۔ لیکن (اس سوال پر کافی غور و خوض کے بعد) میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب میں، ان آیات کو علیٰ حالہٖ

۱۔ کیسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے　　(ریاضؔ خیر آبادی)

۲۔ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر　　(غالبؔ)

پیش کر دینا چاہیئے اور اسے قارئین کے اپنے فہم و بصیرت پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ متعلقہ الفاظ کا حقیقی مفہوم لینا چاہتے ہیں یا مجازی۔ بنا بریں، ان آیات کا لغوی ترجمہ پیش کر دیا جائے گا۔ (جو حضرات میرا متعین کردہ مجازی مفہوم دیکھنا چاہیں، وہ "مفہوم القرآن" میں دیکھ سکتے ہیں)۔

عظیم تغیّرات

ان تغیّرات سے متعلق آیات کا لغوی ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ ان آیات کو قرآنِ کریم کے کسی نسخے سے دیکھ لیں۔ (اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر)۔

(۱) لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً ساعت (اُس انقلاب) کا زلزلہ ایک عظیم شے ہوگا۔ جس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی اور حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور تُو، لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ مدہوش سے ہیں، حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ یہ خدا کے عذاب کی ہولناکی کی وجہ سے ہوگا (۱-۲/۲۲)۔

(۲) یہ "ساعت" بڑی ہولناک اور پُرخطر ہے (۴۶/۵۴)۔ یہ زمین اور آسمان پر گراں گزرے گی (۱۸۷/۷)۔

(۳) جب ایک بار صور پھونکا جائے گا اور زمین اور آسمان ایکبارگی اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے تو اس دن یہ واقعہ وقوع پذیر ہوگا (۱۳-۱۵/۶۹)؛ (۶۸-۳۹/۶۹)۔

(۴) جب آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے جھڑ پڑیں گے (۲/۸۲)۔

(۵) جب آفتاب سیاہ ہو جائے گا اور ستارے تاریک ہو جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلا دیئے جائینگے اور جب دس دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں چھٹی چھٹی پھریں گی اور جب وحشی (جانور یا انسان) اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور جب سمندر بھر دیئے جائیں گے (۱-۶/۸۱)؛ (۸-۱۰/۷۷)۔

(۶) جس دن لوگ بکھرے ہوتے پروانوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے (۵/۱۰۱)۔

(۷) لوگ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ میرا رب انہیں دھول کر دے گا۔ انہیں ہموار میدان بنا دے گا جس میں نہ کہیں بلندی ہو گی نہ پستی (۱۰۵-۱۰۷/۲۰)۔

(۸) جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح کاغذوں کا صحیفہ لپیٹا جاتا ہے۔ (۲۱/۱۰۴)۔ اس دن زمین ساری اس کے قبضے میں ہو گی اور آسمان لپٹے ہوئے اس کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے (۳۹/۶۷)۔

(۹) جس دن زمین بدل کر دوسری زمین بنا دی جائے گی اور آسمان دوسرے آسمان میں تبدیل کر دیئے جائیں گے اور لوگ خدائے واحد القہار کے حضور نمودار ہو جائیں گے (۱۴/۴۸)۔

(۱۰) جس دن آسمان پھٹ کر بدلی نمایاں ہو گی اور ملائکہ کا نزول ہو گا۔ اس دن اختیار و اقتدار سب خدائے رحمان کے لئے ہو گا (۲۵ ــ ۲۶/۲۵)؛ (۱ ــ ۵/۸۴)۔

(۱۱) اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن وہ کمزور ہو گا اور اس کے کناروں پر ملائکہ ہونگے (۱۷/۶۹)۔

(۱۲) جس دن ملائکہ اور روح، صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی بول نہ سکے گا مگر وہی جس کو اللہ اجازت دے اور وہ بات بھی معقول کہے (۳۸/۷۸)؛ (۱۰۵/۱۱)۔

(۱۳) جس دن پہاڑ چلائے جائیں گے اور تو زمین کو دیکھے گا کہ وہ اُبھر آئے گی اور ان سب کو اکٹھا کیا جائے گا۔ ایک کو بھی نہیں چھوڑا جائے گا اور خدا کے حضور صف بستہ حاضر کئے جائینگے (۴۷ ــ ۴۸/۱۸)۔

(۱۴) یہ پہاڑ، جنہیں تو سمجھتا ہے کہ بہت مستحکم اور اپنے مقام پر جمے ہوئے ہیں، بادلوں کی طرح اُڑتے پھریں گے (۸۸/۲۷)۔

(۱۵) جس دن آسمان لرز رہا ہو گا اور پہاڑ چل رہے ہوں گے (۹ ــ ۱۰/۵۲)۔

(۱۶) جب وہ واقعہ ہو گا تو بلندیاں پستیوں میں بدل جائیں گی۔ جب زمین میں سخت زلزلہ آئیگا اور پہاڑ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور دھول بن جائیں گے (۱ ــ ۶/۵۶)۔

(۱۷) جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ اون کی طرح (۸ ــ ۹/۷۰)۔

(۱۸) جس دن زمین اور پہاڑوں میں زلزلہ آجائے گا اور پہاڑ ایسے ریت کے ڈھیر بن جائیں گے جو نیچے کی طرف پھسلتی چلی جائے (۱۴/۷۳)۔

(۱۹) جب آسمان کھُلا ہوا دُخان (دھواں) ہو گا (۱۰/۴۴)۔

(۲۰) جب زمین پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے نکل پڑیں گے (۵۰/۴۴)۔

(۲۱) جس دن ایک بلانے والا انہیں ایسی بات کی طرف بلائے گا جو ان پر سخت ناگوار گذرے گی۔ وہ آنکھیں جھکائے اس طرح قبروں سے نکل پڑیں گے جس طرح ٹڈی دل پھیل جاتا ہے اور دوڑ کر اس پکارنے والے کے پاس پہنچ جائیں گے (۶-۸/۵۴)۔

(۲۲) جب نگاہیں خیرہ ہوجائیں گی، چاند گہن میں آجائے گا اور شمس و قمر اکٹھے ہوجائینگے (۷-۹/۷۵)۔

(۲۳) جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم فوج در فوج نکل آؤ گے اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ (چوپٹ) دروازوں کی طرح ہوجائے گا اور پہاڑ چل پڑیں گے تو وہ سراب کی طرح ہوجائینگے (۱۸-۲۰/۷۸)۔

(۲۴) وہ ایک عظیم حادثہ ہے جس کے بارے میں یہ اختلاف کرتے ہیں (۱-۳/۷۸)۔

(۲۵) جس دن کانپنے والی کانپ اٹھے گی اور اس کے پیچھے آنے والی آئے گی۔ اس دن کتنے دل دھڑک رہے ہوں گے اور نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی (۶-۹/۷۹)۔

(۲۶) یہ طَامَّۃُ الْکُبْرٰی — بہت بڑا حادثہ ہوگی (۳۴/۷۹)۔

(۲۷) جب وہ تصادم کا حادثہ واقع ہوگا جس میں کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے گی (۳۳/۸۰)۔

(۲۸) وہ ایسی مصیبت ہوگی جو ہر طرف سے چھا جائے گی (۸۸/۱)۔

(۲۹) جب زمین میں زلزلہ آجائے گا اور وہ اپنے دبے ہوئے بوجھوں کو اُگل دے گی۔ وہ اپنے حالات کو عام کردے گی۔ لوگ منتشر گروہوں کی شکل میں نکل آئیں گے (۱-۶/۹۹)۔

(۳۰) خدا کا امر آنکھ جھپکنے کے وقفہ میں آجائے گا (۵۰/۵۴)۔

یہ ہیں اس انقلاب کی تفاصیل جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ہم نے ان آیات کا لغوی ترجمہ دیدیا ہے (اور حوالہ بھی تاکہ آپ انہیں قرآنِ کریم سے خود نکال کر دیکھ لیں) اور فیصلہ کریں کہ ان کے معانی لغوی (حقیقی) لینے چاہئیں یا مجازی۔ اور یہ بھی کہ انکا تعلق انقلاب کے ان تین گوشوں میں سے کس سے ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو تین آیات اور بھی ہیں جو خصوصی توجہ کی محتاج ہیں۔ سورہ مطففین میں ہے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۸۳/۶)

جس دور میں نوعِ انسان "رب العالمین" کیلئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

اور

وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ (۸۹/۲۲)

تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے۔

اور

وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹)

زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی

یہ اور اس قسم کی دیگر آیات سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے عالمگیر انقلاب سے متعلق ہیں جو اس زمین پر واقع ہوگا۔ بہرحال، ہم اب آگے بڑھتے ہیں۔

لوگوں کی حالت

اوپر جو آیات درج کی گئی ہیں ان کا تعلق اشیائے کائنات سے ہے۔ اب ہم ان آیات کو سامنے لاتے ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ اس انقلاب میں لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ ان آیات کے سلسلہ میں بھی آپ اُن کے حقیقی اور مجازی معانی کے فرق کو پیشِ نظر رکھئے اور یہ بھی دیکھئے کہ مذکورہ صدر ہر سہ انقلابات میں سے ان کا تعلق کس انقلاب سے ہے۔

(۱) جس دن کچھ چہرے سیاہ ہوں گے کچھ سفید (روشن) (۳/۱۰۵–۱۰۶)؛ (۶۷/۲۷)۔ کچھ چہرے شگفتہ وشاداب، کچھ افسردہ و پژمردہ (۷۵/۲۲–۲۴)؛ (۷۶/۱۱)؛ (۸۰/۳۸–۴۲)؛ (۸۸/۲–۷)۔

(۲) مجرمین سر جھکائے خدا کے حضور آئیں گے (۳۲/۱۲)۔ آواز بھی پست ہوگی (۲۰/۱۰۸–۱۱۱)۔

(۳) لوگ اپنے خلاف آپ شہادت دیں گے (۶/۱۳۱)؛ (۷/۳۷)۔ ہر شخص اپنے آپ سے جھگڑتا ہوا آئے گا (۱۶/۱۱۱)۔ ہاتھ، پاؤں، زبان اس کے خلاف گواہی دیں گے (۲۴/۲۴–۲۵)؛ (۳۶/۶۵)؛ (۴۱/۲۰–۲۱)۔

(۴) ہر ایک اپنا اپنا اعمال نامہ لئے ہوئے آئے گا (۱۷/۷۱)؛ (۶۹/۱۹–۲۷)۔

(۵) جس طرح پہلی بار پیدا کیا گیا تھا اسی طرح فرادیٰ حاضر ہوں گے (۶/۹۵)۔

(۶) مختلف گروہ آپس میں اختلاف کریں گے۔ اس دن ان کی سماعت و بصارت بڑی تیز ہوگی۔

اس دن تمام معاملات کے فیصلے ہو جائیں گے اور ظالمین کے لئے وہ دن بڑی ہی حسرت کا ہوگا (۳۸-۳۷/۱۹)۔

(۷) اس دن عدل کے ترازو کھڑے کئے جائیں گے اور اعمالِ انسانی کا ذرہ ذرہ سامنے آجائے گا (۴۷/۲۱)؛ (۷-۸/۹۹). جس کا پلڑا جھک جائے گا وہ کامیاب ہوگا. جس کا اٹھا رہے گا وہ ناکام ہوگا (۶-۱۱/۱۰۱)۔

(۸) اختیار و اقتدار سب خدا کے لئے ہوگا وہ ان سب میں فیصلہ کرے گا (۵۶/۲۲). ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا. کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی (۱۶-۱۷/۴۰)۔

(۹) آنکھیں اور قلوب الٹ جائیں گے (۳۷/۲۴). دل اچھل کر حلق تک آجائیں گے (۱۸/۴۰). وہ کنکھیوں سے دیکھیں گے (۴۵/۴۲)۔

(۱۰) ان پر عذاب اوپر اور نیچے سے محیط ہو جائے گا (۵۵/۲۹)۔

(۱۱) مجرم الگ ہو جائیں گے (۵۹/۳۶). وہ اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۴۱/۵۵)۔

(۱۲) ان کی گردنوں میں طوق پہنائے جائیں گے. ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دی جائیں گی. وہ اس طرح ڈھانپ دیئے جائیں گے کہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکیں گے (۹/۳۶)۔

(۱۳) ان کے جرائم نمایاں ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور ان کے نتائج انہیں اپنے اندر گھیر لیں (۴۷-۴۸/۳۹)؛ (۱۶/۴۰)؛ (۳۳/۴۵)۔

(۱۴) جس دن مجرموں کو یوں عدالت میں لایا جائے گا کہ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا اور ایک ساتھ نگران (یا گواہ) ہوگا (۲۱/۵۰). گواہ ساتھ کھڑے کئے جائیں گے (۵۱/۴۰)۔

(۱۵) اس دن نگاہوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے اور نظریں بڑی تیز ہو جائیں گی (۲۲/۵۰)۔

(۱۶) متقیوں کے علاوہ باقی سب کے دوست بھی دشمن ہو جائیں گے (۶۷/۴۳)۔

(۱۷) اس دن (خوف کے مارے) کوئی بات نہیں کر سکے گا. نہ ہی کسی کی معذرت قبول کی جائیگی (۳۵-۳۶/۷۷)۔

(۱۸) وہ اپنے رب سے محجوب ہوں گے (۱۵/۸۳)۔

(۱۹) اس دن ہر ایک سے نعمائے خداوندی کے متعلق باز پرس ہوگی (۸/۱۰۲)۔

اقوام کا ذکر

بعض مقامات پر افراد کے بجائے اقوام کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے کہ جب ایک قوم جہنم میں داخل ہوگی تو دوسری قوم اس پر لعنت بھیجے گی اور ان کا باہمی جھگڑا ہوگا۔ ہر قوم دوسری کو مطعون کرے گی کہ اس نے اسے گمراہ کیا تھا اور خدا سے کہے گی کہ اسے دوہرا عذاب دیا جائے۔ جواب ملے گا کہ تم سب کو دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ہر قوم کی روش اور مسلک کا اثر دوسری اقوام پر پڑتا ہے (۳۸ - ۳۹/۷)۔ سورۃ جاثیہ میں ہے کہ ہر قوم گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی آئے گی۔ اور ہر ایک کو اس کے اعمال نامہ کی طرف دعوت دی جائے گی تاکہ اسے اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے (۴۵/۲۸) نیز (۳۸/۵۹)۔

باہمی جھگڑے

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں بتایا ہے کہ جہنم میں مختلف افراد اور مختلف گروہ ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑیں گے (اور ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ اس نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ ان میں وہ جھگڑے بڑے عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہیں جو مفاد پرست لیڈروں اور ان کے متبعین (FOLLOWERS) میں ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے ان کی باہمی بحث و تمحیص اور طعن و تشنیع کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً

(۱) سورۃ ابراہیم میں ہے کہ متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے، اب اس عذاب کو ہم سے ہٹا دو۔ تم تو اپنی قوت کے اقتدار کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم خود عذاب میں مبتلا ہیں۔ تمہاری مدد کیا کریں۔ اب چیخنا چلانا بیکار ہے (۱۴/۲۱)؛ (۴۷ - ۴۸/۴۰)۔

(۲) سورۃ احزاب میں ہے کہ متبعین خدا سے کہیں گے کہ ہم اپنے جرائم کے ذمہ دار نہیں۔ ہم ان اکابرین کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ سو انہیں دوہرا عذاب دو (۶۷ - ۳۳/۶۸)۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ عذر قابل پذیرائی نہیں ہوگا۔ ان سے کس نے کہا تھا کہ تم اپنی عقل و بصیرت کو کام

ہیں نہ لاؤ اور اندھا دھند دوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔

(۳) سورۂ سبا میں ہے کہ جب لیڈر عوام سے کہیں گے کہ تم خود ہی غلط راستے پر چلنا چاہتے تھے۔ ہمارا تم پر کیا زور تھا جو ہم تمہیں غلط راستے پر زبردستی چلاتے! وہ جواب میں کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی شاطرانہ چالیں چلتے رہتے تھے کہ ہم جیسے سادہ لوح تمہارے دامِ تزویر میں آجاتے تھے۔ یوں تم ہمیں الٹے راستے پر ڈال دیتے تھے (۳۱ - ۳۳/۳۴)؛ (۲۷ - ۳۲/۳۷)۔

(۴) سورۂ ص میں ہے کہ ہم مسلک لوگوں کا ایک گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو ان میں بھی باہمی یہی تکرار ہوگی کہ اس عذاب کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہیں گے کہ وہ لوگ کہاں گئے جو ہمیں دنیا میں غلط کاموں سے روکا کرتے تھے اور ہم کہا کرتے تھے کہ وہ بدترین خلائق ہیں (وہ جنت میں ہوں گے) (۵۹ - ۶۳/۳۸)۔

یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن میں ہے کہ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ (۳۸/۶۴) جہنم والوں کے یہ باہمی جھگڑے یقینی بات ہے۔ (نیز ۳۹/۳۱)۔

(۵) سورۂ مومن میں متبعین اور لیڈروں کے باہمی جھگڑے کے بعد ہے کہ وہ لوگ جہنم کے محافظین سے کہیں گے کہ تم ہی کچھ کرو کہ ہم پر یہ عذاب ہلکا ہو جائے۔ لیکن انہیں اس کا اختیار ہی نہیں ہوگا (۴۰/۴۷-۵۰)۔

(۶) سورۂ قٓ میں لیڈروں اور متبعین کے تخاصم کے بجائے ان لوگوں کی باہمی تکرار کا ذکر ہے جو دنیا میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ وہاں ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مطعون کرے گا کہ اس نے اسے بہکا بہکا کر غلط راستوں پر ڈال دیا تھا (۲۳ - ۲۸/۵۰)۔ ان کے برعکس، سورۂ صافات میں ایک ایسے دوست کا ذکر ہے جو اپنے رفقاء کو بہکایا کرتا تھا لیکن وہ اس کی باتوں میں نہیں آتے تھے اس لئے وہ جنت میں تھے اور ان کا یہ مصاحب (قرین) دوزخ میں (۵۱ - ۵۷/۳۷)۔

مذہبی پیشواؤں کے ساتھ جھگڑے

یہ جھگڑے لیڈروں کے ساتھ ان کے متبعین کے تھے۔ دیگر مقامات پر، روحانی پیشواؤں اور مذہبی مقتداؤں کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں اور مقتدیوں کے جھگڑوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے اور مذہبی پیشوا ان کی گمراہی کی ذمہ داری لینے سے انکار

کردیں گے[1] (۶۲-۶۶/۲۸)؛ (۴-۷/۷۵-۲۸)؛ (۱۳-۱۴/۳۰)۔

اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کی باہمی گفتگو

سورۂ حدید میں ہے کہ اہلِ جنّت کی پیشانیوں کا نور ان کے آگے آگے چل رہا اور اس طرح ان کی راہوں کو روشن کر رہا ہوگا۔ منافقین ان سے کہیں گے کہ ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہوا کرتے تھے ذرا رکو کہ ہم تمہارے چراغوں سے تھوڑی سی روشنی مستعار لے لیں۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ یہ دیئے تو اپنے اپنے اعمال کے تیل سے جلتے ہیں، مانگے سے کسی کو روشنی نہیں مل سکتی۔ اس روشنی کا سرمایہ حاصل کرنا ہے تو پھر دنیا میں جانا ہوگا۔ (جہاں اب کوئی واپس جا نہیں سکتا)۔ پھر کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب (۱۲-۱۳/۵۷)۔

سورۂ مدّثر میں ہے کہ اہلِ جنّت، اہلِ جہنّم سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا کہ جو تم اس عذاب میں گرفتار ہوگئے اور وہ بتائیں گے کہ ہم نے کیا کیا جرائم کئے تھے (۴۰-۴۶/۷۴)۔

اور اہلِ جنّت تو چونکہ ایک برادری کی حیثیت سے یک جا ہوں گے۔ اس لئے ان کی زندگی ایک معاشرہ کی سی ہوگی۔ ان کی باہمی گفت گو کے تذکرے بڑی شرح و بسط سے آتے ہیں۔ (مثلاً ۲۵-۲۶/۵۲ تفصیل جنّت کے عنوان میں ملے گی)۔

اہلِ جہنّم کا تاسف

اہلِ جہنّم اپنے مآل کو دیکھ کر سخت متاسف ہوں گے۔ سورۂ الحاقہ میں ہے کہ جب ایسے شخص کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس میں اپنا انجام دیکھ کر چیخ اٹھے گا اور باصد حسرت و یاس کہے گا کہ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ (۶۹/۲۷) اے کاش! موت میرا خاتمہ کر دیتی۔ یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرَابًا (۷۸/۴۰) اور میں مٹی کا ڈھیر ہوتا۔ اُس وقت اسے اس کا احساس ہوگا کہ اس نے دنیا کی

---

[1] متبوعین اور متبعین کے باہمی جھگڑوں کے سلسلہ میں "جہنّم" کا عنوان بھی دیکھئے۔

زندگی ہیں اس حقیقت کو نہ سمجھا۔ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۸۹/۲۴) زندگی کہلانے کی مستحق تو یہ زندگی ہے۔ اے کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لئے کچھ پہلے سے بھیجا ہوتا۔

واپسی نہیں ہوگی

لیکن اس تاسّف کا وہاں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی ذات کا مستقبل تو اس دنیا کے اعمال کے مطابق مرتب ہونا تھا اور اس دنیا کی زندگی ختم ہوگئی۔ وہاں اس کے لئے کوئی موقع نہیں ہوگا اور (تاسّف بالائے تاسّف کہ) وہاں اس سے دنیا کی طرف واپسی بھی نہیں ہو سکے گی۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) مرنے والا کہے گا کہ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ (۲۳/۱۰۰) اے میرے نشو و نما دینے والے! تو مجھے ایک بار پھر واپس بھیج دے تاکہ میں وہ اچھے کام جو پہلے نہیں کر سکا تھا اب کر کے دکھاؤں۔ جواب ملے گا۔ کَلَّا (۲۳/۱۰۰) نہیں۔ اب ایسا وقت گیا۔ اب واپسی نہیں ہو سکتی۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے کہ جہنم والا پکارے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے یہاں سے نکال کر بھیج دے۔ اگر میں پھر یہی کچھ کروں تو واقعی میں مجرم ہوں گا۔ جواب ملے گا کہ اب ایسا نہیں ہو سکتا (۲۳/۱۰۷)۔ سورۃ سجدہ میں ہے کہ مجرمین کہیں گے کہ اب ہم نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا ہے اور ان فیصلوں کو اپنے کانوں سے سُن لیا ہے۔ فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ٥ (۳۲/۱۲) اب ہمیں یقین آگیا ہے کہ واقعی غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ تو ہمیں واپس بھیج دے تاکہ وہاں جا کر اچھے کام کریں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکے گا۔ زندگی صراطِ مستقیم پر سیدھی آگے بڑھتی ہے۔ اس کی حرکت دوری (CYCLIC) نہیں۔ سورۃ فاطر میں مجرمین کی اس استدعا کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اب جو تم کہتے ہو کہ ہمیں اگر دوبارہ موقع ملے تو ہم صحیح راستے پر چل کر دکھائیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں پہلی زندگی میں کوئی کم موقع ملا تھا؟ تمہارے پاس وقت بھی تھا اور بتانے والے تمہیں بتا بھی رہے تھے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کونسا۔ اس سے تم نے فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔ سورۃ زمر میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ تمہیں اس وقت کہا جاتا تھا کہ اب وقت ہے۔ اپنی روش کو بدل لو، بعد میں یہ نہ کہنا کہ اگر ہمیں دوبارہ موقع دے دیا تو ہم اپنی اصلاح کر لیں، دوبارہ موقع نہیں ملے گا (۳۹/۵۸)۔ نیز (۴۲/۴۷)۔

وہاں موت بھی نہیں آئے گی

اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ انسان کو موت آجائے لیکن وہاں موت بھی نہیں آئے گی. لَا یُقْضٰی عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا (۳۵/۳۶)؛ (۴۳/۷۷). قرآنِ کریم میں ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے پہلے انسان زندہ نہیں تھا. وہ بھی گویا موت کا عالم تھا. اس کے بعد زندگی ملی. یہ ایک موت اور ایک زندگی ہوگئی. اس کے بعد پھر ایک موت آئے گی اور پھر زندگی ملے گی. اس طرح دو موتیں اور دو زندگیاں ہوگئیں. قرآن نے انہی (دو زندگیوں اور دو موتوں) کا ذکر کیا ہے (۲/۲۸)؛ (۴۰/۱۱).

لیکن جہنم کی زندگی، نہ زندگی ہوگی نہ موت. قرآن میں ہے. لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (۲۰/۷۴) وہ اس (جہنم) میں نہ جئیں گے نہ مریں گے. (نیز ۸۷/۱۳). کیفیت یہ ہوگی کہ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ (۱۴/۱۷) اسے نظر آئے گا کہ موت ہر طرف سے اس کی طرف بڑھتی چلی آرہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں. اُف! کس قدر مستقل عذاب کی ہے یہ الم انگیز زندگی جس میں.

موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہ ہیں روزِ جزا کی وہ تفاصیل جن کے متعلق کہا کہ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (۶۹/۵۱) ان کا واقع ہونا ایک یقینی حقیقت ہے. مِثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝ (۵۱/۲۳) ایسا یقینی جس طرح تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو تو تمہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ گفتگو باہمد گر ہو رہی ہے.

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ کا (بارِ دگر) سامنے لانا ضروری ہے. اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جہنم میں قومیں داخل ہوں گی. اس جہنم سے مراد اگر اس دنیا کی تباہی لی جائے تو پھر بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ قومی تباہی، تمام افراد پر یکساں آیا کرتی ہے. اس میں اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں ہوا کرتی. (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن اگر اس سے مراد اُخروی زندگی کا جہنم لیا جائے، تو قوم یا گروہ سے مراد ہوگی ہم مسلک

---

[1] موت نہ اہلِ جہنم کو ہوگی، نہ اہلِ جنت کے لئے. اس سلسلہ میں دیکھئے (۵۸ ـ ۳۷/۵۹)؛ (۴۴/۵۶). (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی).

لوگوں کی حمایت. یعنی دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک غلط کار قوم میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو ان کے ہم نوا نہیں ہوتے. وہ انہیں' ان کی غلط روش پر ٹوکتے بھی رہتے ہیں اور علیٰ قدر وسعت' اسے بدلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں. قرآن کریم نے دربارِ فرعون کے اس مردِ مومن کا ذکر بڑی شرح وبسط سے کیا ہے جس نے بھرے دربار میں فرعون کی پالیسی کی مخالفت اور حضرت موسیٰ کے مسلک کی تائید بڑے مدلل اور پُر جوش انداز میں کی تھی ـــ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز تھی کہ قرآنِ کریم نے اسے اپنے دامنِ حفاظت میں لے کر ابدیت درکنار کر دیا ہے (۲۸-۴۴/۴۰). اسی طرح اس نے فرعون کی بیوی کے ایمان کا ذکر بھی بڑی تبریک وتحسین سے کیا ہے (۶۶/۱۱). اُخروی زندگی میں اس قسم کے افراد اس قوم سے الگ ہوں گے اور جہنم میں غلط کار لوگوں کا گروہ ہی جائے گا. یہی ہیں ہم فکر وہم عمل افراد کے گروہ جن کے متعلق کہا کہ وَ سِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا (۳۹/۷۱) اہلِ کفر جہنم کی طرف گروہ در گروہ لاتے جائیں گے. وَ سِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۳۹/۷۳) اور متقی بھی اسی طرح گروہ در گروہ جنت کی طرف بڑھائے جائیں گے. یہاں کی زندگی میں تو سب ملے جلے رہتے ہیں. لیکن وہاں یہ چھٹ کر دو الگ الگ گروہوں میں منقسم ہو جائیں گے. جن افراد کی ذات کی اس حد تک نشوونما ہو چکی ہوگی کہ وہ اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل قرار پائے گی' ان کا گروہ الگ ہوگا. یہ اہلِ جنت کا گروہ کہلائے گا. سال بھر طالب علم ایک ہی کلاس میں رہتے ہیں. لیکن سالانہ امتحان کے بعد وہ (پاس اور فیل کے) دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں. قانونِ ارتقا کی رُو سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے. ایک جنس (SPECIES) کے تمام افراد کا شمار ایک ہی گروہ میں ہوتا ہے. لیکن ان میں سے جو "اصلح" (THE FITTEST) قرار پاتے ہیں' وہ زندگی کی اگلی منزل میں پہنچ جاتے ہیں. جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ آگے بڑھنے سے روک دیئے جاتے ہیں. اسی کو جہنم یا جحیم کہتے ہیں. (جحیم کے معنی ہی روک دیئے جانے کے ہیں). تفصیل اس اجمال کی آپ کو چند قدم آگے چل کر جنت اور جہنم کے عنوانات میں ملے گی.

سترھواں باب

شفاعت

جو موضوع پیچھے سے چلا آرہا تھا اس میں ہم مسلسل آگے بڑھ سکتے تھے. لیکن راستے میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں رُکنا نہایت ضروری ہے اور وہ مقام ہے عقیدۂ شفاعت کا.

جزا اور سزا کے متعلق قرآنی تصور آپ کے سامنے آچکا ہے. اس تصوّر کی رُو سے آپ نے دیکھ لیا ہے کہ

(۱) قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، انسان کا ہر عمل (حتّٰی کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی) اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے. یہ خدا کا اٹل اور غیر متبدل قانون ہے.

(۲) کچھ کام تعمیری نتیجہ پیدا کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ تخریبی. ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مترتب ہوتا چلا جاتا ہے.

(۳) جس شخص کا تعمیری نتیجہ پیدا کرنے والے اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے، وہ ارتقائے حیات میں ایک منزل آگے بڑھ جاتا ہے — اسے جزا یا جنّت کی زندگی کہتے ہیں. جس کا وہ پلڑا ہلکا رہ جاتا ہے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا. اسے سزا یا جہنّم کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے.

اس تصوّر کی رو سے آپ نے دیکھ لیا کہ کسی شخص کی جزا اور سزا کے سلسلہ میں، خارج سے کسی کی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.

لیکن (دیگر مذاہب کی طرح) ہمارے ہاں بھی عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ جن لوگوں پر، ان کے

اعمال کے نتائج کی رُو سے سزا متحقق ہو جائے گی، "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" ان کے لئے خدا سے سفارش کریں گے اور ان کی سفارش پر خدا انہیں معاف کر دے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ اسے شفاعت کہا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے کو شفیع (جمع شفعاء)۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور (یا عقیدہ) اس ذہنیت کی تخلیق ہے جس کی رو سے خدا کو عام دنیاوی بادشاہوں (یا حاکموں) جیسا مطلق العنان بادشاہ سمجھا جاتا ہے جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ وہ جس سے خوش ہوتا ہے اسے یونہی گاؤں کے گاؤں جاگیر میں بخش دیتا ہے۔ ناراض ہوتا ہے تو جسے جی میں آئے باندھ لیتا ہے۔ جسے وہ اس طرح باندھ لیتا ہے، اس کے حق میں، اُس (خدا) کے مصاحب یا مقرب سفارش کرتے ہیں۔ وہ ان کی سفارش قبول کر لیتا ہے اور مجرم کو بخش دیتا ہے۔

لیکن اس تصور کی رُو سے، قرآنِ کریم کی استوار کردہ، قانونِ مکافاتِ عمل کی بلند بام عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ تو خیر عدل کی منزہ ترین شکل ہے۔ عام دنیاوی حکام میں سے جس کے متعلق مشہور ہو کہ وہ سفارشوں سے متاثر ہو کر فیصلے کر دیتا ہے، اسے معاشرہ میں بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا، یہ حقیقت بداہتاً واضح ہے کہ سفارش (شفاعت) کا یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے اور اس کے نظامِ عدل میں کسی طرح بار پا ہی نہیں سکتا۔

قرآنِ کریم نے باطل پرستوں کے اس عقیدہ کا ذکر کیا ہے جس کی رو سے وہ مانتے تھے کہ ان کے معبود ان کی سفارش کر کے انہیں چھڑا لیں گے۔ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (۱۰/۱۸) یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں گے۔ لیکن قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی اور کہہ دیا کہ سفارش کا یہ نظریہ ہی باطل ہے۔ سورۂ بقرہ میں (یہودیوں کو جو شفاعت کے اس عقیدہ کے حامل تھے، مخاطب کر کے) کہا۔

وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (۲/۴۸)۔

ڈرو اس دن سے جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام نہیں آ سکے گا، نہ ہی کسی کی

---

[1] بدقسمتی سے اس عقیدہ کی تائید میں بہت سی وضعی روایات حضور رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔

سفارش (شفاعت) قبول کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی شخص فدیہ (یا کفارہ) دے کر چھوٹ سکے گا۔
نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر انہی الفاظ کو دہرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے۔ وَ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ (۲/۱۲۳) کسی شخص کو کسی کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔

ذرا آگے چل کر خود مسلمانوں سے کہا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۲/۲۵۴)

اے جماعتِ مومنین! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے منفعتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جب جنت نہ تو مال و دولت کے عوض خریدی جا سکے گی۔ نہ ہی کسی دوست کی دوستی کسی کے کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی کی سفارش (شفاعت) چل سکے گی جو اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ اپنے آپ پر بہت ہی ظلم کرتے ہیں۔

سورہ سبا میں ہے۔ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ (۳۴/۴۲) آج تم میں سے کوئی بھی اس کا اختیار نہیں رکھتا کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ سورۃ مومن میں ہے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ اس دن ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ (۱۷-۴۰/۱۸) اور جنہوں نے ظلم و زیادتی کی ہوگی ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا' نہ ہی کوئی سفارش کرنے والا جس کی اطاعت انہیں کوئی فائدہ دے سکے۔ دوسری جگہ ہے وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا (۳۰/۱۳) جن لوگوں کو یہ شریکِ شفاعت کیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ان کی سفارش کریں گے ان میں سے کوئی بھی ان کا شفیع نہیں ہوگا۔ ایک اور مقام پر ہے۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ○ (۷۴/۴۸)۔ شفاعت کرنے والوں میں سے کسی کی شفاعت ان کے کام نہیں آئے گی۔ سورۃ انعام میں ہے کہ جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے وہ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ ان کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور جو کچھ وہ دل میں سمجھے بیٹھے تھے وہ سب زعمِ باطل ثابت ہوگا (۶/۹۵)۔

وہ خود اس کا اعتراف کریں گے کہ ان کا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں (۷/۵۳) ؛ (۲۶/۱۰۰)۔

ان تصریحات سے سفارش کے متعلق قرآنِ کریم کا نظریہ واضح ہوگیا۔ لیکن اس میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں "شفاعت" کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان آیات میں شفاعت کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ لغت اور خود قرآنِ کریم کی رُو سے اس لفظ (شفع) کے معنی کیا ہیں۔ میں نے (اپنی تالیف) لغات القرآن میں اس مادہ کی تشریح بڑی تفصیل سے کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ لغات کے متعلقہ حصّہ کو یہاں درج کردیا جائے۔

لغاتُ القرآن کی رُو سے شفع کا مفہوم

شَفْعٌ، اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا (زَوْجٌ) جوڑا بنا دینا۔ وَتْرٌ کے معنی ہیں، اکیلا رہنا (طاق ہونا) اور شَفْعٌ کے معنی ہیں زَوْجٌ (جفت) ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ شَفْعٌ کے معنی کسی چیز کو اُس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور ضم کر دینے کے ہیں اور شَفَاعَۃٌ کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ شُفْعَۃٌ کے معنی ہوتے ہیں، کوشش کر کے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا لینا اور اس طرح اپنی چیز کو بڑھا لینا۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حقِ ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائیداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائیداد کی لگائیں۔ عَیْنٌ شَافِعَۃٌ وہ آنکھ جو کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دو دیکھے۔ نَاقَۃٌ شَافِعٌ وہ اونٹنی جس کا ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہو اور دوسرا پیٹ میں ہو۔ نَاقَۃٌ شَفُوْعٌ وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دوہنے میں دونوں وقت اکٹھا دیدے۔ اَلشَّفَائِعُ۔ مختلف قسم کے گھاس جو دو دو ہو کر اکٹھے اُگیں۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ اَلشَّاۃُ الشَّافِعُ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شَفْعٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا۔ اس کے بعد شَفَاعَۃٌ کے معنی سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں

ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے نیز اس کے معنی دعا کرنے کے بھی آتے ہیں۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ شَفَعَ فَلَانٌ لِفُلَانٍ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلب گار ہو۔

قرآنِ کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے۔ اس اعتبار سے جماعتِ مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِیْعٌ ہوتا ہے۔ یعنی اس کی معاونت کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ۔ اس نظام کا مرکز (امیر) ہر ایک کا شَفِیْع۔ وہ افرادِ کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے۔ یہی باہمی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔

اس جماعت کی یہ شَفَاعَۃ (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہوتا ہے۔ اس کے لئے ان سے کہا گیا ہے کہ یہ بِرِّ وَ تَقْوٰی (کشادگی اور قوانینِ خداوندی کے مطابق) کاموں میں دوسروں سے تعاون کریں لیکن ان کے برعکس اِثْمِ وَ عُدْوَان میں تعاون نہ کریں (۵/۲)۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا کہ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵) جو شخص حُسن کارانہ انداز میں (اچھے کام میں) کسی دوسرے کے ساتھ مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں سے حصہ مل جاتا ہے اور جو شخص تخریبی انداز سے (برے کام میں) کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تعاون میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شفاعت میں ایک شخص، دوسرے شخص کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائے گا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیائے کرام (اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبیٔ اکرمؐ) خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کریں گے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ اسے شفاعت

کہتے ہیں. ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جس کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۸-۷) ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آجاتا ہے. نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور ان کی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی. اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی. وہ جب کہتے ہوں گے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰؑ) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ دے کر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں. اس کے برعکس، تمہارا رسول گنہگاروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا، تو اس اعتراض کے پیشِ نظر اس قسم کی روایات وجود میں آگئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے تو نبی اکرمؐ سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ آپؐ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیج دے گا حضورؐ نہ سجدے سے سر اٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائیں گے. اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا تو جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری. قرآنِ کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہو سکتی تھی). اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (۲/۴۸) کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آ سکے گا، نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جا سکے گی نہ ہی کسی سے اس کے گناہوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا اور نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا.

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے. مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ (۲/۲۵۵) "وہ کون ہے جو اس کے پاس اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے." اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ہے اور حضورؐ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کریں گے.

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے. سب سے پہلے تو اس لئے کہ اس قسم کی

شفاعت کا عقیدہ قانونِ مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآنِ کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے. لہٰذا' اگر قانونِ مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآنِ کریم میں موجود ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآنِ کریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دیئے گئے ہیں. مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے. اس سے پہلی آیت یہ ہے. "اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ (۲/۲۵۴) جس میں نہ گناہوں کی قیمت ادا کر کے جنت خریدی جا سکے گی' نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئے گی اور نہ ہی کسی کی شفاعت. اس کے بعد اگلی آیت میں ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲/۲۵۵). اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائے گی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائے گا.

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ قانونِ مکافات کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے. لیکن قرآنِ کریم نے جزا و سزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے. مقدمہ میں حاکم کے علاوہ' ملزم ہوتا ہے. مستغیث ہوتا ہے. گواہ ہوتے ہیں. پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں. وغیرہ وغیرہ. قرآنِ کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے. مثلاً ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہو گا وہ عدالت کے کٹہرے میں اکیلا کھڑا ہو گا. وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی...... وَ مَا نَرٰی مَعَکُمْ شُفَعَآءَکُمْ........ (۶/۹۵) تم ہمارے حضور تنہا پیش ہو گے...... تمہارے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہو گا اور "پولیس کا سپاہی" تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے آئے گا. وَ جَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ (۵۰/۲۱) "ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہو گا." اس کے علاوہ گواہ بھی ہوں گے...... وَّ شَهِیْدٌ (۵۰/۲۱). یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے. ان میں سے جسے بلایا جائیگا وہ آجائے گا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی. یہ ہیں وہ شَفِیْعٌ (ساتھ کھڑے ہونیوالے) جن کا ذکر قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ

عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ (۲/۲۵۵)" وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ
کھڑا ہو سکے"۔ یہ گواہ رسول بھی ہوں گے جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ
الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ (۵/۱۰۹) جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور اُن سے
پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی
اسی طرح بلائی جائیں گی۔ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ
اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ○ (۷۸/۳۸) جس دن "الرُّوْحُ اور مَلٰٓئِكَه" صف باندھے
کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست
بات کہے"۔ لہٰذا، ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت
دے دینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت خود قرآنِ کریم نے کر دی ہے جہاں فرمایا
وَ لَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ ؕ (۴۳/۸۶)
جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اس کا اختیار وہ رکھتا ہے
جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت ہیں۔ اسی التباس کے رفع کرنے
کے لئے رسول اللہ کو شَهِيْدٌ کہا ہے (۱۶/۸۹) شَفِيْعٌ کہیں نہیں کہا۔ اور دوسرے مذاہب کے
لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق اکثر مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ
الشّٰفِعِيْنَ (۷۴/۴۸) انہیں ان کے سفارشیوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے کہ خدا
کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں
اٹھا سکتا۔ جنّت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے۔ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ
(۴۳/۷۲)۔ سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوّتِ عمل سے محروم
ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا
جب وہ اپنی پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں
رہیں گے (۲/۸۰)۔ اس پر قرآنِ کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد
لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو
بھی غلط روش اختیار کرے گا وہ تباہ و برباد ہوگا اور جو ایمان کے ساتھ عملِ صالح کرے گا وہ جنّت

کا وارث ہوگا (۸۱ ۔ ۸۲/ ۲)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

(۱) اس دنیا میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جانا۔ اگر وہ اچھا کام ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا۔ اگر وہ کام بُرا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصّہ پائے گا۔

(۲) آخرت میں شفاعت کا تصوّر اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچّی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ یہ تمثیلی بیان ہے۔

(۳) مجرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حقدار نہیں، قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے، سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہیئے کہ وہاں کونسا مفہوم متصوّر ہے۔

یہ ہے اس لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے "سفارش" کے عقیدہ کی بڑی شدت سے مخالفت کی ہے لیکن "شفاعت" کے لفظ کو تعاون یا شہادت کے معنوں میں اور لفظ شفیع کو ساتھی یا مددگار کے مفہوم میں استعمال کر کے، اس کی اجازت بھی دی ہے اور تائید بھی کی ہے۔ یہ بات اس سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کئی ایک مقامات پر خود خدا نے اپنے آپ کو "شفیع" کہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس کے معنی "سفارش کرنے والا" لئے جائیں تو بات کچھ نہیں بنے گی۔ خدا تو حاکم یا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حاکم خود ہی سفارش کرنے والا نہیں ہو سکتا، لہٰذا، اس کے معنی ساتھی یا مددگار کے ہیں۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیْعٌ (۶/۵۱) خدا کے سوا ان کا کوئی سرپرست اور ساتھی نہیں (۶/۷۰؛ ۳۲/۴)۔ سورۂ زمر میں پہلے کہا۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۳۹/۴۳)

کیا یہ لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا "شفیع" بناتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ خواہ وہ کسی بات کا اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی عقل و فکر سے کام لینا جانتے ہوں، تو کیا تم پھر بھی

انہی کو اپنا "شفیع" بناؤ گے۔

اس کے بعد ہے۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ (۳۹/۴۴) ان سے کہو' شفاعت تمام تر (ساری کی ساری) صرف خدا کے لئے ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں "شفاعت" کے معنی کسی کی مدد کرنا یا ساتھ دینا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو تائید و حمایت صرف قوانینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان قوانین کے خلاف کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہی مفہوم ان مقامات میں ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "خدا کے اذن[1]" کے سوا کسی کی شفاعت کام نہیں دے سکتی۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ' قوانینِ خداوندی کے مطابق کھڑا ہوتا ہے تو اس کا اس طرح اس کے ساتھ کھڑا ہونا اسے فائدہ دے سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ (۱۰/۳) سورۂ مریم میں ہے۔ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۞ (۱۹/۸۷) ان کے سوا جنہوں نے خدا سے عہد باندھ رکھا ہو' کوئی کسی کی تائید و حمایت کا حق نہیں رکھتا۔ دوسری جگہ ہے۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۞ (۲۰/۱۰۹)

اس دن کسی کی شہادت کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ بجز اس کے کہ جسے خدا کا اذن حاصل ہو اور وہ ایسی بات کہے جو خدا کی بات سے ہم آہنگ ہو (۳۴/۲۳ ؛ ۲۱/۲۸)۔

"خدا کی بات سے ہم آہنگی" کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ شہادت قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔

دو ایک مقامات میں' ملائکہ کی "شفاعت" کا بھی ذکر ہے۔ ملائکہ وہ فطرت کی قوتیں ہیں جن سے نظامِ کائنات چل رہا ہے۔ فطرت کی یہ قوتیں آدمؑ (انسان) کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتی ہیں۔ یعنی انسان انہیں مسخر کر سکتا ہے۔ اب اگر انسان ان قوتوں کا استعمال' قوانینِ خداوندی کے مطابق کرے گا تو یہ اس کا ساتھ دیں گی' اس کی مدد کریں گی۔ اگر یہ ان قوانین کی خلاف ورزی

---

[1] اذن کے عام معنی تو حکم یا اجازت کے ہوتے ہیں لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد قوانینِ خداوندی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ خدا نے کہا ہے کہ اس کے احکام میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ سو جس حکم میں کبھی تبدیلی نہ ہو' وہ قانون بن جاتا ہے۔

کرے گا تو یہ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ یہ مقصد ہے "ملائکہ کی شفاعت" سے جو "اذنِ خداوندی" کے بعد کی جائے (۵۳/۲۶)۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے "شفاعت" کا صحیح مفہوم۔ اس سے مقصد یہ نہیں کہ مجرم کسی کی سفارش سے چھوٹ پائیں گے۔ جو شخص آگ میں انگلی ڈال کر اسے جلالے، کسی بڑے سے بڑے ذی اثر کی سفارش بھی اس کے درد میں کمی نہیں کر سکتی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ اس کی مدد (شفاعت) وہی کر سکے گا جو خدا کے قانون کے مطابق اس کا علاج کرے۔

اٹھارواں باب

اُخروی عذاب کا تعارف

اُخروی عذاب کے سلسلہ میں، ہمیں اب براہِ راست جہنّم کے موضوع کی طرف آجانا چاہیئے تھا کہ اس سے اس کا پورا تصوّر سامنے آسکتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس (عذاب) کے لئے قرآن کریم میں جو مختلف الفاظ آئے ہیں، پہلے ان کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

لفظ عذاب کے مادہ (ع۔ ذ۔ ب) کے بنیادی معنی ہیں۔ (۱) وہ اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں خلل انداز ہو اور (۲) رکاوٹ جو کسی کے راستے میں حائل ہو۔ دنیاوی عذاب میں ہر قسم کی تباہی اور بربادی، جسمانی تکلیف اور ذہنی اور قلبی اذیت سب شامل ہیں۔ لیکن اُخروی عذاب کی نوعیت کیا ہو گی ا۔سے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس وقت ہم اس کا بھی ادراک نہیں کر سکتے کہ خود اُس زندگی کی نوعیت، کُنہ اور کیفیت کیا ہو گی۔ قرآنِ کریم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہاں احساس بڑا شدید ہو جائے گا اس لئے اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کی شدّتِ احساس سے جس قسم کی اذیّت ہو سکتی ہے اس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لفظ "عذاب" کا دوسرا مفہوم ـــ یعنی زندگی کے راستے میں ناقابلِ تسخیر رکاوٹیں۔ اس کی کچھ وضاحت کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، زندگی کی موجودہ سطح میں، مقصدِ حیات انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ جس فرد کی ذات اس قدر نشوونما پا چکی ہو گی کہ وہ زندگی کی اس منزل سے اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو جائے، وہ آگے چلا جائے گا ـــ اسے جنّت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کی ذات میں اس قدر صلاحیت پیدا نہیں ہو گی، وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا، روک دیا جائیگا۔

یہ ہے وہ ناکامی جس کی شدّتِ احساس کا نام عذاب ہے. عَذُوْبٌ یا عَاذِبٌ اس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدّت کی وجہ سے کھانا پینا چھوڑ دے. اس میں آپ نے اس لطیف نکتہ کو بھی دیکھ لیا کہ یہ محرومی کہیں خارج سے عائد نہیں ہوتی. یہ انسان کی داخلی کیفیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے. اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں اُخروی عذاب کے لئے الفاظ تو اس محسوس دنیا سے متعلق استعمال کئے گئے ہیں. (کیونکہ انہی سے بات سمجھائی جا سکتی تھی) لیکن اس سے مقصود انسان کی داخلی اضطراب انگیز کیفیت کا اظہار ہے. (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) یہ کیفیت انسان کی ترقی کے رُک جانے کے احساس کی پیدا کردہ ہوگی. اس بنا پر اسے عذاب الجحیم سے تعبیر کیا گیا ہے.

عَذَابَ الْجَحِيْمِ

جَحِیْم جہنم ہی کا دوسرا نام ہے. اَجْحَمَ عَنْهُ کے معنی ہیں وہ اس سے رُک گیا. زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے راستے میں روک ہے جسے عَذَابَ الْجَحِیْمِ کہا گیا ہے. یہ عذاب زندگی میں آگے بڑھنے سے رُک جانے کی اضطراب انگیز کیفیت کا نام ہے. اہلِ جنّت کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی پیشانیوں کا نور ان کے راستوں کو روشن کئے چلا جائے گا اور یوں وہ آگے بڑھتے جائیں گے اور اس کا (آگے بڑھنے کا) سلسلہ غیر منقطع ہوگا. اس لئے لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَ وَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۴۴/۵۶﴾ اُس موت کے بعد جو انہیں دنیا کی زندگی میں آگئی پھر ان پر موت وارد نہیں ہوگی اور انہیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا جو آگے بڑھنے کے راستے بند ہو جانے سے قلبِ انسانی کو وقفِ اضطراب کر دیتا ہے. (نیز ۴۰/۷ ؛ ۵۲/۱۸). ان کے برعکس "اہلِ جہنّم" کے متعلق ہے. اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا ﴿۷۳/۱۲﴾ ان کے لئے ہمارے ہاں بڑی بڑی بیڑیاں ہیں یعنی جَحِیْم. اَنْكَالًا نے جَحِیْم کا مفہوم واضح کر دیا. یعنی ایسی روک جو انسان کو چلنے نہ دے. یہ رکاوٹیں کہیں خارج سے نہیں آئیں گی. یہ تو اس وقت بھی قدم قدم پر انسان کے دامن گیر ہو رہی ہیں لیکن اس وقت اسے ان کا احساس نہیں ہوتا. اُس وقت وہ نمودار ہو کر سامنے آجائیں گی. وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۷۹/۳۶ ؛ ۲۶/۹۱﴾ دیکھنے والے کے لئے جَحِیْم ابھار کر سامنے لے آئی جائے گی. اب وہ مستتر ہے. اُس وقت بارز ہو جائے گی.

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

آگے بڑھ جانے والوں کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے والوں کو جو احساس کمتری ہوگا اس جہت سے اس کیفیت کو "عَذَابٌ مُّهِيْنٌ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ذلّت آمیز عذاب (۴/۱۴) یا عَذَابَ الْهُوْنِ (۶/۹۴)۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۴۶/۲۰)۔ یعنی یہ لوگ دنیا میں نوعِ انسانی کے لئے کوئی نفع بخش اور تعمیری کام کئے بغیر بڑا بننا چاہتے تھے۔ اب یہ حقیقت کھلی کہ جھوٹی بڑائی (نقاب اُٹھ جانے کے بعد) ذلّت و کہتری کا موجب ہوا کرتی ہے۔ ملمع کو ایک تاؤ دیا جائے تو اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے اور اس سے جو احساسِ ذلّت پیدا ہوتا ہے وہ بالکل واضح ہے۔ یہی عذاب مھین یا عذاب الھون ہے۔ اسی کو تبدیلی جلود (کھال ادھیڑ کر صحیح شخصیت کے سامنے آجانے) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے (۴/۵۶)۔

عَذَابَ يَوْمٍ عَقِيْمٍ

"عقیم" کے معنی بانجھ پن یا بے اولاد رہ جانا ہی نہیں۔ انسان کی کوئی کوشش جب ثمر بار نہ ہو تو اسے بھی عقیم کہتے ہیں۔ نیز (۳) کے معنی بند کرنا۔ روکنا یا قطع کرنا بھی ہیں۔ اس لئے اس اصطلاح کا اطلاق انسان کی انتہائی ناکامی اور نامرادی پر ہوگا۔ اسے عَذَابَ يَوْمٍ عَقِيْمٍ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۲/۵۵)۔

تقابل

سورۂ رعد میں ہے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ○ (۱۳/۳۴)۔

ان کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ شاق گزرنے والا ہے اور انہیں خدا (کے اس عذاب) سے بچانے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ دنیاوی زندگی میں کتنی ہی بڑی اذیت اور پریشانی کیوں نہ ہو، وہ اُخروی زندگی

کی اذیت کے مقابلہ میں بہرحال کمتر ہے۔ وہاں احساسات کی شدت، یہاں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہو گی۔

عَذَابٌ عَظِيْمٌ

اسی جہت سے وہاں کے عذاب کو عَذَابٌ عَظِيْمٌ کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۲/۱۱۴) ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی ہوگی اور آخرت کا عذاب عظیم ہوگا۔ یعنی یہاں کی ذلت و رسوائی اس کے مقابلہ میں کچھ شے نہیں ہوگی۔ (نیز ۵/۳۳؛ ۵/۴۱؛ ۲۴/۲۳)۔ یہ "عذاب عظیم" کس جرم کی پاداش میں ہوگا۔ سورۂ آلِ عمران میں اس کے متعلق کہا گیا۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ
وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۰۴)

(مسلمانو! دیکھنا) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور فرقے پیدا کر لئے۔ ان لوگوں کے لئے عذاب عظیم ہوگا۔

بعض مقامات پر اسے عذاب یوم عظیم بھی کہا گیا ہے (۶/۱۵؛ ۱۰/۱۵؛ ۳۹/۱۳)۔ ان ہر سہ مقامات میں نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میں بھی قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں گا تو "عذاب یوم عظیم" سے محفوظ نہیں رہ سکوں گا۔

کہیں اسے عذاب یوم القیٰمۃ کہا گیا ہے (۵/۳۶؛ ۳۹/۲۴؛ ۳۹/۴۷)۔

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ

اُخروی زندگی کا عذاب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوگا۔ (اس کی تفصیل جہنم کے عنوان میں ملے گی)۔ آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے جائیں گے اور رُک جانے والے رُکے رہیں گے۔ اس لئے ان کا یہ احساس مستقل ہوگا۔ اس لئے اسے عذاب مقیم کہا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَ لَهُمْ

عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ؀ (۵/۳۷)؛ (۹/۶۸)؛ (۴۲/۴۵)۔

وہ (لاکھ) چاہیں گے کہ کسی طرح اس نار (آگ کے عذاب) سے باہر نکل جائیں۔ لیکن وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔ وہ عذاب قائم رہنے والا ہوگا۔

اسے عذاب خلد (۳۲/۱۴) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی ہمیشہ رہنے والا عذاب۔ (خلودِ جہنّم وجنّت کے متعلق اپنے مقام پر تشریح کی جائے گی)۔ اس عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی (۴۹/۴۰؛ ۳۶/۳۵)۔ بلکہ جوں جوں احساس تیز ہوتا جائے گا، عذاب کی شدت بڑھتی جائے گی (۷۸/۳۰)۔

عَذَابَ النَّارُ

مکمّل تباہی کے لئے عام طور پر "آگ" کی مثال لائی جاتی ہے جو ہر شے کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ چونکہ غلط روش پر چلنے والوں کی متاعِ حیات (آخرت میں) جھلس کر تباہ ہو جاتی ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے جہنّم کو آگ (نار) سے تشبیہہ دی ہے اور اس کی تمام تفصیلات اسی تشبیہہ کے محور کے گرد گھومتی ہیں جہنّم کی آگ، اس دنیا کی طبیعی آگ نہیں۔ وہ آگ، وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؁ (۱۰۴/۷-۶) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ سو، جہنّم کی آگ، دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ وہ طبیعی آگ نہیں۔ یہ مراد ہے عَذَابَ النَّار سے۔ یہی وہ عذاب ہے جس سے محفوظ رہنے کی، مومنین آرزوئیں کرتے ہیں۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ؁ (۲/۲۰۱؛ ۳/۱۵)۔ عَذَابَ النَّار کا نتیجہ ذلّت و رسوائی ہوتا ہے۔ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ (۳/۱۹۰) "جو آگ میں داخل کیا جاتا ہے وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی واضح ہو گیا کہ عَذَابَ النَّار سے مفہوم کیا ہے۔ وہ آگ نہیں جو چولہوں میں جلائی جاتی ہے۔ یہ شرفِ انسانیّت سے محرومی کی آتش سوزاں ہے۔ یہ فاسقین کا مقام ہے (۳۲/۲۰-۱۹) اور مفہوم اس سے ہلاکت ہے (۳۵/۴۶)۔

تپش وسوز

نار (آگ) کی نسبت سے عذابِ جہنّم کی مختلف کیفیات کو ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن میں تپش و سوز اور شدید حدّت و حرارت کا پہلو نمایاں ہو۔ (مثلاً) کئی ایک مقامات پر اسے عذابِ حریق سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ اس حرارت کو کہتے ہیں جو لوہے کو ریتی سے رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو سوہانِ روح کہتے ہیں۔ یہی اس عذاب کا صحیح مفہوم ہے۔ سورۂ انفال میں ہے کہ مجرمین کو ملائکہ طمانچے ماریں گے" اور کہیں گے کہ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۸/۵۰) سوزو تپش پیدا کرنے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ یعنی لَهٗ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ہ (۲۲/۹) ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن عذابِ حریق۔ یہ عذاب حریق کس کیفیت کا نام ہے اسے چند آیات آگے چل کر ان الفاظ میں بیان کیا گیا کہ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۲۲/۲۲) جب کبھی وہ اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے کہ ان کا غم دُور ہو، انہیں اس میں پھر سے دھکیل دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ عَذَابَ الْحَرِيْقِ کا مزہ چکھو۔ "مِنْ غَمٍّ" نے بات واضح کر دی۔ سورۂ بروج میں عَذَابُ جَهَنَّمَ اور عَذَابُ الْحَرِيْقِ کو مرادف بتایا گیا ہے (۸۵/۱۰)۔

شدتِ حرارت کی جہت سے ایک مقام پر اسے عَذَابَ السَّمُوْمِ بھی کہا گیا ہے (۵۲/۲۷)۔ اس کے لغوی معنی ہوتے ہیں وہ گرم تیز ہوا (لُو) جو جسم کے اندر گھس کر زہر کا اثر پیدا کرے۔ صحراؤں میں بادِ سموم کی پیدا کردہ تباہ کاریاں بڑی دہشت انگیز ہوتی ہیں۔

عَذَابِ جَحِيْم

اسی نسبت سے بعض آیات میں عذابِ جہنم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وہاں پینے کے لئے گرم کھولتا ہوا مشروب ملے گا۔ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۶/۷۰) گرم کھولتا ہوا مشروب۔ یعنی الم انگیز عذاب۔ (نیز ۱۰/۴)۔ سورۂ دخان میں ہے کہ کھولتا ہوا گرم پانی اس کے سر پر لنڈھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ہ (۴۴/۴۹) اس کا مزہ چکھ۔ تو دنیا میں اپنے آپ کو بہت بڑی قوت اور عزت کا مالک سمجھا کرتا تھا۔ جھوٹی عزت کا انجام، ذلت آمیز تباہی ہوتا ہے۔

عَذَابٌ اَلِيْمٌ

کرب و اذیت کی ان تمام کیفیات کو قرآنِ کریم نے ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جہاں اس

عذاب کو الیم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اَلَمٌ اس تکلیف کو کہتے ہیں جو اپنی درد انگیزی میں انتہائی شدت تک پہنچی ہو۔ اس سے عذابِ الیم کا تصور سامنے آسکتا ہے۔ یہ المناک کیفیت کس کس قسم کی محرومیوں کا نتیجہ ہوگی، اس کے متعلق کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ. ان کے لئے حیاتِ اُخروی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ. خدا ان سے بات نہیں کرے گا۔ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ. ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ یہ سامانِ نشوونما سے محروم رہیں گے۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥ (۳/۷۶)۔ یعنی انہیں نہایت المناک عذاب ہوگا۔ یہ اس المناک کیفیت کا نام ہے جس میں منافق مبتلا ہوتا ہے (۲/۱۰) یا وہ لوگ جنہیں اپنی غلط روش کا احساس زیادہ اس وقت پیدا ہو جب اس کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ ایسے شخص کی المناک قلبی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے (۴/۱۸)؛ (۵/۳۶؛ ۱۰/۴)۔

عَذَابٌ شَدِيْدٌ

درد ہو اس قدر الم انگیز، اور پھر اس کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جائے! اسی جہت سے اس اضطرابی کیفیت کو عَذَابَ الشَّدِيْدِ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۰/۷۰)؛ (۳۵/۷)۔ یہ شرک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ اپنے یا دیگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کا (۵۰/۲۶) یا ان کے لئے جو مقصودِ حیات، فقط دنیاوی مفادِ عاجلہ سمجھیں اور مستقل اقدارِ خداوندی کو درخورِ اعتنا قرار نہ دیں (۵۷/۲۰)۔

جہنم کے عذاب کی شدت کا اندازہ اس کیفیت سے لگائیے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وَ يَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷) وہاں اسے ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مرے گا نہیں۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَ مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ٥ (۱۴/۱۷) اس کے علاوہ ایسا عذاب جس میں تمام اذیتیں مرتکز ہو کر سخت ہو گئی ہوں۔ اسی جہت سے جہنم کے داروغوں کو غِلَاظٌ شِدَادٌ کہا گیا ہے (۶۶/۶)۔

یہ ہیں اس عَذَابَ اللّٰهِ (۱۴/۲۱) کی تشبیہی کیفیات جو انسان کی غلط روشِ زندگی کے فطری نتائج ہیں۔ ان سب کے لئے ایک جامع اصطلاح جہنم ہے جس کا تفصیلی تعارف آئندہ باب میں وجہ ہزار عبرت ہوگا۔

•••

اُنیسواں باب

زمانہ قدیم میں، یروشلم کے جنوب میں ایک وادی تھی جس میں مولوک دیوتا کا مندر تھا۔ وہاں انسانوں کو زندہ جلا کر اس (دیوتا) کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی۔ عبرانی زبان میں وادی کو جے کہتے ہیں اور جس شخص کی طرف وادی منسوب تھی اس کا نام ھنوم تھا۔ اس لئے اس وادی کو (جس میں انسانوں کو جلا کر قربان کیا جاتا تھا) "جے ھنوم" (یا جہنم[1]) کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے جہنم سے مراد انسانیت کی قربان گاہ ہوگی۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے، انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ذات نشو ونما پا کر، اس دنیا میں خوشگواریوں کی زندگی بسر کرے اور اس کے بعد (آخرت میں) مزید ارتقائی منازل طے کرنے

---

[1] بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ (جہنم) عربی الاصل ہے اور اس کے معنی گہرے گڑھے کے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہی ہے جسے قرآنِ کریم نے اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لئے اختیار کر لیا ہے۔

کے قابل ہو جائے. جس زندگی میں یہ مقصد حاصل ہوا سے جنّت کی زندگی کہا جائے گا۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی. اس کے برعکس، جس زندگی میں انسانی ذات کی نشوونما رُک جائے اور یوں اس کی مزرعِ حیات جھلس کر رہ جائے، وہ جہنّم کی زندگی ہو گی. انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) اس کی طبیعی زندگی کی ضروریات بغیر کسی پریشانی کے نہایت باعزّت طور پر پوری ہوتی رہیں اور

(۲) انسان سوائے ان حدود کی پابندی کے جنہیں خدا نے عائد کیا ہے، ہر طرح سے آزاد ہو. وہ احترامِ آدمیت کی فضاؤں میں سانس لے اور شرف و تکریم انسانیت کی وادیوں میں پروان چڑھے. وہاں نہ کوئی فرد کسی دوسرے کا محکوم یا محتاج ہو، نہ کسی کو کسی قسم کا خوف و حزن دامنگیر ہو. یہ معاشرہ جنّتی کہلائے گا. اس کے برعکس، جس معاشرہ میں، ایک انسان دوسرے انسانوں کا محکوم و محتاج ہو. جس میں انسانیت کی تذلیل اور آدمیت کی تحقیر ہوتی ہو. جس میں افرادِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات تک کے لئے دوسروں کے دستِ نگر، فلہٰذا ذلیل و خوار ہوتے ہوں. جس میں مستقل اقدارِ خداوندی کا کوئی خیال نہ رکھا جائے اور قوانینِ الٰہیہ سے سرکشی برتی جائے. وہ معاشرہ جہنّمی کہلائے گا. باقی رہی اگلی زندگی کے جہنّم کی کیفیات، سو قرآنِ کریم نے انہیں تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے ـــ اور بیان بھی اسی انداز میں کیا جا سکتا تھا، اس لئے کہ انسان اپنے شعور کی موجودہ سطح پر، اُس زندگی کے کوائف کا احساس و ادراک کر ہی نہیں سکتا جو عالمِ محسوسات سے ماوراء ہو.

قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ (اس زندگی میں) شعور کی اس سطح تک پہنچ چکے ہوں کہ جب غلط اور صحیح کو ان کے سامنے رکھا جائے تو وہ ان کے خطِ امتیاز کو تو سمجھ سکیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار نہ کریں. وہ ان میں سے ہوں گے جو زندگی کے ارتقائی سفر میں پیچھے رہ جائیں گے. اس دنیا میں تو وہ اس نقصان کو محسوس نہیں کرتے جو انہیں اس طرح لاحق ہو جاتا ہے. (کیونکہ وہ دنیاوی مفاد کے حصول ہی کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں اور جب یہ مفاد انہیں حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بڑے کامیاب و کامران تصوّر کرتے ہیں) لیکن حیاتِ اخروی میں ان کی نگاہوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے اور وہ یقین کی آنکھ سے دیکھ لیں گے کہ زندگی کی دوڑ میں اس طرح پیچھے رہ جانے سے ان کا کس قدر نقصان ہوا ہے. اس احساسِ زیاں سے ان پر جو اضطراب انگیز اور المناک کیفیت وارد ہو گی اس کا نام جہنّم کا عذاب ہے اور چونکہ وہاں اس نقصان کی تلافی (اس کمی کو پورا

کرنے) کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ (اس لئے کہ قانونِ ارتقاء کی رو سے جو نوع آگے نہیں بڑھتی بلکہ کسی ایک مقام پر رک جاتی ہے وہ پھر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی) اس لئے ان کے دل کی یہ جلن مستقل اور ان کی اضطرابی کیفیت غیر منقطع ہوگی۔

غلط اور صحیح کا خطِ امتیاز وحی کی رُو سے واضح ہوتا ہے۔ نزولِ قرآنِ کریم تک یہ خطِ امتیاز حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دوسرے انسانوں کے سامنے آتا رہا۔ لیکن نبی اکرمؐ کی بعثت کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ غلط اور صحیح کے امتیازی حدود و قیود، قرآنِ کریم کے اندر منضبط اور محفوظ کر دیئے گئے اور یہ فریضہ امتِ محمدیہ کے ذمہ عائد کر دیا گیا کہ وہ دوسروں تک اس پیغام کو پہنچا دے۔ گذشتہ صدیوں میں، اس امت نے یہ فریضہ کس حد تک ادا کیا، ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ لیکن ہمارے زمانہ میں، سامانِ رسل و رسائل کی فراوانی اور اسباب و ذرائع افہام و تفہیم کی ارزانی کا نتیجہ ہے کہ قرآنِ کریم کا پیغام، تمام مہذب دنیا تک پہنچ چکا ہے اور ان کی شعوری سطح بھی اتنی بلند ہو چکی ہے کہ وہ ان امتیازی خطوط کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ لہٰذا (کم از کم) اس دور کے مہذب انسانوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ انہیں غلط اور صحیح کا علم نہیں ہو سکا تھا یا وہ اسے سمجھنے کے قابل نہیں تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اس باب میں جن "جہنمی" قوموں کو تمثیلاً پیش کیا ہے، عصرِ حاضر کی مہذب اقوام اس زمرہ میں داخل ہیں۔ جہاں تک عقل و شعور کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے متعدد آیات میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے کہ اس بات کے پہچاننے میں چنداں وقت نہیں ہو سکتی کہ جہنم میں کون لوگ جائیں گے؛ یہ وہ لوگ ہیں۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود، سمجھ سوچ سے کام نہیں لیں گے۔ بلکہ اندھے گونگے بہرے بن کر اپنے جذبات کے پیچھے چلتے جائیں گے۔ اُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷/۱۷۹)۔ یہ انسان نہیں حیوانوں کی مثل ہیں — بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یعنی یہ دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اندھا دھند اپنی مفاد طلبی کی رَو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اقوامِ عاد و ثمود کے متعلق کہا ہے کہ كَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹/۳۸) وہ اربابِ بصیرت تھے۔ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ان کی جذبات پرستی نے ان کی غلط روش کو بڑا مزین بنا کر ان کے سامنے کھڑا کر رکھا تھا فَصَدَّهُمْ

عَنِ السَّبِيْلِ (۲۹/۳۸) اور یہ وہ دیوار تھی جو صحیح راستے میں روک بن کر حائل ہو گئی تھی۔ سورۂ احقاف میں ہے کہ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً۔ ہم نے انہیں سماعت و بصارت اور قلب (MIND) سب دے رکھے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (۴۶/۲۶) لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے اپنی ضد اور ہٹ کی بنا پر سرکشی اختیار کی تو ان کی آنکھیں، ان کے کان اور ان کے دل ان کے کسی کام نہ آسکے۔ جذبات پرستی نے انہیں اندھے، بہرے اور جاہل بنا دیا۔ سورۂ ملک میں ہے کہ جہنم کے داروغے، جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھیں گے کہ تم بڑے مہذب اور ارباب علم و دانش نظر آتے ہو، تم جہنم میں کیسے پہنچ گئے؟ وہ جواب دیں گے کہ

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (۶۷/۱۰)

اگر ہم پیغاماتِ خداوندی کو دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہم اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے۔

ان (اور اسی قسم کی قرآنِ کریم کی بیشتر اور) آیات سے واضح ہے کہ غلط روش اختیار کرنے کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے جن میں غلط اور صحیح کے امتیازی خط کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ جن کی ذہنی سطح اتنی بلند نہ ہو، وہ مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

دوسری شرط یہ تھی کہ صحیح اور غلط کے امتیازی خطوط ان لوگوں کے سامنے آچکے ہوں۔ اس سلسلہ میں بھی قرآنِ کریم کی بے شمار آیات حقیقت کشا ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (۱۷/۱۵)

ہم کسی قوم کو ماخوذ عذاب نہیں کرتے جب تک ان کے پاس کوئی پیغام پہنچانے والا نہ آجائے۔

اس حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ (۶/۱۳۲) یہ اس لئے کہ خدا کسی کو تباہ نہیں کرتا جو بے خبری کی حالت میں ہوں۔ ایسا کرنا ظلم ہے۔ (نیز دیکھئے ۲۰۹ ـ ۲۶/۲۰۸؛ ۲۸/۵۹)۔ سورۂ مومن میں ہے کہ جہنم کے داروغے اہلِ جہنم سے پوچھیں گے کہ اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ط

کیا تمہارے پاس پیغامات پہنچانے والے واضح تعلیم لے کر نہیں آتے تھے۔ قَالُوْا بَلٰی ؕ (۵۰/۴۰) وہ کہیں گے کہ ہاں! وہ آتے تھے۔ (نیز ۸ ـ ۹/۷۰)۔ ان مجرمین سے خود خدا کہے گا کہ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ (۵۰/۲۸) یہ حقیقت ہے کہ میں نے تمہیں پہلے ہی اس سے آگاہ (WARN) کر دیا تھا۔ (اس سلسلہ میں یہ آیات بھی دیکھئے ۵/۱۹؛ ۹/۱۱۵؛ ۹/۳۰؛ ۳۵/۴۲)۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ "اثباتِ جرم" کے لئے جن دو بنیادی حجتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ پوری ہو جانے کے بعد ہی انہیں مجرم قرار دیا جائے گا ـــ یعنی قانون کا علم اور اسے سمجھنے کی صلاحیت۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ذات پر اثر ہی ان اعمال کا مرتب ہوتا ہے جو بقائمی ہوش و حواس، اپنے اختیار و ارادہ کے ساتھ، جانتے بوجھتے سرزد ہوں۔ اور چونکہ جہنم نام ہی ان نقوش کے اثرات کا ہے جو غلط روشِ زندگی سے انسانی ذات پر مرتسم ہوں ـــ اس لئے ان لوگوں کے لئے جنت و جہنم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو نہ عقل و شعور رکھتے ہوں نہ اختیار و ارادہ ـــ اور اختیار و ارادہ کا سوال تو اس وقت سامنے آتا ہے جب غلط اور صحیح دونوں راستے متمیز ہو کر انسان کے سامنے آجائیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۚ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ (۲/۲۵۶)۔ چونکہ دین میں زبردستی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے غلط اور صحیح راستے واضح کر دیئے گئے ہیں۔ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا، اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر کے غلط روش اختیار کرلے۔

اور جانتے بوجھتے، غلط روش اختیار کرنے کا احساس، اور اس کے تباہ کن نتائج کی نمود وہ عذابِ جہنم ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیں گے (۱۰۴/۷)۔ جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس اضطرابی کیفیت کو، مختلف محسوس تشبیہات سے سمجھایا ہے۔ انہی کی تفاصیل آئندہ سطور میں سامنے آئیں گی۔

(۰)

دُنیا میں، جہنّم

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) جن جرائم کی پاداش اسی دنیا میں سامنے آجاتی ہے، قرآنِ کریم نے

اس (سزا) کو بھی عذاب سے تعبیر کیا ہے اور اس عذاب کو اکثر مقامات پہ جہنّم کہا گیا ہے۔ اس میں وہ سزائیں بھی شامل ہیں جو مجرمین کو اسلامی نظام کی عدالتوں کی طرف سے ملتی ہیں اور قوموں کا وہ انجام بھی جو اس دنیا میں تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ تباہی اور بربادی خود اس قوم کے افراد کے ہاتھوں سے بھی ظہور میں آتی ہے اور دوسری قوموں کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں بھی۔

لیڈروں کی بدعنوانیوں سے قوم جہنّم میں

سورۂ ابراہیم میں ہے:

> کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور کیا جنہوں نے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے ناسپاس گذاری کا ثبوت دیا۔ (انہیں غلط طریق سے صرف کیا) اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یعنی جہنّم میں۔ وہاں ان کی متاعِ حیات جھلس کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ کیسا تباہ کن تھا یہ مقام جس میں (ان کے لیڈر) انہیں لے گئے! (۲۸ — ۱۴/۲۹)۔

ذلّت کی زندگی جہنّم میں

جو قومیں، کارگہ کائنات پر غور و فکر نہیں کرتیں اور اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے کام نہیں لیتیں، وہ ذلّت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس زندگی کو عذاب النّار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

> یہ حقیقت ہے کہ تخلیقِ ارض و سما اور اختلاف لیل و نہار میں اربابِ عقل و دانش کے لئے (مقامِ آدمیت تک پہنچنے کے لئے) بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی اربابِ عقل و دانش کے لئے جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیق کائنات پر انتہائی غور و فکر کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی کوئی شے بھی بے مصرف پیدا نہیں کی گئی۔ اس تحقیق و تدقیق کا جذبہ محرکہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ عذاب النّار میں ماخوذ ہو جائیں گے اور جو قوم عذابِ النّا

میں ماخوذ ہوجاتے وہ ذلیل و خوار ہوجاتی ہے اور دنیا میں اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا (۱۸۹ — ۳/۱۹۱)۔

تسخیرِ فطرت کے بعد بھی جو قومیں مستقل اقدارِ خداوندی کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہیں انہیں بھی اس جرم کی سزا ملتی ہے۔ یہ سزا ذلّت و خواری کی شکل میں ان کے سامنے آتی ہے — أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ (۱۰/۲۷) ان کی زندگی جہنّم کی زندگی ہوتی ہے۔

بُزدلی اور بے حوصلگی جہنّم پیدا کر دیتی ہے

شرک کے معنی یہ ہیں کہ انسان یا تو فطرت کی قوتوں کو اپنے سے بالاتر سمجھ کر ان کے سامنے جُھک جائے اور یا اپنے جیسے انسانوں کو بالادست تصوّر کر کے ان کی محکومی اختیار کر لے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگ انتہائی بزدل ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں فریقِ مقابل کا رعب طاری ہوجاتا ہے۔ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ (۳/۱۵۰) اور یوں ان کا مستقر جہنّم ہو جاتا ہے۔

مغلوبیّت بھی جہنّم ہے

عربی قبائل نے حضور نبیِ اکرمؐ کی دعوت کی سخت مخالفت کی اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ثُمَّ يُغْلَبُونَ (۸/۳۶) یہ لوگ مغلوب ہوکر رہیں گے اس کے بعد ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ۝ (۳۶ — ۸/۳۷) جو لوگ اس نظامِ حق و صداقت کی مخالفت کریں گے وہ جہنّم میں اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ یہ وہ جہنّم تھا جو مختلف معرکوں میں، پیہم شکستوں کی صورت میں ان کے سامنے آیا تھا (اور جس کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا)۔ صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں جماعتِ مومنین کو اطمینان دلایا گیا کہ اس صلح سے (جو بظاہر شکست نظر آتی تھی) افسردہ خاطر ہونے کی وجہ نہیں تم عنقریب دیکھو گے کہ تمہیں کس قدر شادابیوں اور سرفرازیوں کی جنّت کی زندگی نصیب ہوتی ہے اور ان منافقین و مشرکین (مخالفین) کو کس طرح جہنّم رسید کیا جاتا ہے (۲ — ۴۸/۶)۔

باہمی تفرقہ اور عداوت کی زندگی جہنّم کی ہے

سورۂ آلِ عمران میں، جماعتِ مومنین کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ

تم سب کے سب، اجتماعی طور پر، یک جا ہوکر، خدا کی کتاب کے ساتھ متمسّک رہو اور باہمی تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہیں اس حالت سے نکال کر آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور ایک دوسرے کے دل آپس میں جوڑ دیئے۔ تم جہنّم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ خدا نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اس طرح خدا اپنے احکام و ضوابط کو واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم سیدھی راہ پر چلتے رہو (اور پھر جہنّم کا راستہ اختیار نہ کرلو)۔ (۳/۱۰۲)۔

گھر کی زندگی میں، جہنّم

قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کے لئے ہم آہنگیٔ فکر و نظر (یعنی خیالات کی مطابقت) کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں نظریات کی ہم آہنگی ہو تو گھر جنّت کا نمونہ بن جاتا ہے اور اگر ان میں اختلاف ہو تو گھر جہنّم ہو جاتا ہے فکر و نظر کے سلسلہ میں وہ شرک اور ایمان کے تقابل سے بات کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی مومن مرد کا مشرکہ عورت سے اور کسی مومن عورت کا مشرک مرد سے نکاح جائز نہیں۔ اس پابندی سے مقصد یہ ہے کہ وَ اللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّۃِ (۲/۲۲۱) اللہ تمہیں جنّت کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جو اس کے خلاف جاتے ہیں اور ازدواجی زندگی میں خیالات کی مطابقت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ اُولٰٓئِكَ یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ (۲/۲۲۱) وہ جہنّم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

غلط معاشرہ میں جہنّم کی زندگی

جب مدینہ میں اسلامی نظام قائم ہوگیا تو عام دعوت دی گئی کہ جو مسلمان مختلف مقامات میں بستے ہیں وہ وہاں سے ہجرت کرکے مدینہ آجائیں اور اس طرح اسلامی فضا میں زندگی بسر کریں [illegible]

سلسلہ میں کہا کہ جو لوگ ہجرت کر سکنے کی استطاعت اور امکان کے باوجود نقل مکانی نہ کریں اور غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی بسر کرنے پر مطمئن رہیں فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (۴/۹۷) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ جہنم اس دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔

جرائم کی سزا کو جہنم سے تعبیر کیا گیا

جب اسلامی نظام قائم ہو جائے تو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرنے والوں کو اسلامی عدالت سے سزا ملتی ہے۔ اس سزا کو بھی قرآنِ کریم نے اس دنیا کے جہنم سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ جہنمی زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کے لئے اخروی زندگی میں بھی جہنم ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جس جہنم کا ذکر کیا ہے اس کا اطلاق ان دونوں زندگیوں پر ہو سکتا ہے۔ سورۂ مجادلہ میں منافقین کے سلسلہ میں کہا کہ وہ اسلامی نظام کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر یہ نظام حق پر مبنی ہے تو ہمیں ہماری کارستانیوں کی سزا کیوں نہیں دی جاتی۔ اس کے جواب میں کہا کہ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۵۸/۸)۔ ظاہر ہے کہ اس جہنم سے مراد وہ سزا بھی ہو سکتی ہے جو انہیں اسلامی نظام کے ہاتھوں بعد میں ملی تھی۔

سورۂ نساء میں ہے کہ جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے اور خدا کا غضب اور اس کی لعنت۔ ظاہر ہے کہ اس عذابِ جہنم میں دنیاوی سزا بھی شامل ہے (۴/۹۳)۔

سورۃ البروج میں ہے کہ جو فتنہ پرداز مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اذیت دیتے ہیں، اور کہنے سننے کے باوجود اپنی اس روش سے باز نہیں آتے فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝ ان کے لئے جہنم کا سوزندہ عذاب ہوگا۔ یہ وہی سزا ہے جو ان لوگوں کو اسلامی نظام کی طرف سے ملی تھی۔ دوسرے مقام پر ان منافقین کے متعلق جو شریف زادیوں کو راہ چلتے تنگ کرتے تھے، مختلف سزاؤں کا ذکر ہے (۶۰ — ۳۳/۶۱)۔

حضرت سلیمانؑ کے زیرِ فرمان بہت سے وحشی قبائل کے افراد مختلف کام کیا کرتے تھے۔ ان کے سلسلہ میں کہا کہ ان میں سے جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتا تھا اسے عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝ کا مزہ چکھایا جاتا تھا (۳۴/۱۲)۔ دوسرے مقام پر "عَذَابَ السَّعِيْرِ" کی تشریح ان الفاظ میں

کر دی کہ ایسے مجرمین کو زنجیریں پہنا کر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے (۱۱-۱۳/ ۲۵)۔
سورۃ الدھر میں ہے کہ کفار (مجرمین) کے لئے طوق اور زنجیریں اور السَّعِیْر ہے (۷۶/۴)۔ سورۃ ابراہیم میں کہا کہ مجرمین کو اکٹھے زنجیروں میں جکڑا جائے گا (۱۴/۴۹) اور اس طرح انہیں گھسیٹ کر شعلہ خیز نار میں ڈال دیا جائے گا (۱۷-۷۲/۴۰)۔ سورۃ مزمل میں ہے کہ ان حق کی مخالفت کرنے والوں کو ہمارے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو۔ ہمارے پاس ان کے لئے بیڑیاں ہیں۔ انہیں روک رکھنے کا سامان ہے اور ایسا کھانا ہے جو حلق میں اٹک کر رہ جائے (۱۱-۱۳/ ۷۳)۔ سورۃ حاقہ میں کہا گیا کہ وہ زنجیریں بڑی لمبی لمبی ہیں (۶۹/۳۲)۔
ان تفاصیل سے ظاہر ہے کہ یہ اس سزا کا ذکر ہے جو مجرمین کو اس دنیا میں ملتی ہے۔

اسلامی نظام کے مخالفین کا انجام

نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کا آخری حربہ یہ تھا کہ وہ اس نظام کو ختم کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں اُتر آئے۔ قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اگر اپنے پروگرام پر استقامت سے جمے رہے تو ان لوگوں کو شکست ہوگی۔ اس طرح شکست خوردہ مجرمین کی جو کیفیت ہوتی ہے، قرآنِ کریم نے اسے بھی جہنم سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان لوگوں کو بیشک اس وقت ملک میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے لیکن مَتَاعٌ قَلِیْلٌ یہ بہت تھوڑی مدت تک اس سے متمتع ہو سکیں گے۔ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ہ (۳/۱۹۷) اس کے بعد ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ بہت بُری جائے قرار ہے۔ اس سے ذرا پہلے ہے کہ ان لوگوں کو متنبہ کر دو کہ تم عنقریب مغلوب و مفتوح ہو گے۔ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ط وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ہ (۳/۱۱) اور جہنم کی طرف کشاں کشاں لے جائے جاؤ گے۔ اس کے جنگِ بدر کی تفاصیل ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جہنم وہی ہے جو ان سردارانِ قریش کے سامنے جنگِ بدر میں شکست کی صورت میں آیا تھا۔

سورۃ توبہ میں، اسلامی نظام کے خلاف جنگ کرنے والوں کا ذکر اور ان کے انجام کا تذکرہ متعدد مقامات پر تفصیل سے آیا ہے اور ان کے عبرت ناک انجام کو جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بات یوں شروع کی گئی ہے کہ

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ

خَالِدًا فِيهَا ط ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ٥ (۹/۶۳)
کیا ان لوگوں کو اس کا علم نہیں کہ جو خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کے لئے اٹھتا ہے اس کا انجام جہنّم کی آگ ہوتا ہے جس میں اسے رکھا جاتا ہے اور یہ ذلّت و رسوائی بہت بڑی ہوتی ہے۔

"ذلّت و رسوائی" کے عذاب نے جہنّم کی وضاحت کر دی ہے۔ اسی نارِ جہنّم سے منافقین کو آگاہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ ذرا اس پر غور کر لیں کہ اقوامِ گذشتہ میں سے جنہوں نے حق کی مخالفت کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا (۶۸ ـ ۹/۶۹)۔ ظاہر ہے کہ اقوامِ گذشتہ کی یہ تباہی اسی دنیا میں ہوئی تھی' اس لئے اسے ان کے سامنے بطورِ عبرت و موعظت پیش کیا گیا۔

رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ ان مخالفین (کفار اور منافقین) کے خلاف جنگ کرو اور انہیں سختی سے دباؤ۔ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ (۹/۷۳) تم دیکھ لو گے کہ کس طرح ان کا انجام جہنّم ہوتا ہے۔

مدینہ میں بہت سے منافقین تھے۔ یہ لوگ بظاہر جماعتِ مومنین کے ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن بباطن ان کی مخالفت کرتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں ان کی منافقت کی پردہ دری ہو جاتی تھی۔ یہ اسلامی لشکر کا ساتھ نہیں دیتے تھے اور اس کے لئے طرح طرح کی عذر تراشیاں کرتے تھے۔ ان کے متعلق کہا کہ سرِ دست ان سے اعراض برتو۔ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹/۹۵) انہیں ان کے کئے کی سزا ملے گی' انہیں جہنّم رسید کیا جائے گا — اور وہ سزا یہ تھی کہ اسلامی نظام غالب آیا اور یہ منافقین نیست و نابود ہو گئے۔

سورۃ انفال میں جنگِ بدر کی تفاصیل بڑی شرح و بسط سے آئی ہیں۔ ایک مقام پر میدانِ جنگ میں فریقِ مقابل کی گردن زدنی کے بعد کہا کہ ان کا یہ انجام اس لئے ہوا کہ انہوں نے اسلامی نظام کے قیام کی شدّت سے مخالفت کی تھی۔ اس لئے اب یہ اس عذاب کا مزہ چکھیں اور اس طرح اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں کہ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (۱۳ ـ ۸/۱۴) حق کی مخالفت کرنے والوں کے لئے آگ کا عذاب ہوتا ہے۔ ان لڑائیوں کے سلسلہ میں ان مخالفین نے جس قدر دولت صرف کی' اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ جب مغلوب و مفتوح ہوں گے تو انہیں اس کا بے حد افسوس ہو گا کہ ہم نے اس قدر دولت ناحق ضائع کی۔ اس کے بعد ہے کہ وَالَّذِيْنَ

كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ (۸/۳۶) حق کی مخالفت کرنے والوں کو یوں جہنم کی طرف ہانک کرلے جایا جاتا ہے۔

سورۂ قمر میں ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے حق کی مخالفت کے لئے متحدہ محاذ قائم کرلیا ہے ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ ان سے کہا کہ تم دیکھو گے کہ تمہارے یہ جرار لشکر، میدان جنگ سے کس طرح پیٹھ دکھاکر بھاگتے ہیں۔ ابھی وہ انقلاب آجائے گا جس سے تمہیں متنبہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس وقت واضح ہو جائے گا کہ مجرمین کس تباہی میں ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس وقت انہیں النّار میں گھسیٹا جائے گا اور کہا جائے گا کہ عذابِ سقر کا مزہ چکھو (۴۴-۴۸/۵۴)۔

سورۂ تحریم میں اس تمام تفصیل کو ایک آیت میں سمٹا دیا جب کہا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (۶۶/۹)

اے نبیؐ! ان حق کے مخالفین کفار اور منافقین کے خلاف جنگ کرو اور انہیں سختی سے دباؤ۔ ان کا انجام جہنم ہوگا اور وہ بہت بُری جائے قرار ہے۔

سورۂ توبہ میں اس جہنم کے متعلق کہا کہ وہ انہیں چاروں طرف سے محیط ہے۔ یہ اب اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے (۹/۴۹)۔ اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ چند ہی دنوں کے اندر اندر یہ حقیقت کس طرح محسوس شہادت بن کر سامنے آگئی۔ مخالفین، سب کے سب، خاسر و نامراد رہ کر ذلیل و خوار ہوگئے اور اسلامی نظام کامران و شادکام انسانیت کی نجات کا ضامن بنا۔ انہیں بار بار متنبہ کیا جاتا تھا کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ کریں کہ جن میں جماعتِ مومنین کو مجبوراً میدانِ جنگ میں اترنا پڑے۔ لیکن وہ، اپنی قوت کے نشہ میں بدمست، ان تنذیرات کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم ہمیں خالی دھمکیاں کیوں دیتے ہو۔ اس تباہی کو لے کیوں نہیں آتے جس سے ہمیں اس طرح ڈراتے رہتے ہو۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ لے کاش! انہیں معلوم ہو سکتا کہ جب وہ تباہی آئے گی تو اس کے شعلوں سے انہیں کسی جگہ بھی پناہ نہیں مل سکے گی (۲۱/۳۹)۔ اس وقت ان کی آنکھوں پر (خودفریبی کے) پردے پڑے ہوئے ہیں اس لئے یہ اس تباہی کو دیکھ نہیں سکتے لیکن مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۸۲/۱۶) یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں وہ انہیں چاروں طرف سے گھیرے

ہوئے ہے (۹/۴۹)۔

اسلامی نظام کی سب سے زیادہ شدید زد، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دار طبقہ پر پڑتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اس نظام کے قیام کی سب سے شدید مخالفت (اربابِ اقتدار کے ہراول دستوں کی شکل میں) انہی طبقوں کی طرف سے ہوتی ہے اور اس نظام کے قیام کے بعد، یہی لوگ سب سے پہلے جہنّم کے عذاب میں ماخوذ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا کہ یہ لوگ حق و صداقت کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں آنے دیتے اور اس طرح دنیا کماتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ (۲/۱۷۴) وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ یہی الفاظ یتیموں کا مال کھا جانے والوں کے متعلق آئے ہیں (۴/۱۰)۔

سورۂ توبہ میں سرمایہ دار طبقہ کو انہی کے ساتھ ہم توس کرکے کہا۔

> اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت سے کبھی غافل نہ ہونا کہ مذہبی علماء و مشائخ میں سے بیشتر کی حالت یہ ہے کہ وہ بغیر خود کچھ کام کئے، لوگوں کی کمائی ناحق کھا جاتے ہیں اور انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے۔ اور اسے بھی سمجھ رکھنا کہ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں (یعنی نوعِ انسان کی بہبود کے لئے) کھلا نہیں رکھتے، ان کا انجام بڑی الم انگیز تباہی ہوگی۔ (اس انقلاب کے وقت) یہ چاندی سونے کے سکّے جہنّم کی آگ میں تپائے جائیں گے اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائیگا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت جسے تم نے صرف اپنی ذات کے لئے دبا کر رکھ چھوڑا تھا (۳۴-۹/۳۵)۔

اس سے دو ہی آیات بعد، جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم اس نظامِ باطل کے خلاف جنگ کے لئے باہر نکلو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خدا تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا جو مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے اس انسانیت کش نظام کو ختم کر دے گی۔

لیکن جو قوم اس نظامِ حق و صداقت کو قائم کرنے کے بعد اسے چھوڑ بیٹھے اور خود ہی ملوکیت، مذہبی

پیشوائیت اور سرمایہ داری کے اس نظام کو قائم کر لے جسے انہوں نے مٹایا تھا، تو ان کے متعلق کہا کہ ان پر عذابِ جہنم مسلط ہو جائے گا. فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ٥ (۲/۸۶) ان کے اس عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

یہ وہ عذابِ جہنم ہے جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں لیکن خود فریبی ایسی کہ اس زعمِ باطل میں گرفتار ہیں کہ " دوزخ کا عذاب کافروں کے لئے "ہے" ہمارے لئے نہیں. سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

زِ دوزخ واعظِ کافر گرے گفت
حدیثِ خوشتر از وے کافرے گفت
"نداند آں غلام احوالِ خود را
کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

جہنّم قلبی کیفیت کا نام ہے

"بانگِ درا" میں "سیرِ فلک" کے عنوان سے علامہ اقبالؒ کی ایک نظم ہے جو جہنّم کی حقیقت کو بڑے معنی خیز اور بصیرت افروز انداز سے سامنے لاتی ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ جب وہ جنّت کے "خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش" نظارہ سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے دور ایک یخ بستہ سرد خانہ دیکھا۔ اپنے گائڈ (فرشتہ) سے پوچھا کہ یہ خطۂ زمہریر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جہنّم ہے۔ اس پر انہوں نے بصد استعجاب کہا کہ ہم نے تو سُن رکھا ہے کہ جہنّم میں بھڑکتے ہوئے شعلے ہوں گے اور آپ اس یخ بستہ خطّے کو جہنّم بتا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ جہنّم ہی ہے' اس کے شعلے اپنے نہیں ہوتے۔

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

اور انہی کے انگاروں سے اس میں حدت پیدا ہوتی ہے۔ یہی جہنّم کی صحیح حقیقت ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے خود انسانوں کو جہنّم کا ایندھن بتایا ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ج (۲/۲۴) وہ آگ جس کا ایندھن پتھر نما انسان[1] ہیں۔ (نیز ۶۶/۶)۔ سورۂ آلِ عمران میں کہا کہ اُولٰٓئِكَ هُمْ

---

[1] اَلنَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ کے مختلف مفاہیم بیان کئے جاتے ہیں۔ اس مقام پر ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے خود انسانوں کو جہنّم کا ایندھن بتایا ہے۔ اس لئے انسانوں کے خود اپنے دل کی آگ ان کیلئے آتشِ دوزخ بنتی ہے۔

وَ قُوْدُ النَّارِ ۙ (۳/۹) یہ لوگ خود ہی جہنم کا ایندھن ہیں. سورۂ انبیاء میں باطل پرستوں سے کہا کہ تم اور جن کی تم معبودیت (محکومیت) اختیار کرتے ہو حَصَبُ جَهَنَّمَ. جہنم کا ایندھن ہیں (۲۱/۹۸). سورۂ جنّ میں صحیح راستے سے ہٹ جانے والوں کے متعلق کہا کہ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ (۷۲/۱۵) یہ جہنم کا ایندھن ہیں. جہنم کی آگ ان کی بھڑکائی ہوئی ہوتی ہے. خود ہی اسے جلاتے ہیں اور خود ہی اس میں جلتے ہیں. نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ ؕ (۱۰۴/۷) خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں.

مسجد اسلامی نظام کا مقامِ اجتماعیت ہے. اس لئے اس کا نظم و نسق نظام کے مرکز ہی کے زیرِ اہتمام ہونا چاہیئے. لیکن، مدینہ میں، مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کے لئے، کچھ لوگوں نے ایک الگ مسجد تعمیر کردی. ان کا یہ اقدام اسی قدر خطرناک تھا کہ خود خدا نے رسول اللہ کو اس سے آگاہ کیا اور کہا کہ دیکھنا تم اس مسجد میں ایک قدم نہ رکھنا. تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے اس مسجد کو منہدم کرادیا اور اس طرح ان لوگوں کی سازش ناکام کردی گئی. ان لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے اس مسجد کی بنیاد تباہی کے کنارے پر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وہ عمارت، اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم میں گر گئی. یہ جہنم کیا تھا؟ رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ (۹/۱۱۰) ان کے دِل اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن گئے اور اس اضطرابی کیفیت نے ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا. یہ ہے جہنم.

(جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) جن لوگوں کا اس دنیا کی زندگی میں شعور بیدار ہوچکا ہوگا لیکن انہوں نے اپنی ذات کی نشوونما نہیں کی ہوگی، انہیں موت کے بعد کی زندگی میں اس کا شدید احساس ہوگا کہ وہ زندگی کے ارتقائی مراحل میں پیچھے رہ گئے. احساس کی بیداری، لیکن زندگی کی بلند سطح سے محرومی کی اس کیفیت کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى (۲۰/۷۴)؛ (۸۷/۱۳) جہنم میں نہ تو انہیں زندگی نصیب ہوگی اور نہ ہی موت آئے گی. یہ کیفیت کس قدر کرب انگیز ہوگی. اس کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ (۱۴/۱۷) انہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ

مریں گے نہیں! یہی عذاب کچھ کم الم انگیز نہیں ہوگا کہ وَ مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ٥ (۱۴/۱۸) اس کے ماورا، اور شدید عذاب بھی ہوگا۔ وہ وہاں چلّا چلّا کر ہلاکت کو پکاریں گے (کہ کسی طرح ان کا خاتمہ ہوجائے)۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم ایک بار چھوڑ، ہزار بار ہلاکت کو آوازیں دو، وہ تمہارا خاتمہ کرنے کو نہیں آسکتی (۱۳-۱۴/۲۵)۔ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا۔ (۳۵/۳۶) نہ وہ عذاب اتنا ہوگا کہ اس سے وہ مرجائیں اور نہ ہی اس میں تخفیف ہوگی۔ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا ٥ (۷۸/۴۰) حق سے انکار کرنے والا شدتِ اضطراب سے تنگ آکر چیخ اٹھے گا کہ اے کاش! میں ذی احساس انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودا ہوتا تو اس عذاب میں گرفتار تو نہ ہوتا!

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا جاتا ہے — تخریبی اعمال کا اثر تخریبی — تعمیری کا تعمیری — اس اعتبار سے دیکھئے تو انسان کی جنّت اور جہنم، اس کی زندگی ہی ساتھ کے ساتھ تیار ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن انسان کی جذبات پرستیاں اس طرح اس کی آنکھوں پر پردے ڈالے رکھتی ہیں کہ وہ اس جہنم کو دیکھ نہیں سکتا۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں، یہ پردے اُٹھ جائیں گے ہر شے اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائے گی۔ اس وقت خود فریبی کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ اس لئے جو جہنم یہاں نگاہوں سے مستور ہے، وہاں بے حجاب ہوکر نظر آنے لگ جائے گی۔ سورۂ کہف میں ہے۔ وَ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا۔ ہم اس دن جہنم کو ابھار کر ان کی آنکھوں کے سامنے لے آئینگے۔ نِ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِىْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِىْ وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ٥ (۱۸/۱۰۰-۱۰۱) ان لوگوں کے سامنے جن کی دنیاوی زندگی میں کیفیت یہ تھی کہ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے رہتے تھے جن کی وجہ سے وہ ہمارے قوانین کو اپنے سامنے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جن کے کانوں میں ڈاٹ لگ چکے تھے جن کی بنا پر وہ تنذیرات کو سُن نہیں سکتے تھے۔ دوسری جگہ ہے۔ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ٥ (۲۶/۹۱) جو لوگ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے تھے جہنم کو ابھار کر ان کے سامنے لے آیا جائے گا۔ اِس وقت وہ جہنم مستور ہے، اس وقت بارز ہوجائے گی۔ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۷۹/۳۶) اس کے لئے بارز ہوجائے گی جس کے پاس اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ہوں گی۔ اس وقت اُس جہنم کا اندازہ صرف علمی طور پر لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس وقت یہ کیفیت ہوگی کہ

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ. تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے. ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ٥ (۶-۷/۱۰۲) اور یوں تمہیں اس کے متعلق عین الیقین حاصل ہو جائے گا. یہی وجہ ہے جو کہا گیا ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ٥ (۹/۴۹؛ ۲۹/۵۴) یہ حقیقت ہے کہ جہنم، کفار کو اس وقت بھی ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے. یہ اُسے نہیں دیکھتے لیکن وہ انہیں ہر وقت اپنی نگاہوں میں رکھتی ہے. وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۸۲/۱۶) یہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں، وہ ان کی گھات میں ہے (۷۸/۲۱)

سورۃ الفجر میں ایک عظیم حقیقت کو ایک بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے. عام طور پر تو یہی کہا گیا ہے کہ مجرمین کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا. لیکن اس سورہ میں ہے وَجِآئَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (۸۹/۲۳) اس دن جہنم کو لایا جائے گا. یعنی جہنم خود آگے بڑھ کر انسان کو اپنے اندر دبوچ لے گی.

اور جہنم ہی کیا. وہاں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُس دن

وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ٥ (۸۹/۲۲)

تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئینگے.

اس سے محشر کے متعلق بڑی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. یعنی وہ کوئی خاص مقام نہیں جہاں انسان جا کر جمع ہوں گے. خدا اور ملائکہ خود آئیں گے اور اسی طرح جہنم بھی لائی جائے گی. وَفِيْهَا بَصَآئِرُ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥

جہنّم کی تفاصیل

جہنّم ہے تو انسان کی قلبی کیفیت کا نام. لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ غیر محسوس، مجرد حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے تاکہ جہاں اربابِ علم و بصیرت ان حقائق کو فکری طور پر سمجھیں، عام انسان اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان کا اثر لے سکیں. یہ اندازِ بیان، بلند اور فروتر ذہنی سطح رکھنے والے، دونوں طبقات کے لئے مفید ہوتا ہے. بلند فکری سطح کا انسان ان محسوس تمثیلات سے، کیفیات کا اندازہ لگا سکتا ہے اور عام ذہنی سطح کے انسان ان سے عبرت و موعظت حاصل کر لیتے ہیں. اور یہی درحقیقت جنّت اور جہنّم کے متعلق تفصیلی بیانات سے مقصود ہے. ویسے بھی قرآنِ کریم، انسانوں کی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اس لئے حقائق کی افہام و تفہیم کے لئے جو انداز انسانی دنیا میں اختیار کئے جاتے ہیں، قرآنِ کریم نے بھی وہی انداز و اسالیب اختیار کئے ہیں. ان محسوس تمثیلات کی رو سے، آگ میں جل جانے کی وجہ سے پیدا شدہ شدّتِ درد کو مرکزی حقیقت دے کر، باقی تفاصیل کو اس مرکز کے گرد گردش دی گئی ہے یا کھیتی کی مثال سے، ایسے عناصر کو سامنے لا کر جن سے فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی جو محنت، قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی، وہ کس طرح رائیگاں چلی جاتی ہے. ہم ان آیات میں، قرآنِ کریم کے الفاظ اور ان کے لغوی معانی پیش کریں گے. ان کا مجازی مفہوم کیا ہے، اسے قارئین کے اپنے فہم پر چھوڑ دیں گے. (البتہ جو صاحب یہ دیکھنا چاہیں کہ میں نے ان کا مجازی مفہوم کیا سمجھا ہے، وہ اسے میری لغات القرآن یا مفہوم القرآن میں دیکھ سکتے ہیں). اس تمہید کے بعد قرآنِ مجید کے الفاظ

میں جہنم کی تفاصیل ملاحظہ کیجئے۔

--- ooooo ---

آگ کے شعلے

سورۂ تکویر میں ہے۔ وَ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ (۸۱/۱۲) جب جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ۝ (۱۷/۹۷) جب اس کی آگ ذرا ٹھنڈی ہونے لگے گی تو اسے اور زیادہ تیز کر دیا جائے گا۔ وہ آگ اہلِ جہنم کے چہروں کو جھلس دے گی (۲۳/۱۰۴)۔ اس کا دھواں اور شعلے ہر طرف سے محیط ہوں گے (۵۵/۳۵)۔ اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿ج﴾ (۱۵-۱۶/۷۰) وہ شعلہ فگن آگ کلیجہ کو کھینچ کر نکال لے گی۔ اس کے دھوئیں کا سایہ تین شاخوں والا ہو گا جس سے کہیں جائے پناہ نہیں مل سکے گی۔ وہ اتنے بڑے بڑے شعلے پھینکے گی گویا وہ بلند عمارات ہیں یا زرد اونٹ (۳۰-۳۳/۷۷)۔ اس میں اہلِ جہنم کو ڈال کر اوپر سے بند کر دیا جائے گا (۹۰/۲۰)۔ اس کا نام ہاویہ ہے یعنی بھڑکتی ہوئی آگ (۹-۱۱/۱۰۱) اس طرح ان کے اوپر اور نیچے سب آگ ہی آگ ہو گی (۱۶/۳۹)۔ وہ آگ کھالوں کو پگھلا دے گی۔ جب ان کی ایک جلد (کھال) جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال بدل دی جاتے گی اور اس طرح وہ مسلسل عذاب میں ماخوذ رہیں گے (۴/۵۶)۔ اہلِ جہنم کے کپڑے بھی آگ سے قطع کئے جائیں گے۔ ان کے سروں پر سے کھولتا ہوا پانی بہایا جائے گا۔ اس سے ان کی کھال اور انتڑیاں گل جائیں گی اور لوہے کے گرزوں سے ان کا کچومر نکال دیا جائے گا (۱۹-۲۱/۲۲)۔

کھولتا ہوا پانی

جہنم کی قناتیں اور شامیانے چاروں طرف سے محیط ہوں گے۔ وہ پانی کے لئے واویلا مچائیں گے تو انہیں تلچھٹ جیسا پانی ملے گا جو ان کے مُنہ جھلسا دے گا (۱۸/۲۹)۔ اس سے ان کی انتڑیاں کٹ جائیں گی۔ (۴۷/۱۵)۔ اس کھولتے ہوئے پانی سے بڑی الم انگیز اذیت پہنچے گی (۶/۷۰)؛ (۱۰/۴)۔ وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے لیکن اس کے باوجود وہ حلق سے نیچے نہیں اترے گا (۱۶-۱۴/۱۷)۔ ان کے چاروں طرف اسی قسم کا کھولتا ہوا پانی ہو گا (۵۵/۴۴)۔ اس کھولتے ہوئے پانی میں اُبلنا اور آگ میں جل جانا، اس سے

ان کی تواضع ہوگی (۹۳-۹۴/۵۶)۔ اس کے ساتھ ہی جُھلسا دینے والی لو، سیاہ دھوئیں کے سائے، پینے کو وہ مشروب جو نہ ٹھنڈا ہو نہ نفع بخش (۴۲-۴۵/۵۶)۔ تھکے ماندے، ذلیل و خوار، جہنّم کی آگ میں جھونکے جائیں گے اور کھولتے ہوئے چشمے سے انہیں پانی پلایا جائے گا (۲-۵/۸۸)۔

بعض مقامات میں، کھیتی کی مثال سے سخت گرم اور یخ بستہ سرد پانی کا بھی ذکر ہے۔ پانی گرم ہو یا بہت ٹھنڈا، کھیتی دونوں سے جل جاتی ہے۔ اس لئے شدید گرم کے ساتھ سخت ٹھنڈا پانی بھی عذابِ جہنّم میں سے ہے۔ یعنی حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا (۲۵/۷۸)؛ (۵۷/۳۸)۔

کھانے کو — شَجَرۃُ الزّقوم

پینے کو اس قسم کا پانی اور کھانے کے لئے شجرۃ الزّقوم — یہ، عام طور پر ناگ پھن تھوہر کو کہتے ہیں۔ لیکن عرب محاورہ کی رُو سے ہر تلخ اور سخت ناگوار شے کے لئے اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ

> یہ وہ درخت ہے جو جہنّم کی جڑ سے اُگتا ہے۔ اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے ناگ پھن تھوہر ہو۔ اس سے اہلِ جہنّم اپنا پیٹ بھر لیں گے اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا (۶۴-۶۷/۳۷)۔

سورۃ الدخان میں ہے کہ

> شجرۃ الزّقوم کھانے کو ملے گا تو وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹ میں کھولے گا۔ (منظر کچھ اس قسم کا ہوگا کہ) مجرم کو گھسیٹ کر عین دوزخ کے درمیان لایا جائے گا۔ اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا۔ شجرۃ الزّقوم اس کے سامنے رکھا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ
>
> اسے چکھ۔ تو اپنے آپ کو بہت بڑی قوت اور عزت کا مالک سمجھا کرتا تھا!
>
> (۴۲-۵۰/۴۴)۔

وہ اسے نگلنا چاہیں گے تو وہ حلق میں اٹک جائے گا (۱۳/۷۳)۔ وہ کھانا کیا ہوگا؟ ایسے جھاڑ کانٹے ہوں گے جنہیں ردّی سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے، وہ اسے طوعاً و کرہاً نگل تو لیں گے لیکن اس سے نہ

بھوک مٹے گی اور نہ ہی جسم کو توانائی اور فربہی حاصل ہوگی (۶-۷/۸۸). یہ ہوگا اہلِ جہنم کا (تمثیلی) کھانا.

جیل خانے کا سا نقشہ

(جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے) جہنم کا نقشہ ایسے کھینچا گیا ہے جیسے وہ نہایت صعوبت انگیز اور اذیت رساں جیل خانہ ہو. جس طرح قیدی اپنے "نمبروں" سے پہچانے جاتے ہیں اسی طرح وہاں کے مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۴۱/۵۵). انہیں پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹا جائیگا (۵۵/۴۱). ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور پاؤں میں بیڑیاں (۷۱-۷۲/۴۰)؛ (۴/۷۶). ان سب کو لمبی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا (۳۱-۳۲/۶۹) اور اس طرح جکڑ کر انہیں تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ڈال دیا جائے گا (۱۳/۲۵) اور لوہے کے بڑے بڑے گرزوں سے ان کی پٹائی ہوگی (۲۱/۲۲).

جہنم کے داروغے

جیل خانے کی طرح، جہنم کے بھی داروغے ہوں گے۔ وہ بڑے پُرہیبت اور سخت گیر ہونگے (۶۶/۶). ایک چھوڑ، انیس انیس ہوں گے (۳۰-۳۱/۷۴). اہلِ جہنم، ان داروغوں سے درخواست کریں گے کہ ہماری سزا میں کچھ تخفیف کردی جائے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس وہ پیامبر نہیں آئے تھے جنہوں نے تنبیہ کی تھی کہ اگر تم نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں! وہ آئے تو تھے. (لیکن ہم نے ان کی بات نہیں مانی تھی) (۴۰/۵۰)؛ (۸-۹/۶۷)-

جہنم کے ہیڈ داروغہ کا نام "مالک" ہوگا. اہلِ جہنم، عذاب کی سختیوں سے تنگ آکر اس سے کہیں گے کہ تم خدا کے حضور عرض کرو کہ وہ تمہارا کام تمام کردے تاکہ ہم اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ وہ کہے گا کہ اِنَّکُمْ مّٰاکِثُوْنَ (۴۳/۷۷) یہاں موت نہیں آسکتی، تمہیں اسی طرح ایڑیاں رگڑتے رہنا ہوگا. (یہ مایوسی کی انتہا ہے).

ذلت آمیز عذاب

عقوبات کی اس شدت اور سختی کے ساتھ، وہاں ذلت کا عذاب بھی ہوگا. وہ جہنم کی طرف

آئیں گے بھی تو اس انداز سے کہ خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ (۴۲/۴۵)۔ جھکی ہوئی نگاہیں اور کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے۔ وہ آگے قدم نہیں بڑھائیں گے تو انہیں مُنہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا (۲۵/۳۴)۔ جس طرح قیدی ہونا بذاتِ خود بڑا ذلت آمیز ہوتا ہے، اسی طرح جہنم میں داخل ہونا ہی ہزار رسوائیوں کا موجب ہوگا (۳/۱۹۱)؛ (۴۰/۶۰)۔ اسی لئے اسے عَذَابٌ مُّھِیْنٌ کہا گیا ہے (۴۵/۹)۔ یعنی رسوا کرنے والا عذاب۔ (نیز ۳۹/۴۰)۔

جہنم کے مختلف دروازے

جرائم کی نوعیتوں کے اعتبار سے، جہنم میں داخل ہونے کے دروازے تو مختلف ہوں گے لیکن جہنم ایک ہی ہوگا۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۱۵/۴۴) اس کے مختلف دروازے ہوں گے اور ہر دروازے کے لئے الگ الگ مجرم مختص کر دیئے جائیں گے۔ ان مجرمین سے کہا جائے گا کہ تم (اپنے اپنے) دروازے سے جہنم میں داخل ہو جاؤ (۱۶/۲۹)؛ (۳۹/۷۲)؛ (۴۰/۷۶)۔

چیخنا چلانا

اس جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہو کر وہ اس طرح چیخیں چلائیں گے کہ وہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی (۲۱/۱۰۰)۔ وہ وہاں تنگ آ کر موت کو پکاریں گے لیکن موت ان کی آواز کو نہیں سنے گی (۲۵/۱۳-۱۴)۔ خود جہنم بھی انہیں دیکھ کر جوش میں آ جائے گا اور اس میں بڑا ہیبت انگیز شور برپا ہوگا (۶۷/۷)۔

جہنم کی وسعتوں کا یہ عالم ہوگا کہ اس سے پوچھا جائے گا کہ هَلِ امْتَلَأْتِ۔ کیا تو بھر گئی ہے۔ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝ (۵۰/۳۰) تو وہ کہے گی کہ کیا اور مجرم بھی ہیں؟ اگر ہیں تو انہیں بھی ڈال دیجئے۔

اس عذاب سے محفوظ رہنے کی دُعائیں

یہ ہے اس عذابِ جہنم کا تمثیلی بیان جس سے کسی کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ بھی نہیں۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِى النَّارِ ۚ (۳۹/۱۹)
جو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق عذاب کا مستوجب قرار پاگیا۔ اے رسولؐ! کیا تو
اسے اس سے بچا سکتا ہے؟

اسی لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (۶۶/۶) اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو عذابِ جہنم سے بچانے کی فکر کرو۔ اسی لئے ان (مومنین) کی ہر وقت یہ آرزو ہوتی ہے کہ وَقِنَا (رَبَّنَا) عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۰۱) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں عذابِ جہنم سے محفوظ رکھیو (نیز ۳/۱۵؛ ۳/۱۹۰)۔ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ (۲۵/۶۵) عذابِ جہنم کا رُخ ہم سے دوسری طرف پھیر دے۔ وہ اِدھر کا رُخ ہی نہ کرے۔ چونکہ مومنین کا حُسنِ عمل کا پلڑا بھاری ہوگا اس لئے انہیں اس سے محفوظ رکھا جائے گا (۲۷۔ ۱۹/۷۱)۔ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۳۹/۶۱) انہیں کوئی تکلیف مس تک نہیں کرے گی اور نہ ہی وہ غمگین اور آزردہ خاطر ہوں گے۔ وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۴۴/۵۶) اس لئے کہ خدا انہیں عذابِ جہنم سے محفوظ رکھے گا۔ (نیز ۵۲/۱۸)۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جسے عذابِ جہنم سے محفوظ رکھا جائے وہی کامیاب و کامران ہے (۳/۱۸۴)۔ انہیں جہنم سے اتنی دور رکھا جائے گا کہ یہ اس کی سنسناہٹ تک بھی نہیں سُن سکیں گے (۱۰۱۔ ۲۱/۱۰۲)۔ یعنی وہ اس سے بالکل محفوظ رہیں گے۔ لہٰذا وہ جو تصور ہے کہ مجرمین کو جہنم میں داخل کیا جائے گا اور وہ جب اپنے جرائم کی سزا بھگت لیں گے تو انہیں جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے گا، قرآنی تصور کے خلاف ہے۔ جو جنت کا مستحق قرار پا چکا ہے اسے جہنم میں بھیجا ہی نہیں جاتا۔ (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

جہنّم کِس کے لئے ہے

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو عذابِ جہنّم کے مستحق قرار پاتے ہیں یا یوں کہیئے کہ وہ کونسے جرائم ہیں جن کا نتیجہ جہنّم کا عذاب ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسی لئے قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص کو نہایت وضاحت سے معلوم ہو جائے کہ کس کس قسم کے کام' انسان کو جہنّم کا مستوجب بنا دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے مجتنب رہے۔ اگر ضابطۂ خداوندی میں اس کی تصریح نہ کی جائے تو ملزم کے لئے اتمامِ حجت نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر خود ان جرائم کا ذکر آیا ہے جن کا نتیجہ عذابِ جہنّم ہوتا ہے لیکن بیشتر انسانوں کی ان شقوں (CATEGORIES) کا ذکر کیا ہے جو جہنّم میں جائیں گے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ضابطۂ تعزیرات میں کہیں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ بغاوت کی سزا موت ہے اور کہیں یہ کہ باغیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

صاحبِ اختیار و ارادہ انسان

انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں (جن میں تمام ذی حیات شامل ہیں) بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اور دیگر مخلوقات مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ مخلوق' ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ (کیونکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی) جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس روش کو چاہے

اختیار کرلے۔ اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہی اسے اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اسی ذمہ داری کی وجہ سے جزا اور سزا (یعنی نتائجِ اعمال) کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک ہی روش پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا جاتا تو اس کے لئے نہ غلط اور صحیح کا سوال پیدا ہوتا نہ جنت اور جہنم کی تفریق۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں، متنوع انداز سے واضح کیا ہے۔ (مثلاً سورۂ ہود میں ہے۔ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اگر تیرے نشوونما دینے والے کی مشیت ایسی ہوتی تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ یہ سب ایک ہی روش پر چلتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو راستے کے انتخاب کا اختیار دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وَ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ۔ ان میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے۔ کوئی ایک روش پر چلتا، کوئی دوسری پر۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ البتہ وہ گروہ جو قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے ان میں باہمی اختلاف نہیں ہوتا۔ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ انسان کے پیدا کئے جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے صحیح راستہ اختیار کرے۔ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ (۱۱/۱۱۸-۱۱۹) خدا کا یہی قانونِ تخلیقِ انسانی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں سے جہنم بھرا جائے گا۔ یعنی جو اپنے اختیار و ارادہ سے غلط راستہ منتخب کریں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔

دوسرے مقام پر ہے۔ وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا۔ اگر ہماری مشیت ہوتی تو ہم ایسا بھی کرسکتے کہ ہر انسان سیدھے راستے پر چلتا۔ لیکن اس سے اس کا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے ایسا نہیں کیا اور اسے اپنے لئے آپ راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے دیا۔ اپنے اس اختیار و ارادہ کے غلط استعمال سے انسان اپنے لئے جہنم تیار کرتا رہتا ہے (۳۲/۱۳)۔ خدا نے اپنی وحی کے ذریعے (حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے) بتا دیا کہ غلط راستہ کون سا ہے اور صحیح کونسا۔ اس کے بعد اسے انسانوں کے اپنے فیصلے پر چھوڑ دیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ۝ (۲/۱۱۹) ہم نے تجھے اس مقصد کے لئے بھیجا ہے کہ تو لوگوں کو بتا دے کہ صحیح راستہ پر چلنے سے کونسے خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے اور غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن نتائج کیسے ہونگے اس کے

بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی باز پرس خود انسان سے ہو گی کہ اس نے غلط راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔

۲۔ فلسفہ کی دنیا میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت بد واقعہ ہوئی ہے اس لئے وہ غلط راستے پر چلتا ہے۔ یہ نظریہ دراصل عیسائیت کے اس عقیدہ کا پیدا کردہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنے اوّلیں ماں باپ (آدم وحوّا) کے گناہ کا بوجھ اپنی کمر پر لادے دنیا میں آتا ہے اور گناہ کا یہ دھبہ کسی طرح مٹ ہی نہیں سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔ فلسفہ کا وہ نظریہ ہو یا عیسائیت کا یہ عقیدہ، دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ انسان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ غلط راستے سے بچ سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کیا گیا ہے اور انسان غلط راستے پر چلنے کے لئے مجبور۔ قرآنِ کریم نے اس غلط تصوّر کی بڑی شدت سے تردید کی۔ اس نے کہا کہ انسان کو کچھ امکانی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں اور یہ اس کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جب وہ ان کا غلط استعمال کرتا ہے تو اسے "ابلیسی تحریک" کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان اس تحریک کے سامنے بے بس نہیں۔ وہ اس پر قابو پا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر، ابلیس و آدم کی تمثیلی داستان کے انداز میں اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور ہر مقام پر اس ابلیسی چیلنج کے جواب میں کہ میں ابنِ آدم کو غلط راستے پر ڈال دوں گا، بڑی تحدی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۵) تیرے جی میں جو آئے کر کے دیکھ لے۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔ لیکن جو اپنی مرضی سے تیرے پیچھے چلیں گے ان سے جہنم بھرا جائے گا (۳۸/۸۵ ؛ ۴۲-۱۵/۴۳)۔

لہٰذا، جہنم ان کے لئے ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے غلط راستہ اختیار کریں۔ جس کام میں انسان کا ارادہ اور فیصلہ شامل نہ ہو، اس کی اس پر ذمہ داری عائد نہیں کی جا سکتی اور جس کام کے لئے کوئی ذمہ داری ہی نہ ہو اس کی سزا (یا جزا) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے

پاگل کو اس کے کسی کام پر قابلِ مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کہ جس میں سمجھنے سوچنے کی

صلاحیت ہی نہ ہو' اسے اس کے کسی عمل کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن جس شخص میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت موجود ہو لیکن وہ عقل و فکر سے کام نہ لے اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر' قانون شکنی کرے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی عقل و فکر سے کام نہ لے بلکہ دوسروں کی تقلید میں غلط قدم اٹھائے وہ بھی سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جو لوگ اپنی عقل و فکر سے کام نہ لیں' وہ جہنم میں جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ

> ایسے لوگ جو دل و دماغ رکھنے کے باوجود' ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہ لیں۔ جو آنکھیں رکھنے کے باوجود' راستہ دیکھ کر نہ چلیں۔ جو کان رکھنے کے باوجود' دوسرے کی بات نہ سُنیں' ان کی یہ کیفیت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہ جہنم میں جانے والی مخلوق ہے انہوں نے انسان ہونے کے باوجود اپنے آپ کو حیوانی سطح پر رکھ چھوڑا ہے بلکہ ان کی حالت حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ حیوانات میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ اس صلاحیت کے باوجود' مدہوشی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں (۷/۱۷۹)۔

یہ لوگ' جو دنیا میں سماعت' بصارت اور قلبِ سلیم سے کام نہیں لیتے' قیامت کے دن اندھے' بہرے' گونگے اٹھائے جائیں گے (۱۷/۹۷)۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم جہنم میں اس لئے جا رہے ہو کہ تم نے عقل و فکر سے کام نہ لیا (۳۶/۶۲)۔ سورۃ الملک میں اس حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب یہ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے تو جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس خدا کے پیغامبر نہیں آئے تھے جو تمہیں غلط اور صحیح راستے میں خطِ امتیاز کھینچ کر بتا دیتے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے! تو وہ کہیں گے کہ پھر کیا ہوا کہ تم جہنم میں آ گئے۔ وہ جواب دیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ (۶۷/۱۰)۔ اگر ہم ان کی بات توجہ سے سنتے یا عقل و فکر سے کام لیتے' تو ہمارا شمار اہلِ جہنم میں نہ ہوتا۔

لہٰذا' جہنم ان کا ٹھکانا ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود' عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ انہی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مذہبی پیشواؤں یا سیاسی لیڈروں کے پیچھے آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ احزاب میں ہے کہ اہلِ جہنم کہیں گے کہ رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۝ (۳۳/۶۷) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اپنے لیڈروں

اور عزت مآب مذہبی پیشواؤں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں صحیح راستے سے بھٹکا دیا۔ اس سے آگے ہے کہ وہ خدا سے درخواست کریں گے کہ ان لیڈروں اور راہ نماؤں کو دوہرا عذاب دیا جائے۔ ایک تو ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے اور دوسرا اس لئے کہ وہ اوروں کو بھی گمراہ کرتے تھے (۳۳/۶۸)۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں اہلِ جہنم کے متعلق ہے کہ اِنَّھُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَھُمْ ضَآلِّیْنَ ۙ فَھُمْ عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ یُھْرَعُوْنَ ۝ (۳۷/۷۰-۶۹) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آبا و اجداد کو جس غلط روش پر چلتے دیکھا، اس پر یہ خود سرپٹ بھاگتے چلے گئے۔ کہیں کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں کہ ہم بالآخر جا کدھر رہے ہیں۔

لہٰذا، جہنم ان لوگوں کا مستقر ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ یا تو اپنی مفاد پرستیوں کے جذبات سے مغلوب ہو کر، غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں اور یا اپنے مذہبی پیشواؤں کی تقلید میں آنکھیں بند کر کے، اسلاف کے نقوشِ قدم کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت جذبات پرستی ہی کا دوسرا نام ہے، اس لئے کہ اندھی عقیدت، انسانی جذبات ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے عقل و فکر کی نہیں۔ قرآن ہر فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ وحی کی روشنی میں، عقل و فکر سے کام لے کر اپنے لئے راستے کا انتخاب خود کرے۔ یہ مذہبی پیشوا، جو (قرآن کے الفاظ میں) دنیاوی مفاد حاصل کرنے کے لئے اپنی ایک (TRADE UNION) سی بنا لیتے ہیں، خود بھی جہنم میں جائیں گے، اس لئے ان کے پیچھے چلنے والے کس طرح جنت میں جا سکتے ہیں؟

جذبات کے تابع چلنے والے

انسان کے لئے صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھے اور عقل سے وحیٔ خداوندی کی روشنی میں کام لے۔ لیکن جو لوگ اپنے جذبات کی تسکین ہی مقصدِ زندگی قرار دے لیں، ان کے جہنمی ہونے میں شبہ کیا رہ سکتا ہے! قرآنِ کریم نے انسان کے سرکش جذبات یا اس عقل کو جو جذبات کے تابع رہے، شیطان یا ابلیس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور (شیطان یا ابلیس کا) اتباع کرنے والوں کو اہلِ جہنم قرار دیا ہے۔ (قصۂ ابلیس و آدم میں) ابلیس سے کہا گیا ہے کہ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۷/۱۸) ان (انسانوں) میں سے جو بھی تیرا اتباع کریں گے، ان سب سے جہنم بھر دیا جائے گا۔ (نیز ۱۵/۴۳؛ ۲۲/۴-۲؛ ۳۸/۵۸)۔ انہی میں وہ

لوگ بھی شامل ہیں کہ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا. جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے (یعنی قرآنِ کریم) اس کا اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اپنے اسلاف کے راستے پر چلتے جائیں گے۔" اس کے بعد ہے۔ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ٥ (۳۱/۲۱) یعنی خواہ شیطان انہیں جہنّم کے عذاب کی طرف ہی کیوں نہ بلا رہا ہو؛ یہ اس کے پیچھے چلیں گے۔ حالانکہ انہیں متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ یہ تمہیں جہنّم میں پہنچا دے گا (۳۵/۶)۔ سورۂ یٰسٓ میں اس تنبیہ (WARNING) کو "بنی آدم کے عہد" سے تعبیر کیا گیا ہے (۶۰-۶۴/۳۶)۔

انہی شیاطین میں وہ سرغنے بھی شامل ہیں جو لوگوں کو غلط کاموں پر اکساتے ہیں، اور جب گرفت کا موقع آتا ہے تو اپنے آپ کو صاف بری الذمہ قرار دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ، دنیاوی عدالتوں میں تو شاید بے گناہ قرار پا جائیں، لیکن عدالتِ خداوندی میں ان کا شمار مجرمین میں ہی ہوگا۔ اسی لئے انہیں اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو جنہوں نے ان کا کہا مانا تھا، سب کو مستحقِ جہنّم قرار دیا گیا ہے (۳-۴/۲۲)۔ نیز (۱۹/۶۸) اور انہیں بھی جو روحانی تقدس کا جال بچھا کر "آسمان کی خبریں" لانے کے دعویدار بنتے اور اٹکلیں دوڑا دوڑا کر اپنے کشف و کرامات کا رعب گانٹھتے رہتے ہیں (۵/۶۷)۔

حیاتِ اُخروی کا منکر، جہنّم میں

دین کا مدار قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ جو انسان تعمیری کام کرے گا اس کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر لے گی جس سے وہ اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ جس کا تعمیری کاموں کا پلڑا ہلکا ہوگا، اس کی ذات آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اسے جہنّم کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص انسانی ذات اور اس کے مستقبل (یعنی حیاتِ آخرت) ہی کو تسلیم نہ کرے، اس کی ذات کی نشوونما کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، ان لوگوں کے اہلِ جہنّم ہونے میں کلام کیا ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں کہا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ اہلِ جہنّم میں سے ہیں۔ حیوان اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان کی زندگی، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہوتی ہے جو موت کے ساتھ ختم

ہوجاتی ہے اور انسان کی زندگی موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ لہٰذا، جو شخص تسلسلِ حیات کا قائل نہیں وہ انسان اور حیوان میں فرق نہیں کرتا۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اس کے تسلسلِ حیات کو تسلیم نہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کی زندگی کا خاتمہ بھی موت کے ساتھ ہوجاتا ہے۔ یہ اسے تسلیم کرے یا نہ کرے، اس کی زندگی آگے چلے گی اور اس کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا۔ اس لئے کہا گیا کہ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ۔ جو لوگ تسلسلِ حیات کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرکے مرجاتے ہیں۔ لیکن اس طرح ان کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔ وَ النَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ ٥ (۴۷/۱۲) ان کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ءَ اِذَا کُنَّا تُرَابًا ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ۔ کہ جب ہم مرکر مٹی میں مل جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہمیں پھر نئی زندگی ملے گی۔ کہا کہ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ٥ (۱۳/۵) ان لوگوں کا مآل جہنّم کی زندگی ہوگا۔ یہ لوگ دنیاوی زندگی ہی کو منتہائے حیات سمجھتے تھے اور اس پر مطمئن ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے غلط کاموں کی وجہ سے ان کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا (۱۰/۷) اِنَّهُمْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا ٥ (۷۸/۲۷) یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہمارے جی میں آئے ہم کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چونکہ دنیاوی زندگی میں انسانی کوششوں کے نتائج طبیعی قوانین کے مطابق مرتّب ہوتے ہیں اس لئے اس میں حیات بالآخرت پر ایمان رکھنے والوں اور اس سے انکار کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے انہیں متاعِ دنیا تو مل جاتی ہے لیکن اُخروی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ متاعِ دنیا' کتنی ہی کثیر کیوں نہ ہو، متاعِ آخرت کے مقابلہ میں بہرحال حقیر و قلیل ہوتی ہے' کیونکہ دنیا کی زندگی مختصر ہے اور اس کے بعد کی زندگی کے ارتقائی مراحل بے شمار۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ زندگی کہلانے کی مستحق' وہی زندگی ہے (۲۹/۶۴)۔ لہٰذا جس کا متاعِ آخرت میں حصہ نہ ہو' اس کے جہنمی ہونے میں کیا شُبہ ہوسکتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ ان لوگوں کا (جو حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں) دنیاوی زندگی میں اقتدار تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ٥ (۳/۱۹۶)؛ (۲/۱۲۶) یہ متاع بڑی ہیچ مقدار ہے۔ اس کے بعد ان کا مستقر جہنّم ہے جو بہت بُرا مقام ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جو لوگ اس دنیا کے مفادِ عاجلہ ہی کو مقصودِ حیات قرار دے لیتے ہیں انہیں یہ مفاد مل جاتے ہیں۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ (۱۷/۱۸) لیکن اس کے بعد ان

کا ٹھکانہ جہنّم ہوتا ہے. (نیز ۱۵-۱۶/۱۱)؛ (۳۹/۸)۔ سورۃ احقاف میں ہے کہ یہ لوگ (آخرت میں) کہیں گے کہ ہمیں یہاں کی آسائشوں اور خوشگواریوں سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے، تو ان سے جواب میں کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۴۶/۲۱) تم نے آسائشوں اور نعمتوں کا اپنا سارا حصّہ دنیاوی زندگی میں صرف کر لیا تھا اس لئے اب یہاں جہنّم کا رسوا کن عذاب ہوگا۔ اس کو سورۃ کہف میں' ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸/۱۰۳) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام تگ و تاز متاعِ دنیا حاصل کرنے میں ضائع کر دی اس لئے قیامت کے دن' ان کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی (۱۸/۱۰۵)۔ انہوں نے حیاتِ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی تھی (۹/۳۸)۔ یعنی متاعِ دنیا کا حصول بجائے خویش معیوب نہیں لیکن جب اس کے حصول اور کسی مستقل قدر میں تصادم ہو جائے' تو اس وقت جو شخص متاعِ دنیاوی کو ترجیح دیتا ہے اور مستقل قدر کو چھوڑ دیتا ہے اس کا درحقیقت حیاتِ آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں جو "آخرت کو دے کر دنیا خرید لیتے ہیں" (۲/۱۷۵)۔ ان کی نشو و نما رک جاتی ہے اور اس کا نام جہنّم ہے (۲/۱۷۵)؛ (۳/۷۶)۔

خَفَّتْ مَوَازِيْن

لیکن جو لوگ' حیاتِ آخرت کو تسلیم کرنے کے باوجود قوانین شکنی کرتے رہتے ہیں' ان کی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ ان کا تعمیری اعمال کا پلڑا بھاری ہے یا تخریبی اعمال کا۔ اگر تخریبی اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا تو وہ اہلِ جہنّم میں سے ہوں گے۔ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۚ (۲۳/۱۰۳)؛ ۸-۹/۱۰۱)۔

مختلف اقسام

مندرجہ بالا اصولی شقوں کے علاوہ' قرآنِ کریم نے اہلِ جہنّم کی مختلف اقسام کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

(۱) **کفّار** یعنی جو مستقل اقدارِ خداوندی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صحیح اسلامی نظام کی مخالفت کرتے اور اس سے سرکشی

برتتے ہیں۔

(۲) مشرکین — جو خدائی اقتدار و اختیار میں غیر خداوندی قوتوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ قوانینِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی بھی اطاعت کرتے ہیں۔

(۳) مکذبین — جو وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو زبان سے ان اقدار کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن اپنے اعمال سے ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

(۴) مرتدین — جو ان اقدار کی صداقت کو تسلیم کر لینے کے بعد پھر ان سے انکار کر کے کفر کی راہ اختیار کر لیں۔ ان میں اور کفار میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو مسلمان کہلاتے ہوئے بعض امور میں کفار کا اتباع کریں وہ بھی مرتدین کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں (۴۷/۲۵)۔

(۵) منافقین — جو دل سے ان کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن بربنائے مصلحت جماعت مومنین میں شریک ہوئے رہتے ہیں۔

(۶) مجرمین — جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کریں۔ انہیں "ظالمین" بھی کہا گیا ہے نیز فاسقین اور فجار بھی۔ ان قوانین سے اعراض برتنے والے بھی انہی میں شامل ہیں۔

قرآن کریم میں ان تمام اقسام کے متعلق بے شمار آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ اہلِ جہنم میں سے ہیں۔ عدم گنجائش کی بنا پر ان آیات کا استیعاب مشکل ہے۔ اس لئے ان میں سے ایک ایک، دو دو آیات پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ البتہ جرائم کے سلسلہ میں ذرا تفصیل سے بتایا جائے گا کہ ان کی نوعیت کیا ہے، (تاکہ ہم اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ ہم کون کون سے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں)۔

کافرین کے لئے جہنم

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ (۱۷/۸) اور ہم نے

کفّار کو محصور کرنے کے لئے جہنّم بنایا ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے کہ کفّار سے کہا جائے گا کہ یہ وہ جہنّم ہے جس سے تمہیں متنبہ کیا جاتا تھا۔ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ (۳۶/۶۴) تم اپنے کفر کی وجہ سے اس میں داخل ہو جاؤ۔ سورۃ فاطر میں ہے۔ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ (۳۵/۳۶) جو لوگ کفر کرتے ہیں ان کے لئے جہنّم کی آگ ہے۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے وضاحت سے بتا دیا ہے کہ اجزائے ایمان کیا ہیں اور ان سے انکار کا نام کفر ہے۔ ایمان کے متعلق سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ (۲/۱۷۷)

کشادگی راہ اس کے لئے ہے جو ایمان لائے اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب پر اور نبیوں پر۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ○ (۴/۱۳۶)

جس نے اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یومِ آخرت سے انکار کیا وہ بہت بڑی گمراہی میں جا پڑا۔

ایمان کے متعلق اس کی بھی تصریح کر دی کہ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اللہ، کتب، رسل، ملائکہ اور آخرت کے متعلق کوئی جس قسم کا تصور بھی چاہے رکھے، اسے اس کا ایمان سمجھ لیا جائے گا۔ بالکل نہیں۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر آ گئے۔ ورنہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم (اور تو اور) اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) کو بھی مومن باللہ تسلیم نہیں کرتا۔ ایمان کے لئے بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (۴۷/۲) "جو کچھ محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لانا بنیادی شرط ہے۔

ارتداد

جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیتا ہے اس کا سابقہ ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

وہ بھی (کفار کی طرح) اہلِ جہنّم میں شمار کیا جاتا ہے (۲/۲۱۷). جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، مسلمان کہلا کر بعض امور میں کفّار کا اتّباع کرنا بھی اِرتداد ہے (۴۷/۲۶).

مشرکین

سورۂ قٓ میں ہے. نِ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ ٥ (۵۰/۲۶) "جو خدا کے ساتھ کسی اور کو بھی صاحبِ اقتدار سمجھتا ہے، اسے جہنّم کے عذاب شدید میں ماخوذ کردو." انہی کو مشرک کہتے ہیں اور دَ فِی النَّارِ ھُمْ خٰلِدُوْنَ ٥ (۹/۱۷) ان کا ٹھکانہ جہنّم ہے.

واضح رہے کہ مشرک وہی نہیں جو بتوں کی پرستش کرتے ہیں. جو بھی قوانینِ خداوندی کے ساتھ (جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں) انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کرتا ہے، وہ شرک کرتا ہے. حتّٰی کہ دین میں فرقے پیدا کرنے والے بھی مشرک ہیں (۳۰/۳۱-۳۲). عیسائیوں کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ "جو لوگ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یا تثلیث کے قائل ہیں، وہ کفر بھی کرتے ہیں اور شرک بھی (ان پر جنّت حرام ہے. دَ مَاْوٰىہُ النَّارُ (۵/۷۲-۷۳) اور ان کا ٹھکانہ جہنّم ہے. وہ تمام اہلِ کتاب اور کفّار اور مشرکین کو ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہے (۹۸/۶). شرک تو ایسا جرمِ عظیم ہے جس کی رُو سے آئی ہوئی تباہی سے حفاظت کا سامان ہی نہیں مل سکتا. اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ (۴/۱۱۶).

واضح رہے کہ مشرکانہ رسوم ادا کرنے والوں کا شمار بھی مشرکین ہی میں ہوتا ہے اور وہ بھی جہنّم کے سزاوار ہوتے ہیں (۴/۱۱۹-۱۲۱).

جب شرک ایسا جرمِ عظیم ہے تو جو لوگ خود خدا بن بیٹھیں ان کے اہلِ جہنّم ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے (۲۱/۲۹). یہ بھی جہنّم میں اور ان کے پرستار بھی جہنّم میں (۲۱/۹۸).

مکذّبین کیلئے جہنّم

سورۂ طور میں ہے " اس دن مکذّبین کے لئے بڑی تباہی ہو گی جب انہیں جہنّم کی طرف

بلایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ عذابِ نار جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے (۱۱-۱۴/۵۲).
سورۃ اعراف میں ہے. اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ..... لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ (۴۰-۴۱/۷)
جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے، ان کا گہوارہ جہنم ہوگا. سورۃ وَالَّیْل میں ہے کہ جہنم اس کے لئے ہے. اَلَّذِیْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۹۲/۱۶) جو قوانین خداوندی کی تکذیب کرتا ہے اور ان سے گریز کی راہیں تراشتا ہے.

منافقین، جہنم میں

منافق تو اس دنیا میں بھی ایک ایک سانس میں جہنم میں رہتا ہے. اس کا سینہ جس کشمکش کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور اس سے جو قلبی اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ مستقل عذاب ہوتا ہے. یہ جہنم اس دنیا کی ہے اور یہی جہنم آگے بڑھ کر اخروی زندگی کا "عذاب النار" بن جاتا ہے. قرآن کریم نے کفار اور منافقین کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا ہے اور رسول اللہ سے کہا ہے کہ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ (۶۶/۹) کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرو اور ان کے مقابلہ میں بڑی شدت برتو. ان کا ٹھکانہ جہنم ہے. (نیز ۹/۷۳). بلکہ منافقین کے متعلق یہاں تک کہا ہے کہ

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ (۴/۱۴۵)

وہ جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں ہوں گے.

یعنی کفار سے بھی زیادہ شدید عذاب میں مبتلا. جن لوگوں نے مدینہ میں ایک جداگانہ مسجد تعمیر کی تھی تاکہ اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے ان کے متعلق کہا ہے کہ ان کی یہ تخریبی کارروائی، اضطراب پیہم کی ایسی آتشِ خاموش بنے گی جس سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور یہ مسجد اور اس کے بنانے والے سب داخلِ جہنم ہوں گے (۱۰۷-۱۱۰/۹).

اسلامی نظام سے سرکشی برتنے والے

جو لوگ، اپنی دولت اور قوت کے نشہ میں بدمست، اسلامی نظام کے خلاف سرکشی پر اتر آتے

ہیں یا اس کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں' ان کا ٹھکانہ بھی جہنّم ہوتا ہے ــ اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّہٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خَالِدًا فِیْھَا ذٰلِکَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ ○ (۹/۶۳)؛ (۴/۱۴)؛ (۴۲/۲۳)۔

کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ جو خدا اور اس کے رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اُٹھتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا اور یہ بہت بڑی ذلّت و رسوائی کا مقام ہوگا۔

سورۂ حج میں ہے کہ جو لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قوانینِ خداوندی کو بے بس بنادیں (انہیں چلنے نہ دیں) وہ اہلِ جہنّم میں سے ہیں (۲۲/۵۱)۔ سورۂ مومن میں ہے کہ "جو لوگ خدا کی محکومیت اختیار کرنے سے تکبّر کرتے ہیں' وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنّم میں داخل ہوں گے۔" (۴۰/۶۰)۔ دوسرے مقام پر انہیں "اَعْدَآءِ اللّٰہ" اللہ کے دشمن کہا ہے اور ان کا انجام جہنّم بتایا ہے (۴۱/۲۸)۔

مجرمین کیلئے جہنّم

قبل اس کے مجرمین کے متعلق قرآنی تصریحات سامنے آئیں' ایک اصولی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے کافرین' مشرکین' منافقین' مکذّبین' مجرمین' وغیرہ) الفاظ استعمال کئے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کا جو مفہوم کوئی متعیّن کرنا چاہے کرلے۔ قرآنِ کریم نے ان الفاظ کو (اَلْ) کے ساتھ معرفہ بنادیا ہے۔ یعنی انہیں' الکافرین' المشرکین وغیرہ لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافر وہ ہیں جنہیں قرآن نے کافر قرار دیا ہے۔ مشرک وہ ہیں جنہیں قرآن مشرک کہتا ہے۔ مجرم وہ ہیں جو قرآن کی (DEFINITION) کے مطابق مجرم قرار پاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی تعریف کی رُو سے مجرم وہ ہیں جو احکام و قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں' جو ان قوانین کو توڑتے ہیں۔ اس اعتبار سے جہاں قرآنِ کریم نے اگرچہ بعض جرائم کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اس نے بہ ہیئتِ مجموعی یہی کہا ہے کہ المجرمین کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا۔ ان جرائم کا ارتکاب' غیر مسلموں کی طرف سے ہو یا مسلمانوں کی طرف سے' دونوں مجرم قرار پائیں گے۔ یہاں ہم جرائم کے اثرات کا ذکر رہے ہیں جو انسانی ذات پر مرتب ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ اُخروی زندگی کا جہنّم۔ جرائم کی ان سزاؤں کا ذکر نہیں کر رہے جو دنیاوی

عدالت سے اس دنیا میں مل جاتی ہے۔ (اس نکتہ کی اصولی بحث پہلے آچکی ہے کہ جن جرائم کی سزا یہاں مل جاتی ہے اُخروی زندگی سے ان کا کیا تعلق ہوتا ہے)۔

اجمالی طور پر سورۂ قمر میں ہے اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝ (۴۷-۴۸/۵۴) یہ حقیقت ہے کہ مجرمین غلط راہوں پر چل رہے ہیں اور عذابِ جہنم میں ماخوذ ہوں گے۔ جس دن انہیں مُنہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ سورۂ رحمٰن میں ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۵۵/۴۳) مجرمین سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جہنم جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ سورۂ مدثر میں ہے کہ اہلِ جنت، جہنم والوں سے کہیں گے کہ "اے مجرمو! تم کن جرائم کی پاداش میں یہاں آپہنچے ہو؟" (۴۰-۴۱/۷۴)۔ کہیں انہیں اَلْفُجَّار کہا گیا ہے (۸۲/۱۴)۔ کہیں الفاسقین (۳۲/۲۰)۔ الظّٰلمین متعدد مقامات پر کہا گیا ہے (۲۱/۲۹)۔ جادۂ عدل و انصاف سے ہٹ جانے والے (۷۲/۱۵)۔ انہیں مسلمین کی ضد بتایا گیا ہے (۷۲/۱۴)۔

بعض جرائم کی تفصیل

(۱) زندگی کی جو آسائشیں خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہیں انہیں چھپا کر رکھنے والے۔ غلط جگہ استعمال کرنے والے۔ دولت کو روک رکھنے والے۔ حدود فراموش۔ قوانین کی صداقت میں شبہ کرنے والے جہنم کے عذابِ شدید میں گرفتار ہوں گے (۲۴-۲۶/۵۰)۔

(۲) علماء و مشائخ جو لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اپنی مفاد پرستیوں کی وجہ سے لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (۹/۳۴)۔

(۳) دولت کو محض اپنے مفاد کے لئے جمع کرنے والے اور اسے نوعِ انسانی کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف نہ کرنے والے جہنم کے سخت عذاب میں ہوں گے (۳۴-۳۵/۹)؛ (۱۸-۲۱/۷۰)۔ سورہ الھمزہ میں ہے۔ تباہی ہے اس کے لئے۔

جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝...مُّمَدَّدَةٍ (۲-۹/۱۰۴)

جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے (اور اس طرح ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے)

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال و دولت اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا؟ بالکل نہیں۔ اسے جہنم کی آگ میں جھونکا جائے گا...... یہ وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے ستونوں میں بند ہے اور ان مجرمین کو اپنے اندر لئے ہوئے۔

نظامِ سرمایہ داری کا انجام اسی قسم کا جہنم ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

(۴) خدا کے دین کو (جو اس نے قرآن کریم میں محفوظ کر کے دیا ہے) لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے والے یا دین فروشی کرنے والے (۴۔۱۷۴ — ۲/۱۷۵)۔

(۵) لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے والے (۲۹ — ۴/۳۰)۔ یاد رہے کہ ہر وہ طریق جس کی اجازت قرآنِ کریم نے نہیں دی، ناجائز ہے۔ اس میں یتیموں کا مال ہڑپ کرنیوالے بالخصوص شامل ہیں (۴/۱۰)۔

(۶) محض سرمایہ پر نفع کمانے والے۔ خواہ وہ کسی کو قرضہ دے کر، زاید وصول کرنے کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح روپیہ (INVEST) کر کے اس سے نفع حاصل کرنے کی شکل میں۔ اسے ربٰو کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی جہنم ہے اور آخرت میں بھی (۲/۲۷۵)؛ (۱۲۹ — ۳/۱۳۰)۔

(۷) ان لوگوں کے رزق کا انتظام نہ کرنے والے جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے ہوں۔ وہ لمبی چوڑی باتیں بناتے رہیں اور عملاً اس قسم کے رفاہِ عامہ کے کام نہ کریں۔ یہ وہ ہیں جو مُصَلِّیْن (نمازی) ہونے کے باوجود درحقیقت مصلین (قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والے) نہیں ہوتے (۴۱ — ۷۰/۴۵)۔ جو لوگ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور خالی نمازیں پڑھ کر سمجھ لیں کہ ہم مصلّین ہو گئے، ان کے لئے تباہی ہے (۴ — ۱۰۷/۷)۔ حقیقی مصلّین وہ ہیں جن کے مال و دولت میں ہر محتاج و مسکین کا حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ہوتا ہے (۲۴ — ۷۰/۲۵)۔

(۸) جو لوگ معاشرہ میں تنہا رہ جائیں ان کی عزت نہ کرنے والا۔ لوگوں کو اس کی ترغیب نہ دلانے والا کہ محتاجوں اور مسکینوں کے سامانِ رزق کا بندوبست کرنا چاہیئے۔ جو مال و دولت وراثت میں ملے یہ سمجھنے والا کہ وہ اس کا واحد مالک ہے۔ پھر سرمایہ کے زور پر ایسا انتظام کرنے والا کہ دوسروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی چاروں طرف سے سمٹ سمٹا کر اس کے پاس آتی چلی جائے (۱۷ — ۸۹/۲۰)۔

(۹) اگر کسی جگہ صحیح اسلامی نظام قائم ہو چکا ہو، تو غیر خداوندی نظام میں رہنے والوں کے لئے

ضروری ہے کہ وہ اس نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں سے ہجرت کر آئیں۔ جو لوگ ایسا کر سکنے کی استطاعت کے باوجود، ایسا نہ کریں بلکہ غیر خداوندی نظام میں مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (۹۷ – ۴/۹۸)۔

(۱۰) بلا علم و دلیل اور قرآنی سند کے بغیر، دینِ خداوندی کے خلاف جھگڑے کرنے والے (۸ – ۲۲/۹)۔

(۱۱) قوانینِ خداوندی کو مذاق سمجھنے والے۔ یعنی انہیں (SERIOUSLY) نہ لینے والے (۱۸/۱۰۶)۔ قرآنی حقائق کے متعلق یہ کہنے والے کہ یہ محض اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں (۱۳ – ۱۶/ ۸۳) یا قوانینِ خداوندی میں افراط و تفریط سے کسی ایک طرف نکل جانے والے۔ اسے الحاد کہا جاتا ہے (۴۱/۴۰) یا خدا کے بارے میں مذاق کرنے والے (۱۸۰/ ۳)۔

(۱۲) خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے والے (۶۲/ ۱۶)۔

(۱۳) جب نظامِ خداوندی کسی کام کے لئے بلائے تو اس کی دعوت پر لبیک نہ کہنے والے (۱۳/۱۰) یا اس کے قوانین کی محکومیت اختیار کرنے سے تکبر برتنے والے (۴۰/۶۰)۔ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے والے (۱۵ – ۸/۱۶)۔

(۱۴) کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دینے والا (۴/۹۲)۔ حتّٰی کہ مومن مردوں یا عورتوں کو اذیت پہنچانے والا بھی (۸۵/۱۰ ؛ ۵۷، ۳۳/۵۸)۔

واضح رہے کہ یہ ان جرائم کی مکمل فہرست نہیں جو مجرمین کو جہنم کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ یہ تو محض چند نمایاں جرائم کا ذکر ہے۔ اس قسم کی تفصیلی فہرست کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اصولاً قرآنِ کریم نے بتا دیا کہ حسنات کے حامل جنت میں ہوں گے اور سیئات کے مرتکبین جہنم میں (۲۷/۹۰)۔ حسنات اور سیئات کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔

چند ایک کا خصوصی ذکر

قرآنِ کریم نے فرعون کو سیاسی استبداد کے نمایندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس لئے اس کے اور اس کی قوم کے اہلِ جہنم ہونے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنی قوم

کی قیادت کرتا ہوا اسے جہنم میں لے گیا (۱۱/۹۰۱) اس کو ان لوگوں کا "امام" (لیڈر) قرار دیا ہے جو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں (۲۸/۴۱) اور کہا ہے کہ وہ مسلسل جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہیں (۴۱/۴۰؛ ۴۶/۴۰)۔

رسول اللہ کے زمانے میں اسلامی نظام کے قیام کا سب سے زیادہ شدید مخالف کعبہ کا متولی اور بہت بڑا سرمایہ دار، حضورؐ کا چچا، ابولہب تھا۔ قرآنِ کریم نے اس کے عزائم کی شکست کا ذکر کرتے ہوئے اسے اور اس کے منصوبوں میں اس کی شریک کار، اس کی بیوی کے اہلِ جہنم ہونے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح اس نے حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کا ذکر کیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر نبی کی بیوی بھی اس کے پیغام پر ایمان نہیں لاتی، تو اس کا نبی کی بیوی ہونا اس کے کسی کام نہیں آسکتا۔ وہ بھی جہنم میں داخل ہوگی (۶۶/۱۰۱)۔ میزانِ خداوندی میں وزن اعمال کا ہے۔ کسی کی رشتہ داری کا نہیں۔ نہ کسی کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کا (۵۱۱ - ۳۷/۵۵)۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ جنت بنی ہی بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ یہ لوگ صرف ان چند دنوں کے لئے جہنم میں جائیں گے جن میں ان کے اسلاف سے سبت کے سلسلہ میں قانون شکنی ہوگئی تھی۔ قرآنِ کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ کسی کا کسی نسل یا قوم سے متعلق ہونا کچھ معنی رکھتا۔ جس سے بھی برائیاں سرزد ہوں گی اور خطائیں اسے گھیر لیں گی، وہ جہنم میں جائیگا (۲/۸۱)۔ خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ ہو (۳/۲۳)۔ خواہ اس کا تعلق مہذب (شہری) آبادی (انس) سے ہو یا وہ صحرا کے خانہ بدوشوں (جن) میں سے ہو (۴۱/۲۵)۔

جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین کی باہمی گفتگو

یہ سوال کہ قوم کی تباہی کا باعث اس قوم کے لیڈر ہوتے ہیں یا عوام الناس جو لیڈروں کے پیچھے لگ کر ان کی تقویت کا سامان بنتے ہیں، عمرانی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس سوال کو، جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین کی باہمی گفتگو کے انداز میں، بڑے دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ (اسے ضمناً سولہویں باب میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تصریح اس مقام پر

ضروری سمجھی گئی ہے)۔ سورۂ ابراہیم میں یہ کہا گیا ہے کہ قوم کے لیڈر جو نعماتِ خداوندی کی ناسپاس گذاری کرتے ہیں کاروانِ امت کو اس منڈی میں جا ٹھہراتے ہیں جہاں اس جنس کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ اور یہ عذابِ جہنّم ہے (۲۸ - ۲۹/۱۴)۔ لیکن وہ' اس سے' قوم کے عوام کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے اور تباہی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی۔ تم ان کی تقویت کا سامان بنے تو انہوں نے اس قدر تباہیاں مچائیں۔ اس لئے' یہ اور تم' دونوں مستحقِ جہنّم ہو۔ جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو عوام اس سے محفوظ نہیں رہتے۔ یہی نکتہ ان مکالمات کا محور ہے جنہیں قرآن نے اپنے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان لیڈروں میں' سیاسی لیڈر اور مذہبی راہ نما اور پیشوا سب شامل ہیں۔

سورۂ سبا میں ہے۔

> اگر تو اس منظر کو سامنے لائے جب یہ لوگ جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی' خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روی کا ایک دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے' عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔
>
> لیڈر کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو؟
>
> ان کے متبعین کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچھاتے تھے جس سے ہم سیدھے راستے کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا؟ (۳۱ - ۳۳/۳۴)۔

لیکن ان کا یہ عذر قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جاتا اور ان سب کو داخلِ جہنّم کر دیا جاتا ہے۔

سورۂ صافات میں ہے کہ جہنّم میں جانے والے

ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کر کے

ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کیا اختیار و اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستے پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ (تم صحیح راستے پر چلنا چاہتے تو ہمارے پاس کون سی قوت تھی جس سے ہم تمہیں مجبور کرکے غلط راستے پر ڈال سکتے تھے؟) ہم خود غلط راستے پر چل رہے تھے۔ تم نے ہمارا اتباع شروع کر دیا اور اس راستے پر چل نکلے۔ اب اس عذاب میں برابر کے شریک ہیں (۲۷-۳۳/۳۷)۔

اگلی آیت میں قرآنِ کریم نے ان سب کو برابر کا مجرم قرار دیا ہے۔

سورۂ مومن میں ہے۔

جہنّم میں متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے (اور تم ہمیں بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے) اب ذرا اس عذاب سے تو ہمیں چھڑا دو۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہم خود اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔ (اگر ہم میں تمہیں عذاب سے نجات دلانے کی قدرت ہوتی تو پہلے ہم خود ہی اس عذاب سے نہ نکل جاتے؟)۔ اب تو ہم سب کو یہ عذاب بھگتنا پڑے گا (۴۷-۴۸/۴۰)۔

سورۂ شعراء میں لیڈروں کو ابلیس اور ان کے متبعین کو "ابلیس کے لشکر" کہہ کر پکارا گیا ہے اور جہنّم میں ان کی باہمی گفتگو کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ابلیس کے لشکر، ابلیس سے کہیں گے کہ ہم نے بڑی غلطی کی جو خدا کے رب العلمین کا درجہ تجھے دے دیا۔ اصل میں ہمیں قوم کے مجرم طبقہ نے غلط راستے پر ڈال دیا۔ اب نہ ہمارا کوئی دوست اور مددگار ہے، نہ حمایتی اور سفارشی۔ اگر ہم کسی طرح ایک بار واپس دنیا میں جا سکیں تو پھر ہم خدا پر ایمان لا کر بتائیں۔ (۹۵-۱۰۲/۲۶)

سورۂ بقرہ میں ہے کہ

اس عذاب کو دیکھ کر مذہبی پیشوا جن کا اتباع لوگ کرتے تھے، ان سے فوراً بری الذمہ ہو جائیں گے (اور ان سے آنکھیں پھیر لیں گے)۔ اس پر ان کے متبوعین (پیچھے چلنے والے) باصد حسرت کہیں گے کہ اس وقت تو ہمارا بس نہیں چلتا۔ اگر ایک بار کہیں دنیا میں پھر سے جانا ہو جائے تو ہم تمہیں بتائیں کہ آنکھیں کس طرح پھیری جاتی ہیں۔

(قرآن کہتا ہے کہ) یوں ان لوگوں کے اعمال، حسرت بن کر ان کے دلوں کو اندوہناک بنا دیں گے لیکن جہنم سے ان کا نکلنا نہیں ہو سکے گا۔ (۱۶۶ ـ ۲/۱۶۷)

دوسرے مقام پر ہے کہ جب ان عوام کو جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! وہ ہمارے (شہری اور دیہاتی) لیڈر اور مذہبی راہ نما جنہوں نے ہمیں تباہ کیا ہے انہیں ایک دفعہ ہمیں دکھا دے تاکہ انہیں ہم اپنے پاؤں تلے روند کر دل کا غبار تو نکالیں" (۴۱/۲۹)۔

ان مقامات میں لیڈروں اور ان کے متبوعین کی باہمی گفتگو کا ذکر ہے۔ لیکن قرآنِ کریم یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا میں قومیں بھی دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی، غلط راستے اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کے سلسلہ میں سورۃ اعراف میں ہے کہ

جہنم میں داخلے کے وقت ہر قوم، اپنی ہم رنگ قوم پر لعنت بھیجے گی حتیٰ کہ جب وہ سب اس میں اکٹھی ہو جائیں گی تو وہ قوم جو بعد میں آئے گی اس قوم کے متعلق جو اس سے پہلے آ چکی ہو گی، خدا سے کہے گی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! یہ ہے وہ قوم جس نے ہمیں غلط راستے پر ڈالا تھا، اسے دوہرا عذاب دے۔ (ایک ان کے اپنے جرائم کے بدلے میں اور دوسرا اس لئے کہ انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا)۔ جواب ملے گا کہ تم میں سے ہر ایک کو دوہرا عذاب ملے گا۔ (اس لئے کہ کوئی قوم بھی یہ کہہ کر چھوٹ نہیں سکتی کہ اسے دوسری قوم نے گمراہ کر دیا تھا۔ ہر قوم کو اپنا راستہ آپ منتخب کرنا چاہیئے تھا۔ اور دوسرے یہ کہ اگر تمہاری پیشرو قوم کا اثر تم پر پڑا تھا تو تمہارا اثر تمہارے بعد آنے والی قوم پر پڑا تھا۔ اس لئے ہر قوم دوہرے عذاب کی مستحق ہوتی ہے)۔

یہ سنکر، پہلی قوم بعد والی قوم سے کہے گی کہ تمہیں ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے جو ہمیں تو دوہرا عذاب ملے اور تمہیں اکہرا ہی ملے۔

اور خدا کہے گا کہ تم سب اپنے اپنے اعمال کے بدلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔

(۳۸ ـ ۷/۳۹)۔

دوسری جگہ ہے کہ "جہنم میں جانے والی قوموں میں سے کوئی قوم دوسری قوم کو دیکھ کر خوش نہیں ہو گی۔

اس لئے کہ ہر قوم دوسری قوم سے کہے گی کہ اس نے ان کے لئے یہ عذاب تیار کردیا ہے۔ اور اس طرح ہر قوم خدا سے کہے گی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! جس قوم نے ہمارے لئے جہنّم کی یہ آگ بھڑکائی ہے اسے دوہرا عذاب دے (۵۹ - ۳۸/۶۱)۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے غلط کاروں کا کس قدر عبرت آموز نقشہ کھینچا ہے!

اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کی باہمی گفتگو

قرآنِ کریم میں دو ایک مقامات پر اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے مکالمات کا بھی ذکر آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

> اہلِ جنّت، اہلِ جہنّم سے کہیں گے کہ ہم سے جو وعدے ہمارے رب نے کئے تھے ہم نے وہ تمام سچے پائے۔ (وہ سب کچھ مل گیا جس کا ہم سے وعدہ کیا جاتا تھا)۔ جن باتوں سے خدا نے تمہیں آگاہ کیا تھا، کیا وہ بھی سچ ہو کر تمہارے سامنے آگئی ہیں یا نہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہاں! ان میں کی ایک ایک بات حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔
>
> ان میں ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا کہ ظالمین، خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے محروم ہیں — یعنی وہ لوگ جو خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے اور چاہتے تھے کہ وہ سیدھا نہ رہے۔ اس میں پیچ و خم پیدا ہو جائیں۔ یہ لوگ حیاتِ اخروی کے قائل نہیں تھے۔
>
> اور اہلِ جہنّم، اہلِ جنّت سے پکار کر کہیں گے کہ خدا نے جو سامانِ زیست تمہیں مرحمت فرمایا ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی عنایت کردو یا پانی کا ایک چھینٹا ہی اِدھر چھینک دو۔ (تاکہ اس آگ کی تپش کچھ کم ہو)۔ وہ کہیں گے کہ یہ چیزیں ان پر حرام ہیں جنہوں نے قوانینِ خداوندی کی صداقت کا انکار کیا۔ جنہوں نے اپنے دین کو مذاق بنالیا۔ جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں الجھائے رکھا (۴۴ - ۷/۵۱)۔

سورۃ حدید میں ہے کہ منافقین اہلِ جنّت سے پکار کر کہیں گے کہ

> ذرا ہمارا انتظار کرو۔ ذرا رک جاؤ تاکہ تمہارے چراغوں سے ہم تھوڑی سی روشنی مستعار

لے لیں (تو اس طرح ہمارا راستہ بھی کسی حد تک روشن ہو جائے)۔ وہ کہیں گے کہ یہ روشنیاں کہیں سے مستعار نہیں ملا کرتیں۔ (یہ چراغ اپنے ہی اعمال کے تیل سے روشن ہوتے ہیں اور اعمال کا مقام سابقہ دنیا کی زندگی تھی۔ اس لئے تمہیں اس روشنی کے حصول کے لئے واپس دنیا میں جانا ہوگا (جہاں اب تم جا نہیں سکتے۔ اس لئے تمہارے راستے کس طرح روشن ہو سکتے ہیں!)۔

پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی — وہ دیوار جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔

وہ (منافقین) اہلِ جنت سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوا کرتے تھے۔ (پھر تم ہم سے اس طرح بے رخی کیوں برت رہے ہو!) وہ کہیں گے کہ (ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ کیا تم واقعی ہمارے ساتھ تھے؟ تمہاری حالت یہ تھی کہ بظاہر ہمارے ساتھ شامل تھے لیکن درحقیقت) تمہاری ذاتی مفاد پرستیاں تمہیں دھوکے میں رکھتی تھیں۔ تمہیں اس نظام کی صداقت پر شبہ تھا اس لئے تم (کنارے پر کھڑے) انتظار کرتے رہتے تھے کہ دیکھیں کس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے تاکہ اس کے ساتھ جا ملیں۔ اس لئے تمہاری خواہشاتِ نفس نے تمہیں دھوکا دے رکھا تھا — اور یہ بہت بڑا دھوکا تھا جس میں تم مبتلا تھے۔ تمہاری یہی حالت رہی تا آنکہ خدا کا فیصلہ آپہنچا (لہٰذا اب یہ کہنا کہ تم ہمارے ساتھ تھے خود فریبی ہے' اب تم اس عذاب میں ماخوذ رہو — اب تمہاری راہیں روشن نہیں ہو سکتیں)۔

(۵۷/۱۴ — ۱۳)

دو ہی گروہ

قرآنِ کریم نے انسانوں کے دو ہی گروہ بتائے ہیں۔ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ○ (۴۲/۷) ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں۔ اور یہ دونوں گروہ کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے (۱۴ — ۱۵/ ۴۷)۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ بڑے کامیاب اور فائز المرام ہوں گے (۵۹/۲۰) اور

اہلِ جہنّم بڑے ہی بدنصیب (۱۱ - ۱۲/ ۸۷)۔

اہلِ اعراف

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں کے دو ہی گروہ بتائے ہیں — ایک اہلِ جنت کا گروہ، اور دوسرا گروہ اہلِ جہنّم کا — لیکن سورۂ اعراف میں " اھلِ اعراف " کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے متعلق ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہوگا کہ وہ جنت میں بھیجے جائیں یا جہنّم میں. یعنی ان کا کیس (PENDING) ہوگا. قرآنِ کریم کی رُو سے یہ تصور صحیح نہیں. عدالتِ خداوندی (قانونِ مکافاتِ عمل) کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہاں مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو سکے اور ملزم کو (SUSPENSION) میں رکھا جائے.

اعراف کے معنی بلند مقام کے ہیں. اس لئے اہلِ اعراف وہ ہیں جو (اہلِ جنت میں سے بھی) باقیوں کے مقابلہ میں زیادہ بلند مدارج کے حامل ہوں گے. یہ اہلِ جنّت کا گروہ ہے جسے السّابقون اور المقرّبون کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۰-۱۱/ ۵۶). یہ لوگ اپنی اپنی جماعت پر بطور شاہد سامنے آئیں گے (۴/۴۱). اسی لئے کہا ہے کہ یہ لوگ انہیں ان کی پیشانیوں سے پہچان لیں گے (۴۷ - ۴۹/ ۷).

جن لوگوں کے متعلق (۴۶/ ۷) میں کہا گیا ہے کہ وہ ہنوز جنّت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن اس میں جانے کی آرزو رکھیں گے، تو یہ اس دنیا کے جنّتی معاشرہ کے ضمن میں ان لوگوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو جماعتِ مومنین اور نظامِ خداوندی میں شمولیت کے متعلق اپنے دل میں سوچ رہے ہوں گے (تفصیل ان امور کی جنّت کے عنوان میں ملے گی)۔

عذابِ جہنّم ابدی ہے

جہنّم کے متعلق ہمارے ہاں عام طور پر تصور یہ ہے کہ وہ ایک جیل خانہ ہے جس میں قیدی (مجرمین) اپنی سزا بھگتنے کے لئے بھیجے جائیں گے. جب وہ اپنی قید کی مدت ختم کرلیں گے تو پھر انہیں وہاں سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا. جو لوگ جیل خانہ کی مثال کو موزوں نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ جہنّم ایک ہسپتال ہے جس میں (گناہوں کے) مریض بھیجے جاتے ہیں. جب وہ شفایاب

ہوجاتے ہیں تو انہیں جہنّم میں بھیجدیا جاتا ہے۔ ایک مثال یوں دی جاتی ہے کہ جہنّم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں میلے کچیلے کپڑے چڑھائے جاتے ہیں۔ جب ان کی میل کٹ جاتی ہے اور وہ صاف ستھرے ہو جاتے ہیں تو انہیں جنّت میں بھیجدیا جاتا ہے۔

مثال کوئی بھی ہو، قرآنِ کریم کی رو سے یہ تصور ہی غلط ہے کہ جہنّم والے کسی وقت بھی وہاں سے نکل کر جنّت میں چلے جائیں گے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق اس دنیا کی زندگی میں انسان کو اس بات کا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ حسنِ عمل سے اپنی ذات کی اس قدر نشوونما کرلے کہ وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہوجائے۔ جس انسانی ذات میں اس قدر نشوونما پیدا ہوچکی ہوگی وہ، مرنے کے بعد، زندگی کی اگلی (بلند) منزل میں پہنچ جائے گی۔ اسے جنّت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس ذات میں اس قدر نشوونما (DEVELOPMENT) پیدا نہیں ہوگی اسے آگے بڑھنے سے روک دیا جائے گا۔ اسے جہنّم کی زندگی کہا جاتا ہے۔ جنّت میں، مزید عمل سے، اور آگے بڑھنے کا امکان ہوگا، لیکن جہنّم میں عمل کا امکان ہی نہیں اس لئے اس میں اپنی کمی پوری کرکے آگے بڑھ جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (مثال کے طور پر) یوں سمجھئے کہ زندگی کی یونیورسٹی میں، جو طالب علم ایک دفعہ امتحان میں فیل ہوجائے اسے امتحان میں بیٹھنے کا دوبارہ چانس (موقعہ) نہیں دیا جاتا۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح فیل شدہ طالب علم ہمیشہ کے لئے اسی طرح فیل شدہ رہ جاتا ہے۔ وہ اگلی کلاس میں جا ہی نہیں سکتا۔ یہی قانونِ ارتقا ہے۔ اس قانون کی رُو سے جو نوع، اپنی صلاحیّتوں کو نشوونما دے کر آگے نہیں بڑھ سکی، وہ ہمیشہ کے لئے زندگی کی اُسی منزل میں رہ گئی۔ یہی قانون انسانی زندگی پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اس لئے جہنّم نہ جیل خانہ ہے نہ ہسپتال۔ وہ سلسلۂ ارتقاء میں ایک مقام پر رک جانے کا نام ہے اسی لئے اسے جحیم کہا گیا ہے جس کے معنی روک دینے کے ہیں (۵۶/۹۴)۔ اس سے بھی اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ لہٰذا، جہنّم رُک جانے کا نام ہے اور یہ رک جانا ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس حقیقت کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ (مثلاً) سورۃ نساء میں جہنّم کے متعلق ہے۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا (۴/۱۶۹) وہ اس میں ابدی طور پر رہیں گے (۷۲/۲۳)۔ دوسری جگہ "جَهَنَّمَ" کے بجائے "سَعِيْرًا" کہہ کر کہا ہے کہ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا (۶۴-۶۵/۳۳)۔ ایک مقام پر اسے دَارُ الْخُلْدِ کہا گیا

ہے (۴۱/۲۸)۔ یعنی ہمیشگی کا گھر۔ سورۂ فرقان میں ہے۔ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵/۶۵) جہنم کا عذاب ایسا ہے جو چمٹ کر رہ جائے۔ الگ ہی نہ ہو۔ بعض جگہ اسے عَذَابٍ مُّقِيمٍ کہا گیا ہے (۵/۳۷؛ ۳۹/۴۰؛ ۴۲/۴۵) یعنی ہمیشہ رہنے والا عذاب اور عذاب الخلد بھی (۳۲/۱۴)۔ اہلِ جہنم اپنی خطاکاریوں کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (۴۰/۱۱) کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟ وہ پکار پکار کر کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں ایک دفعہ یہاں سے نکل کر کام کرنے کا موقع دیا جائے' پھر آپ دیکھئے گا کہ ہم کیسے اچھے کام کرتے ہیں۔ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ۝ (۲۳/۱۰۸) نیز (۳۵/۳۷) جواب ملے گا کہ اب زیادہ باتیں نہ کرو عمل کا وقت گزر گیا۔ اب تمہیں یہیں ذلت کی زندگی گذارنی ہوگی۔ لَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ۝ (۴/۱۲۱) اس طرح وہ وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۚ (۵/۳۷) وہ ہزار چاہیں گے کہ اس عذاب سے نکل جائیں لیکن وہ وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اس لئے کہ وہ عذاب ہمیشہ رہنے والا ہے۔ سورۂ حج میں ہے کہ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا ۖ (۲۲/۲۲) جب کبھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے انہیں اسی میں دھکیل دیا جائے گا۔ (نیز ۳۲/۲۰)۔ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ (۲/۱۶۷) وہاں سے کوئی بھی نکل نہیں سکے گا۔

جہنم سے نکلنا تو ایک طرف' اس کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ۝ (۴۳/۷۵)؛ (نیز ۴۰/۴۹) وہ عذاب ہلکا نہیں ہوگا اور اس طرح ان پر ابدی مایوسی چھا جائے گی ــــ "ابدی مایوسی" یہ ہے شدید ترین عذاب ــــ اور جوں جوں مایوسی بڑھتی جائیگی اس عذاب کی تلخی میں اضافہ ہوتا جائے گا (۳۰/۷۰)۔ اس مایوسی سے تنگ آ کر وہ چیخیں گے اور کہیں گے کہ ہمارا خاتمہ ہی کر دیا جائے۔

> وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ إِنَّكُم مَّاكِثُونَ ۝ (۴۳/۷۷)۔
> وہ جہنم کے داروغہ سے کہیں گے کہ خدا سے کہو کہ وہ ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ کہے گا کہ یہاں کسی کا خاتمہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے تمہیں اسی حالت میں رہنا ہوگا۔

عذابِ جہنم تو ایک طرف' وہ اپنے اعمال نامہ کو دیکھ کر کہیں گے کہ اے کاش! موت ہمارا خاتمہ کر دیتی

تو ہمیں یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے (۶۹/۲۷)۔ اس طرح وہ وہاں ہلاکت کو بار بار پکاریں گے لیکن وہ ہلاک نہیں ہوں گے (۱۳-۱۴/۲۵)۔ وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَیِّتٍ (۱۴/۱۷) اسے چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مر بھی نہیں سکے گا۔

اس ابدیت سے کیا مُراد ہے؟

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہنم کا عذاب ابدی ہے۔ (اسی طرح جنت کی زندگی کو بھی ابدی کہا گیا ہے۔ تفصیل آئندہ باب میں سامنے آئے گی)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ابدیت سے مراد کیا ہے؟

ایک ابدیت خدا کی ہے جس کی انتہا کوئی نہیں۔ زمان (TIME) کے اس تصور کو (جس میں انتہا کہیں نہ ہو یا جس میں ابتدا کہیں سے نہ ہو) ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمارا محدود ذہن اسی زمان کا تصور کر سکتا ہے جو ابتدا اور انتہا کے دو نقطوں کے درمیان واقع ہو۔ "لا ابتدا" اور "لا انتہا" کا زمان ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر کی شے ہے۔ اس قسم کی ابدیت (اور ازلیت) صرف خدا کے لئے مختص ہے ــــ صرف ایک خدا کے لئے ــــ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ غیر خدا کی ابدیت، بہر حال کسی نقطہ پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ خدا اور غیر خدا کی ابدیت کے اس لطیف (لیکن نہایت اہم) فرق کو سامنے لانے کے لئے ہمارے ہاں "سرمدیت" کی اصطلاح وضع کی گئی۔ خدا کی ابدیت کو سرمدیت کہا جاتا ہے اور سرمدیت میں کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ اس لئے جہنم کے عذاب کا خلود یا ابدیت، غیر منتہی نہیں۔ عربی زبان (اور خود قرآنِ کریم) میں "اَبَدًا" کا لفظ عرصۂ دراز کے لئے بولا جاتا ہے اور خلود کے معنی غیر متغیر رہنے کے ہیں۔ جنت کی زندگی کا خلود یہ ہے کہ وہ متغیر ہو کر جہنم میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور جہنم کی زندگی کا خلود یہ ہے کہ وہ متغیر ہو کر جنت میں بدل نہیں سکتی۔

عذابِ جہنم کے لئے خلود، ابد، مقیم وغیرہ الفاظ کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا (۷۸/۲۳)۔ احقاب (حقب کی جمع) کے معنی "قرنہا قرن" یا زمانہ دراز ہوتے ہیں یعنی وہ اس میں زمانہ دراز تک رہیں گے۔ یہاں سے ابدیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت سورۂ ہود کے ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ

رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ (۱۱/۱۰۷)۔

اہلِ جہنم اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان کا سلسلہ قائم ہے۔ یہ حتمی اور یقینی بات ہے۔ اور مشیّتِ خداوندی (خدا کے ارادے) نے ایسا طے کیا ہے۔

"مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ" (جب تک نظامِ کائنات قائم ہے) کا تعین کچھ بھی کیوں نہ کر لیا جائے اس سے اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ جہنم کا خلود اور ابدیت، خدا کی طرح لا انتہی نہیں۔ اس کائنات کا انجام کیا ہوگا۔ اہلِ جہنم کا مآل کیا ہوگا۔ (بلکہ یہ بھی کہ اہلِ جنت کی آخری منزل کیا ہوگی، کیونکہ اس کے لئے بھی مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ کے الفاظ آئے ہیں ۱۱/۱۰۸)۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہ دے سکتے ہیں (اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں)۔ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ ابدیت، خدا جیسی ابدیت نہیں۔

لیکن "جہنم کے زمانۂ دراز تک رہنے" سے مفہوم یہ نہیں کہ اہلِ جہنم، ایک مدت کے بعد، وہاں سے نکل کر جنت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ جب تک جہنم رہے گا اہلِ جہنم اس میں رہیں گے۔

ایک عظیم حقیقت

ہم نے دیکھ لیا کہ جس شخص نے اس دنیا میں، ایسے کام نہیں کئے ہوں گے جن سے اس کی ذات کی نشوونما ہو گئی ہو، وہ جہنم کی زندگی بسر کرے گا اور جہنم میں اس کا امکان ہی نہیں ہوگا کہ انسان اپنی حالت بدل لے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ انسان کے مستقبل کے لئے موجودہ زندگی کی اہمیت کس قدر ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک طالب علم کے مستقبل کا سارا دارومدار، امتحان پاس کرنے پر ہے اور امتحان میں شامل ہونے کا آخری چانس ہے۔ اب سوچئے کہ اگر وہ طالب علم، تیاری کے اس سال کا ایک لمحہ بھی ضائع کر دیتا ہے تو وہ اپنا کس قدر "ابدی نقصان" کرتا ہے۔ یعنی ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے حیاتِ آخرت کے مقابلہ میں، اس دنیا کی زندگی کی ہر متاع کو قلیل اور یہاں کی ہر جاذبیت کو کھیل تماشا قرار دیا ہے۔ اگر مستقبل سنوارنے کے لئے صرف ہو رہا ہے، تو ایک ایک سانس، عمرِ جاوداں سے زیادہ گراں بہا ہے اور اگر مستقبل بگڑتا ہے تو یہاں کی سب سے زیادہ گراں بہا متاع بھی خزف ریزوں سے زیادہ حقیر ہے۔

پھر سُن رکھئے کہ مستقبل سنوارنے کا موقع صرف اس دنیا کی زندگی میں ہے۔ اس کے بعد نہیں. اور اگر کسی نے اس موقع کو ضائع کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لئے جہنّم کے عذاب میں ماخوذ ہوگا جہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہوگی.

اور اس کے ساتھ ہی اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ کسی شخص کو اس کا علم و یقین نہیں ہو سکتا کہ اس کی دنیاوی زندگی کتنی باقی ہے. لہٰذا، وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پاس مستقبل سنوارنے کا عرصہ کافی ہے. اس میں سے اگر وہ کچھ حصّہ ضائع بھی کر دیتا ہے تو ہرج کی بات نہیں.

چانس آخری اور یہ معلوم نہیں کہ امتحان کا اعلان کس دن ہو جائے. اس لئے

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳/۱۳۲)

(تاخیر مت کرو اور) لپک کر جاؤ خدا کی طرف سے تیار کردہ اس پناہ گاہ کی طرف جو تمہیں عذابِ جہنّم سے بچاوے گی اور اس جنّت کی طرف لے جائے گی جس کی وسعت ارض و سما تک پھیلی ہوئی ہے اور جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلتے ہیں.

آیئے. اس سفر میں ہم بھی اُس جنّت کی طرف چلیں.

بیسواں باب

جنّت

تعارف

قرآنِ کریم نے جس طرح، کرب و اضطراب اور تباہی و بربادی کی زندگی کو "آگ کے عذاب" سے تشبیہ دے کر اسے جہنّم کی زندگی قرار دیا ہے' اسی طرح (اس کے برعکس) سکون و اطمینان' خوش حالی و سرفرازی اور عروج و اقبال کی زندگی کو جنّت سے تشبیہ دی ہے. لفظ جنّت کا مادہ (ج. ن. ن) ہے. جَنَّ کے معنی ہیں چھپا لینا. نگاہوں سے اوجھل کر دینا. عربوں کے ہاں جنّت اس باغ کو کہتے تھے جس کی زمین درختوں کی کثرت کی وجہ سے نظر نہ آئے. یعنی گھنا باغ. چونکہ عرب کی بے برگ و گیاہ' ریگستانی زمین میں جہاں دُور دُور تک پانی اور سبزہ کا نام و نشان تک نہ ہو' جنّت (باغ) ــ یعنی پانی' سبزہ' درخت' ان کا سایہ اور پھل ــ بے بہا نعمت تھی' اس لئے ان کے ہاں زندگی کی انتہائی کامرانیوں اور کامیابیوں' شگفتگیوں اور شادابیوں' راحتوں اور شادمانیوں کو اسی اصطلاح سے تعبیر کرتے تھے. اور ایک عرب ہی پر کیا موقوف ہے؟ دنیا کی ہر قوم' ہر ملک اور ہر زمانے میں' باغ کو سکون و راحت اور تازگی و شادابی کا مظہر قرار دیا گیا ہے. قرآن کریم نے اسی لئے "کامیاب زندگی کو باغ (جنّت) سے تشبیہ دی ہے.

اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کے تین گوشوں یا تین مراحل کا ذکر کیا ہے. مرحلہ اوّل انسان کی اُس زندگی سے متعلق ہے جب ہنوز اس کی تمدّنی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا. اُس وقت سامانِ رزق کی فراوانی تھی اور انسان "میری اور تیری" کی تمیز سے ناآشنا تھا. یہ وہ دَور تھا جس میں انسانی لغت میں "ملکیت" کا لفظ نہیں آیا تھا. تمتّع (استعمال یا فائدہ اٹھانے) کا تصوّر تھا. قرآنِ کریم نے

اسے "جنّتِ آدم" کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد اس کی تمدّنی زندگی شروع ہوئی تو انسانوں کے مفادات میں باہمی تصادم واقع ہوا جس سے پہلی زندگی کا دَور ختم ہوگیا۔ اس کے لئے اسے خدا کی طرف سے (بوساطت حضرات انبیائے کرامؑ) راہ نمائی دی گئی تاکہ یہ اپنی تمدّنی کو بھی جنّتِ ارضی بنالے۔ یہ جنّتِ ارضی، قرآنی معاشرہ کا دوسرا نام ہے جس میں نہ صرف سامانِ زیست کی فراوانی ہوگی بلکہ انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی گی۔

موت کے بعد، طبیعی زندگی کا ساز و سامان تو یہاں رہ جائے گا اور انسانی ذات آگے جائے گی جس ذات کی نشوونما ہوچکی ہوگی وہ زندگی کی بلند ارتقائی منزل میں داخل ہوجائے گی۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی جنّت کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔

قرآنِ کریم میں، "جنّتِ آدم" کا ذکر تو الگ آتا ہے لیکن اس کے بعد، صحیح انسانی معاشرہ اور آخرت کی کامیاب زندگی (یعنی جنّتِ ارضی اور جنّتِ اخروی) کا ذکر مخلوط طور پر کیا گیا ہے۔ لیکن غور د تدبّر سے، ان دونوں کا فرق بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جن نعماتِ جنّت کی تفصیل قرآنِ کریم میں آئی ہے، جنّتِ ارضی میں ان سے (وہی یا انہی جیسی کیفیت پیدا کرنے والی) مادّی اشیاء مراد ہیں، لیکن جنّتِ اُخروی کے سلسلہ میں ان کے مجازی معنی لینے چاہئیں۔ یعنی سمجھنا یہ چاہیئے کہ یہ ایک کیفیت کا نام ہے جس کا ہم، اپنے شعور کی موجودہ سطح پر، احساس و ادراک نہیں کرسکتے، اس لئے اسے تشبیہات و استعارات کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ زندگی، اس دنیا کی زندگی کی سی مادّی زندگی نہیں ہوگی، اس لئے اس سے متعلق تفاصیل کو مادّی پیکروں میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ انہیں کیفیات سمجھنا چاہیئے۔ (جہنّم کی طرح، اُخروی جنّت بھی کسی مقام کا نام نہیں کیفیت کا نام ہے۔

جنّت کا بیان تمثیلی ہے

سورۂ رعد میں ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۱۳/۳۵)

جس جنّت کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ (ایک باغ ہے جسے) آبِ رواں سیراب کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کبھی پژمردہ اور خشک نہیں ہوتا۔ اس کے درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے اور پھل بھی۔ یہ متقیوں کے انجام کی بات ہے۔ باقی رہے کفار' سو ان کا انجام' آگ کا عذاب ہے۔

اسی طرح سورۂ محمدؐ میں بھی کہا گیا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ...... (۴۷/۱۵) جس جنّت کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ اس کا پانی رواں رہتا ہے جس کی وجہ سے اس میں سڑاند پیدا نہیں ہوتی۔ (وہاں کے رزق پر لوگ بند لگا کر نہیں بیٹھ جاتے) اور دودھ کی ندیاں جس کا ذائقہ بگڑتا نہیں' اور خمر کی ندیاں جس کی لذّت بڑی ہی خوشگوار ہے اور نہایت صاف و شفاف شہد کی ندیاں اور ہر قسم کے پھل اور سامانِ حفاظت ..... (خمر کے متعلق دوسرے مقامات میں ہے کہ اس سے نشہ اور شراب مراد نہیں)۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۳/۱۳۲) ایسا باغ جس کی

وسعتِ ارض وسمٰوٰت (جملہ کائنات) کو محیط ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۵۷/۲۱) اس کا عرض، زمین اور آسمان کے عرض کی مثل ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ اس کے چشموں کے متعلق کہا کہ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ○ (۷۶/۶) اللہ کے بندے پیتے ہیں اس چشمے سے جسے وہ خود پھاڑ کر نکالتے ہیں یعنی وہ چشمہ ان کے اپنے قلب کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے، کہیں خارج میں واقع نہیں ہوتا۔ اس چشمے کو سلسبیل کہتے ہیں (۷۶/۱۸)۔ سلسبیل (سل + سبیل) کے معنی ہیں جو راستہ پوچھتے ہوئے خود بخود آگے بڑھتا چلا جائے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۳۲/۱۷)۔

کوئی شخص (اپنے شعور کی موجودہ سطح پر) نہیں جان سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا وہ سامان جو اس وقت اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے، کیا ہے؟ وہ اس کے اعمال کا فطری نتیجہ ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ جنتِ اُخروی کی کُنہ وحقیقت اور ماہیت وکیفیت کو ہم اس زندگی میں سمجھ نہیں سکتے۔ ہم، اس کے تمثیلی بیان سے، بس کچھ اندازہ سا کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ان تشبیہات واستعارات کے الفاظ تو ہماری (عربی) زبان کے ہیں لیکن ان کا مفہوم مجازی ہے۔ شکوک وشبہات کے تمام کانٹے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دینے سے ابھرتے ہیں۔

جنّتِ آدم

قرآنِ کریم میں بیان کردہ قصّۂ آدم کسی ایک فرد (یا ایک جوڑے) کا قصّہ نہیں، وہ نوعِ انسان کی تمثیلی داستان ہے جس میں آدم، مردوں کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کی رفیقۂ حیات (قرآن میں حوّا کا نام نہیں آیا) عورتوں کی نمائندہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے، انسانیّت کے ابتدائی دَور کی زندگی بڑی سادہ اور جگرپاش مشقّتوں سے دُور تھی۔ سامانِ رزق کی فراوانی تھی۔ "میری اور تیری" کا کوئی جھگڑا نہیں تھا ــــــ جسے بھوک لگے، وہ جہاں سے جی چاہے، پیٹ بھر کر کھالے۔ (اس میں "جہاں سے جی چاہے" کی عمومیت بڑی اہم ہے)۔ خوراک، لباس، مکان ـــ یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی ـــ ہر ایک کو بلا مشقّت اور بغیر کسی پریشانی کے میسّر تھیں۔ باہمی جھگڑے نہیں تھے۔ مفادات کا تصادم نہیں تھا۔ اس کے بعد، انسان کے دل میں، انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ اُبھرا، اس کا بنیادی محرّک اولاد کے مستقبل کا تصوّر تھا۔ یعنی اب "بنی آدم" (نوعِ انسان) کی جگہ ہر ایک کو اپنی اپنی اولاد کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اس لئے ہر ایک نے اپنے لئے سمیٹنا شروع کر دیا۔ اسے قرآن نے "فسونِ ابلیسی" سے تعبیر کیا ہے[1] (قرآنی تصوّر کے مطابق، شیطان یا ابلیس، انسان

---

[1] بائبل میں کہا گیا ہے کہ خدا نے پیدا تو آدم ہی کو کیا تھا لیکن جب وہ اکیلا اداس ہونے لگا تو اس کی پسلی سے عورت کو پیدا کر دیا تاکہ وہ اس کے بہلاوے کا سامان بنے۔ پھر شیطان نے عورت (حوّا) کو بہکایا اور عورت مرد کی لغزش کا باعث بنی۔ اس لئے دنیا میں تمام گناہوں کا سرچشمہ عورت ہے۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں باتوں کی تردید کی ہے۔ اس نے مرد اور عورت دونوں کی یکساں پیدائش کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور دونوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ اس لئے گناہوں کا سرچشمہ عورت نہیں۔

کے ان جذبات کا تشبیہی نام ہے جو وحی کی راہ نمائی سے بیباک ہو کر اپنی تسکین چاہتے ہیں)۔ اس سے انسان کی اخوت واشتراک کی زندگی، انفرادیت اور عداوت میں بدل گئی اور یوں وہ جنت اس سے چھن گئی۔ اب اس جنت کو دوبارہ حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان، خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی روشنی میں اپنے معاشرہ کو متشکل کرے۔ اس سے پھر پوری نوعِ انسانی، ایک عالمگیر برادری بن جائے گی جس میں اخوت واشتراک کی زندگی ہوگی۔ چونکہ اب یہ زندگی انسان کی اپنی متشکل کردہ ہوگی اس لئے اس سے اس کی طبیعی ضروریات پوری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے گی اور جب یہ نشوونما یافتہ ذات (مرنے کے بعد) آگے جائے گی تو وہاں بھی اس کی زندگی جنت کی ہوگی۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے، قصۂ آدم کا تمثیلی بیان جس کی تفاصیل، اس میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ چونکہ اس وقت موضوع "قصۂ آدم" نہیں بلکہ صرف "جنتِ آدم" ہے اس لئے ہم ان تفاصیل کی انہی شقوں کو سامنے لائیں گے جن میں اس جنت کا ذکر ہے[1]۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

> اور ہم نے آدم سے کہا کہ تُو اور تیری بیوی الجنّۃ میں رہو اور اس میں جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ۔ (یہ باہمی اشتراک کی زندگی ہے۔ اس لئے دیکھنا!) کہیں الگ الگ ہو جانے (مشاجرت) کا تصور تمہارے دل میں پیدا نہ ہو جائے (۲/۳۵)۔

اس کے بعد ہے کہ شیطان نے ان دونوں کو بہکا دیا جس سے مختلف افراد میں ذاتی مفادات کی (WEDGES) حائل ہو گئیں اور یوں وہ جنت کی زندگی آدمؑ سے چھن گئی (۲/۳۶)۔ اس پر آدمؑ بہت افسردہ اور نادم ہوا تو خدا نے کہا کہ تم سے لغزش تو ضرور ہوئی ہے لیکن یہ لغزش ایسی نہیں جس کا مداوا نہ ہو سکے۔ ہماری طرف سے تمہیں راہ نمائی ملتی رہے گی۔ تم میں سے جو لوگ اس کی روشنی میں اپنا معاشرہ متشکل کریں گے، وہ خوف و حزن سے مامون ہو جائیں گے (۳۷ — ۲/۳۸)۔

سورۂ اعراف میں بھی یہی تفاصیل ہیں، اس اضافہ کے ساتھ کہ وہاں مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا

---

[1] قصۂ آدم کی تفصیل، میری کتاب " ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان' اس فریب میں آگیا کہ اسے حیاتِ دوام' اولاد کی شکل میں مل سکتی ہے اس لئے وہ "بنی آدم" کی جگہ اپنی اپنی اولاد کے مفاد کے تحفظ کے پیچھے پڑ گیا جس سے وہ جنت باقی نہ رہی (۱۹ ـ ۲۵/۷). واضح رہے کہ قرآنِ کریم' بیوی بچوں کو مذموم قرار نہیں دیتا. وہ انہیں وجہِ جاذبیت بتاتا ہے. وہ کہتا صرف یہ ہے کہ تمہارے معاشرہ کا نظام ایسا ہونا چاہیئے جس میں ہر ایک کو ہر ایک کی پرورش کی فکر ہو' اپنے یا اپنی اولاد کے لئے سب کچھ سمیٹ لینے کا جذبہ غالب نہ آجائے.

سورۃ طٰہٰ میں' جنت کے سلسلہ میں آدم سے کہا گیا کہ

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ (۱۱۸ ـــ ۲۰/۱۱۹)

اس میں تمہیں اس بات کی ضمانت حاصل ہے کہ تمہیں نہ بھوک ستائے گی نہ لباس کی فکر پریشان کرے گی' نہ پیاس وجہِ اضطراب ہوگی نہ دھوپ سے محفوظ رہنے کے سامان (گھر) سے محرومی ہوگی. (اس میں تمہاری تمام بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی).

اگر تم انفرادی مفاد پرستی کے ابلیس کے فریب میں آگئے تو وہ ایسی حالت پیدا کر دے گا جس میں تم ان چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے اور انہیں حاصل کرنے کے لئے تمہیں بڑی جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی (۲۰/۱۱۷).

اس کے بعد بتایا کہ آدم کس طرح فریب میں آگیا اور وہ جنتی زندگی اس سے چھن گئی. اسے بتایا گیا کہ اس سے بازیابی کی صورت یہی ہے کہ خدا کی راہ نمائی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کی جائے. اس سلسلہ میں کہا کہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ

مَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۝ (۲۰/۱۲۴)

جو شخص ہمارے ان قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن بھی ہم اسے اندھا اٹھائیں گے.

اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) اتباعِ قوانینِ خداوندی سے' انسان کو پھر سے وہی جنتِ ارضی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) جو لوگ ان قوانین سے اعراض برتیں گے ان کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اور

(۳) جس کی اس دنیا میں روزی تنگ ہو گی' اس کی عاقبت بھی خراب ہو گی۔

(اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر ملے گی)۔

جنّتِ اَرضی

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربوں کے نزدیک، باغات اور پانی (آبِ رواں) انتہائی خوشحالی اور شادابی کی زندگی کی علامات تھیں۔ ان کے نزدیک اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مخالفین رسول اللہؐ سے کہتے تھے کہ اگر آپ واقعی خدا کے رسول ہیں تو تَكُونُ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ‎(۱۷/۹۱)‏ تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک ایسا باغ ہونا چاہیئے جس میں پانی کی ندیاں رواں ہوں۔ اس کے جواب میں وحی نے کہا کہ یہ ایک باغ کہتے ہیں! خدا تمہیں اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کئی باغات (جنّٰت) عطا کرے گا۔ ان کے نیچے جاری پانی کی ندیاں بھی ہوں گی۔ وَيَجْعَل لَّكَ قُصُورًا ‎(۲۵/۱۰)‏ اور علاوہ ازیں، ان میں تمہارے لئے محلّات بھی ہوں گے۔ یہ ہے وہ جنت، جو صحیح نظامِ معاشرہ (ایمان و اعمالِ صالح) کے نتیجہ میں، اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔

اس جنت کے حصول کے لئے، حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقار کی جماعتؓ کو جس قدر جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کی زندگی بسر کرنی پڑی، قرآن کے صفحات اس پر شاہد ہیں۔ یہی تھا وہ سودا (تجارت) جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ

> اے جماعتِ مومنین! کیا میں تمہارے لئے ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کروں جو تمہیں غلط زندگی کے پیدا کردہ عذابِ الیم سے نجات دلا دے۔
>
> وہ تجارت یہ ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لا کر، اپنی جان اور مال سے اس کے راستے میں جہاد کرو۔ تم آخر الامر دیکھو گے کہ یہ مجاہدانہ تگ و تاز تمہارے لئے کس قدر نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔ اس سے تمہاری چھوٹی موٹی کوتاہیوں کے نقصان رساں نتائج

سے تمہیں حفاظت مل جائے گی اور وہ تمہیں ایسے باغات (جنّت) میں داخل کرے گا جن
کے نیچے پانی جاری ہوگا اور یہ تمہارے لئے بڑے ہی خوشگوار مساکن (رہنے کی جگہیں) ہونگے۔
یہ زندگی کی بہت بڑی کامرانی ہے (جسے حاصل ہو جائے)۔ (۱۰-۶۱/۱۲)

سورۂ توبہ میں ایمان، ہجرت اور جہاد کے نتیجے میں کہا کہ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۙ (۹/۲۱)۔

اس جہاد (مسلسل تگ و تاز) کے نتیجہ میں، انہیں، ان کے مخالفین کی زمینوں، ان کی بستیوں اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا گیا (۳۳/۲۷)۔ چنانچہ جب انہیں ایک نئی فتح حاصل ہوتی تھی تو وہ بارگاہِ خداوندی میں اپنا سرِ نیاز جھکا دیتے تھے۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (۳۹/۷۴)۔

اور کہتے تھے کہ کس قدر در خورِ حمد و ستائش ہے خدا کی وہ ذات جس نے ان وعدوں کو
جو اس نے ہمارے ساتھ کئے تھے، اس طرح پورا کیا اور ہمیں اس طرح ملک کا وارث بنا
دیا کہ ہمیں اس "جنّت" میں پورا پورا اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ کام کرنے والوں کا
یہ اجر کیسا عمدہ ہے؟

خدا کا یہ وعدہ وہ تھا جس کا ذکر سورۂ نور میں ان الفاظ میں آیا ہے کہ "جو لوگ ایمان لا کر اعمالِ صالح کرتے ہیں، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اس طرح حکومت عطا کرے گا جس طرح اس نے، ان شرائط کو پورا کرنے والی، اقوامِ سابقہ کو، حکومت عطا کی تھی (۲۴/۵۵)۔ اور یہی تھیں خدا کی وہ وعدہ ایفائیاں جن کی یاد، اس جماعت کو بعد میں دلائی جاتی تھی (۵/۱۱؛ ۸/۲۶)۔

لیکن یہ جنّت ایک دن میں حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے عملِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے:

وہ لوگ جنہوں نے (دل کے پورے عزم کے ساتھ) کہہ دیا کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ
ہے اور پھر اس عزم پر جم کر کھڑے ہو گئے، تو ان پر ملائکہ اترتے ہیں اور ان سے کہتے
ہیں کہ تم نہ کسی سے خوف کھاؤ اور نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تم اس جنّت کی بشارت لو جس

کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور یاور ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ جس جنت کی ہم تمہیں خوشخبری دے رہے ہیں اس میں تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گے اور جس کے لئے تمہارے دل میں آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں اور پھر ایسی عزت و تکریم کے ساتھ ملے گا جس طرح مہمان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے (۴۱/۳۲-۳۰)

دوسرے مقام پر جنت کا وعدہ دیتے ہوئے کہا کہ "خدا اپنے رسولؐ اور اس کے مومن رفقاء کو ذلیل و خوار نہیں ہونے دے گا" (۶۶/۸)۔ سورۂ یونسؑ میں ہے کہ "جنت میں ذلت اور روسیاہی نہیں ہوگی (۱۰/۲۶)۔

صلح حدیبیہ، جو فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی، کے ضمن میں جو سورۃ نازل ہوئی تھی اس کا نام ہی سورۂ الفتح ہے۔ اس میں جماعتِ مومنین کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ تم اس (بظاہر) دب کر صلح کرنے سے دل برداشتہ نہ ہو، خدا عنقریب تمہیں فتح عطا کرے گا۔ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ... (۴۸/۵) تاکہ وہ مومن مردوں اور عورتوں کو ان باغات (جنّٰت) میں داخل کرے جن کے نیچے آبِ رواں رقصاں ہے۔ اور تاکہ ان کے مخالفین کو شکست کا عذاب ملے (۴۸/۶)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجے میں اس دنیا میں بھی جنت حاصل ہو جاتی ہے اور جو لوگ اس طرح جنت حاصل کرتے ہیں، چونکہ ان کی ذات کی نشوونما بھی ہو جاتی ہے اس لئے انہیں آخرت میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے "دو جنتوں" کا ذکر کیا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (۵۵/۴۶) جسے اس بات کا احساس رہتا ہے کہ مجھے عدالتِ خداوندی میں کھڑے ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے اس کے لئے "دو جنتیں" ہیں — ایک اس دنیا کی جنت۔ ایک اخروی زندگی کی جنت — یہ بلند ترین مقام ہیں۔ اس سے دوسرے درجے پر اور جنتیں ہیں اور وہ بھی دو ہی ہیں (۵۵/۶۲)۔

ان تفاصیل کے بعد، وہ ہمارے جیسوں سے مخاطب ہوتا ہے جو خالی دعائیں مانگ مانگ کر جنت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

> کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم ان جاں گداز مراحل سے گذرے ہی نہیں ہو جن سے وہ لوگ گذرے تھے جنہوں نے تم سے پہلے جنت حاصل کی تھی۔ حالت ان کی یہ تھی کہ مخالفت کے ہجوم میں، سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔

ان کی شدّت سے ان کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسولؐ پکار اٹھتے کہ بارِ الٰہا!
ہماری کوششوں کے بارآور ہونے کا وقت، کب آئے گا. ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد
کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور تائیدِ خداوندی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی.
سو تمہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا ہوگا، تب کہیں جا کر جنّت ملے گی (۲/۲۱۴).

یہ تو اجتماعی زندگی کی جنّتِ ارضی کا ذکر ہے. قرآنِ کریم اس گھر کو جس میں میاں بیوی کے خیالات، نظریات، عقائد اور مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر ایمان کی بنا پر ہم آہنگی اور یک نگہی ہو، جنّت قرار دیتا ہے اور جس گھر میں باہمی تصادم ہو، اسے جہنّم بتاتا ہے (۲/۲۲۱).

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے. ہم نے (پہلے) قرآنِ کریم کی وہ آیت درج کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو خدا کے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا. اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک قوم مفلوک الحال ہے، تو کیا اس کے افراد محض مفلوک الحال ہونے کی وجہ سے جہنّم میں چلے جائیں گے؟ صورت یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ

(۱) اگر کوئی قوم کسی وجہ سے قعرِ ذلّت میں گر گئی ہے (یا غلط نظام کے تابع زندگی بسر کر رہی ہے) تو اگر وہ قوم اپنی اس حالت پر قانع ہو چکی ہے، تو وہ اس دنیا میں بھی جہنّم کی زندگی بسر کرتی ہے اور آخرت میں بھی جہنّم میں جائے گی.

(۲) لیکن اگر وہ قوم (یا اس کے چند افراد) اس زندگی پر مطمئن نہیں اور اسے بدلنے کے لئے جدّ و جُہد کرتے ہیں. تو وہ اگرچہ اپنی زندگی میں اس غلط نظام کو اُلٹ کر اپنی حالت میں تبدیلی پیدا نہ کر سکیں، لیکن ان کی اُخروی زندگی سنور جائے گی. خود نبیٔ اکرمؐ کے زمانے میں جو حضرات، اسلامی نظام کے تشکّل ہونے سے قبل، اس جدّ و جہد میں مصروف رہتے ہوئے اس دنیا سے تشریف لے گئے، ان کی اس دنیا کی زندگی بیشک عُسرت میں گذری، لیکن ان کے وارثِ جنّتِ اُخروی ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟

(۳) اس کے برعکس، ایک قوم فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کر کے، دنیاوی زندگی میں دولت و ثروت، حکومت و سطوت حاصل کر لیتی ہے، لیکن اگر وہ مستقل اقدارِ خداوندی کا اتباع نہیں کرتی تو اس کی اس دنیا

کی زندگی مرفہ الحالی کی ہوگی لیکن اخروی زندگی جہنّم کی ہوگی. حتّٰی کہ یہاں کی مرفہ الحالی بھی پائیدار نہیں ہوگی کیونکہ غلط نظامِ معاشرہ کی بنیاد میں تباہی مضمر ہوتی ہے۔

(۴) جو قوم اس دنیا میں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق معاشرہ متشکل کرلیتی ہے اس کی یہ زندگی بھی جنّت کی ہوگی اور اُخروی زندگی بھی جنّت کی. اس زندگی کی تمام شادکامیاں اس وقت تک ان کے حصّے میں آتی رہیں گی جب تک وہ اس نظام پر قائم رہے گی۔

اوپر (شق ۳ میں) جو کچھ کہا گیا ہے اس کی مثال میں قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں پیش کی ہیں. مثلاً قومِ عاد کے متعلق ہے کہ وہ جنّٰت و عیون میں زندگی بسر کرتی تھی (۲۶/۱۴۷). یہی الفاظ متقین کی کی جنّتی زندگی کے لئے بھی آتے ہیں (۱۵/۴۶). لیکن انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان پر تباہی آگئی (۲۶/۱۵۸). اسی طرح قومِ فرعون کے متعلق کہا کہ وہ بھی "جنّٰت و عیون" کی زندگی بسر کرتے تھے (۲۶/۵۷). لیکن جب انہوں نے سرکشی برتی تو انہیں وہاں سے (فلسطین سے) نکال دیا گیا اور ان کی جگہ انہی جنّٰت و عیون کے وارث بنی اسرائیل ہوگئے (۲۶/۵۹)؛ (۲۵ — ۴۴/۲۸).

اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دو ایک مقامات پر مثالوں کے ذریعے بھی واضح کیا ہے. سورۃ القلم میں ان باغ والوں کی مثال ہے جن کے درخت پھلوں سے لدے ہوتے تھے اور وہ انہیں توڑنے جارہے تھے لیکن اس کی سخت احتیاط برت رہے تھے کہ کوئی محتاج اس میں سے کچھ نہ لینے پائے، تو (قانونِ مکافاتِ عمل کی) ایسی بادِ سموم چلی کہ وہ سب باغ اکٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہوگیا (۱۲ — ۶۸/۱۶).

اسی قسم کی مثال سورۃ کہف میں بھی دی گئی ہے (۳۲ — ۱۸/۴۴). سورۃ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ کیا تم میں سے کوئی بھی اسے پسند کرے گا کہ اس کے پاس لہلہاتا باغ ہو جس کے درخت پھلوں سے لدے ہوں. وہ خود بوڑھا ہو جاتے اور اس کے بچّے چھوٹے چھوٹے ہوں اور اس باغ پر ایسی تباہی آجائے کہ اس کے درخت جل کر راکھ ہو جائیں. اور یوں نہ بڑھاپے میں اس کے لئے کوئی رزق کا ذریعہ رہے اور نہ ہی اس کے بچّوں کے لئے سامانِ زیست! (۲/۲۶۶).

ان مثالوں سے بھی واضح ہے کہ جنّتِ ارضی کی شادابیاں بھی صحیح نظام کے ساتھ وابستہ ہیں. غلط نظام سے یہ کچھ وقت کے لئے مل جاتی ہیں لیکن اس کے بعد اس نظام پر تباہی آجاتی ہے. بقاء و خلود اسی جنّت کے لئے ہے جو حسنِ عمل اور نظامِ صالح کے چشموں سے سیراب ہو۔

جنّت کی تفاصیل

اب ہم قرآنِ کریم میں بیان کردہ جنت کی تفاصیل کی طرف آتے ہیں. لیکن ان تفاصیل تک پہنچنے سے پہلے، چند ایک تمہیدی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے.

(۱) ان تفاصیل کا تعلق اس دنیا کی جنت سے بھی ہے. جہاں تک اُخروی زندگی کا تعلق ہے' اس کے ضمن میں ان تفاصیل کو صرف تشبیہات و استعارات سمجھنا چاہیئے اور ان الفاظ کے معنی لغوی یا حقیقی نہیں بلکہ مجازی لینے چاہئیں.

(۲) جہاں تک اس دنیا کی جنّتی زندگی کا تعلق ہے' ان الفاظ کے لغوی اور حقیقی معانی بھی لئے جا سکتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تہذیب و تمدن کے ہر دَور میں آسائش و زیبائش اور ثروت و سطوت کی تمام اشیاء بعینہٖ وہی رہیں گی. نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں' عربوں کے گرد و پیش' دو قدیم تہذیبیں عروج پر تھیں. یعنی ایران کی تہذیب اور روما کی تہذیب. عرب تاجران ممالک میں جاتے تھے اس لئے وہ ان کے ہاں کے سامانِ آسائش وغیرہ سے بخوبی واقف تھے. قرآن کریم نے انہی اشیاء کا ذکر عربوں کے لئے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "جنت کی یہ تمام نعماء" انہیں خود تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حاصل ہو گئی تھیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر دور کی "جنّتِ ارضی" کی اشیاء بعینہٖ اسی قسم کی ہوں. جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جائے گا' یہ اشیاء مختلف ہوتی جائیں گی. لہٰذا' ان کا بیان بھی تشبیہی سمجھا جائے گا. سورۃ بقرہ میں ہے کہ ایمان و عملِ صالح کے نتیجہ میں متشکل شدہ جنّت" تو وہی ہو گی لیکن ہر دَور میں' سامانِ رزق بعینہٖ وہی نہیں ہو گا بلکہ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (۲/۲۵) ملتا جلتا سا ہو گا.

(۳) جنّت کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس نے اسے فی الحقیقت "جنّت" بنا دیا ہے اور وہ یہ

کہ اس کی تمام نعمتیں ہر ایک کو یکساں طور پر ملیں گی۔ یہ نہیں کہ اس میں ایک طبقہ کو تو یہ تمام آسائشیں میسّر ہوں اور باقی لوگ بھوکے مر رہے ہوں۔ اس میں طبقات کی تقسیم نہیں ہوگی' اس میں صلاحیتوں کے اعتبار سے اختلافِ مدارج تو ہوگا لیکن آسائشوں کے اعتبار سے طبقات کی تقسیم نہیں ہوگی۔ یہی وہ جنّت ہے جسے قرآنی نظام اس دنیا میں متشکل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں کی جنّت' جنّتِ اُخروی ہی کا عکس ہوتی ہے۔

ان تمہیدی نکات کے بعد' دو ایک اصطلاحات کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

(۱) **ازواج**۔ ہمارے ہاں ازواج کے معنی بیویاں ہی لیا جاتا ہے — حتیٰ کہ زوجہ' بیوی کو کہا جاتا ہے لیکن زوج' خاوند کو نہیں کہا جاتا۔ لیکن عربی زبان (اور قرآنِ کریم) کی رُو سے' اس کے معنی وسیع ہیں۔ جب دو چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک کے بغیر دوسری کی تکمیل نہ ہو سکے تو ان میں سے ہر ایک کو دوسری کا زوج' کہتے ہیں۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیئے' ایک دوسرے کے زوج کہلائیں گے کیونکہ اگر ایک پہیہ نہ ہو (یا خراب ہو) تو دوسرا پہیہ بیکار رہ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے' ازواج کے معنی ہوتے ہیں ہم فکر و ہم رنگ رفقارِ کار۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں اور چونکہ قرآنِ کریم کے معیار کے مطابق' میاں بیوی کو سب سے زیادہ ہم آہنگ و یک رنگ ہونا چاہیئے۔ اس لئے میاں' بیوی کا زوج ہوتا ہے اور بیوی' میاں کی زوج۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو جنّتِ ارضی میں ازواج سے مراد ہم فکر و یک رنگ رفقاء بھی ہوں گے اور ہم مزاج و یک رنگ میاں بیوی بھی۔ لیکن جنّتِ اخروی کا تصوّر چونکہ مادّی نہیں اس لئے اس میں ازواج سے مراد ہم آہنگ رفقاء کے ہوں گے جن میں مرد اور عورتیں سب شامل ہونگے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس زندگی میں مرد اور عورت کی موجودہ (فطری) تخصیص علیٰ حالہ رہے گی یا اس کا انداز بھی کچھ اور ہوگا۔ بہرحال' اس زندگی میں ازواج سے ذہن جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ وہاں کی زندگی کی کیفیات کا ہم آج اندازہ و احساس نہیں کر سکتے۔

حُورِ عین

جنّت کے سلسلہ میں حور اور حورِ عین کا ذکر بھی آتا ہے اور اس سے بھی ہمارا ذہن' اُخروی جنّت

ہیں مرد اور عورت کے تعلقات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کوئی ایسی معیوب بات نہیں کہ اگر وہاں کی جنت میں بھی یہ سلسلہ باقی رہے تو ہمیں اس سے جھجک محسوس ہو۔ لیکن جب وہاں کی زندگی کی کیفیات کا ہم اس وقت اندازہ ہی نہیں کر سکتے تو اس کی تفاصیل کو مادی پیکروں میں سامنے لانا ہی نہیں چاہیئے۔ البتہ یہاں کی جنت کی زندگی' مادی پیکروں میں سامنے آئے گی۔

حور' یہ لفظ جمع ہے اور مذکر کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور مؤنث کے لئے بھی۔ اس کے ایک معنی ہوتے ہیں' ایسے لوگ (مرد یا عورتیں) جن کی آنکھ کی سفیدی نہایت صاف اور اس کی سیاہی نہایت گہری ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد' ان کے ہاں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جن کی سیرت بڑی پاکیزہ اور نگاہ بہت بلند ہو۔ چنانچہ کتبِ لغت میں اَحْوَرُ (جس کی جمع حور ہے) کے معنی (PURE AND CLEAN INTELLECT) کے لکھے ہیں۔ یعنی عقل حیلہ جو اور فریب کار نہیں' بلکہ نہایت پاکیزہ اور شفاف عقل جو کسی کو دھوکا دینا نہ سکھائے۔

عین' اسی طرح اَعْیَنُ کا لفظ (جس کی جمع عِیْنٌ ہے) خوبصورت آنکھ والے کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کا استعمال بھی مذکر و مؤنث دونوں کے لئے ہوتا ہے۔

لہٰذا "جنت کی حوروں" سے مراد خوبصورت عورتیں نہیں بلکہ نہایت پاکیزہ فطرت انسان ہیں جن کی عقل تیز تو ہو لیکن مکار نہ ہو۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ جہاں تک جسمانی خوبصورتی کا تعلق ہے' اس کے معنی خوبصورت' شفاف آنکھوں والے ہوں گے۔

أساورة۔ اس لفظ کا ترجمہ سونے کے جڑاؤ کنگن کیا جاتا ہے۔ جس طرح اکبر کے نورتن تھے' اسی طرح ایرانی شاہنشاہوں کے مقربین کا ایک خاص حلقہ ہوتا تھا جن کا مرتبہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا۔ انہیں' امتیازی نشان کے طور پر' بادشاہ کی طرف سے ایک خاص سونے کا کنگن ملتا تھا جسے سرداری کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے جنت کی زندگی میں سرفرازی و بلند مرتبگی کی علامت کے طور پر اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔

نہریں۔ قرآنِ کریم میں دودھ اور شہد وغیرہ کی نہروں (انہار) کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد کثرت اور فراوانی ہے' نہ کہ نہروں میں بہنے والا دودھ یا شہد۔ (ویسے بھی عربی زبان میں آبِ رواں کے لئے نہر کا لفظ آتا ہے جو ضروری نہیں کہ ہمارے ہاں کی مصطلحہ (CANAL) ہی ہو)۔

شراب۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ (WINE) یا (LIQUOR) کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔ لیکن عربوں کے ہاں اس سے مراد ہر پینے والی شے (مشروب) ہوتی ہے اور جنّت کے مشروبات کے متعلق اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ ان میں نہ نشہ ہوگا، نہ اضمحلال پیدا کرنے کی خاصیت۔

اصولاً اسے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جنّت 'مومنین کے معاشرہ کا نام ہے۔ اس لئے ہر وہ شے جو قرآن کریم کی رُو سے، حرام یا ممنوع ہے، وہ جنّت میں جائز نہیں ہوسکتی اور نہ ہی وہ چیزیں جن کا استعمال جنّت میں جائز ہوگا، اب حرام یا ناجائز ہوسکتی ہیں۔

اب آپ جنّت کی تفصیلات کی طرف آیئے اور اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آیئے کہ یہ تمثیلی بیان ہے نہایت پُرآسائش اور عزّت و اکرام کی زندگی کا اور اس کے اوّلین مخاطب تھے تیرہ سو سال پہلے کے بادیہ نشین عرب۔

۱۔ عام منظر

موسم نہ زیادہ سرد نہ زیادہ گرم، صاف اور شفاف پانی کی ندیاں رواں، چاروں طرف سبزہ گھنیرے سایوں کے سرسبز و شاداب درخت جن کی شاخیں پھلوں سے جھکی ہوئی اور پھولوں سے لدی ہوں۔ ان درختوں کے سائے میں، ندی کے کنارے، اعلیٰ درجے کے قالین اور صوفے بچھے ہوئے ہم مزاج ہم رنگ و یک آہنگ احباب کی پاکیزہ محفلیں، پرندوں کا گوشت کھانے کو، نہایت خوش ذائقہ مشروبات جنّت نگاہ و فردوس گوش سامانِ نشاط جس کا آل اضمحلال و افسردگی نہ ہو بلکہ اس سے انسانی صلاحیتوں کی برومندی ہو۔ دوسری طرف، عالیشان محلات جن میں حریر و اطلس کے پردے آویزاں۔ اعلیٰ درجے کے قالین۔ میزیں کرسیاں۔ بلوریں آفتابے۔ چاندی سونے کے ظروف۔ ہر قسم کا سامانِ راحت و سکون ــــ اور یہ ان کی اپنی محنت کا ماحصل جس میں تمام افرادِ معاشرہ "میری اور تیری" کے امتیازات سے بلند سب یکساں طور پر شریک۔

اس اجمال کی تفصیل قرآنِ کریم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

⁂

(۱) لباس. ظروف. سامانِ آرائش. رزق

سونے کے کنگن دبیز ریشم کے ملبوسات. اعلیٰ درجہ کے تختوں پر متمکن (۲۱/۱۸). گراں بہا موتی پہننے کو (۳۳/۳۵). زرنگار مرصّع تختوں پر تکیے لگائے' ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے کہ کسی کی طرف کسی دوسرے کی طرف پشت نہ ہو. ان کے بچّے زیورات سے مزیّن ان کے اردگرد پھرتے ہوں گے. وہ عندالضرورت آبخورے اور صراحیاں اور پیالے پیش کریں گے جو اعلیٰ درجہ کے مشروبات سے بھرے ہوتے ہونگے. ان مشروبات کے پینے سے نہ سرگرانی ہوگی نہ نشہ اور نہ ہی ان کی لذّت و سرور میں کمی ہوگی. کھانے کے لئے منتخب پھل اور حسبِ پسند پرندوں کا گوشت (۱۵-۲۱/۵۶)؛ (۴۲-۴۷/۳۷). وہ سب بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے اور کسی کے دل میں دوسروں کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جسے وہ ان سے چھپا کر رکھنا چاہے. نہ حسد' نہ کدورت' نہ کینہ نہ بغض' نہ اس میں مشقت ہوگی نہ تکان (۴۷-۴۹/۱۵). باغات. چشمے. پھل (۵۲-۵۵/۴۴). موسم ایسا جس میں نہ سخت گرمی نہ سخت سردی. درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی اور پھل اتنے قریب کہ ہر ایک کا ہاتھ ان تک پہنچ سکے[1]. چاندی کے ظروف. شیشے کے پیالے. ریشمیں ملبوسات. سرفرازیوں کے کنگن (۱۳-۲۲/۷۶)؛ (۲۳/۶۹).

باغوں کے بلند تختے. ان میں مرصّع تخت. خوبصورت پینے کے برتن قرینے سے چنے ہوئے. نرم و نازک تکیے. اعلیٰ درجہ کے قالین (۱۰-۱۶/۸۸). آبِ رواں کے کنارے' درختوں کے سائے تلے' ہم ذوق احباب کی "پکنک پارٹیاں" ہر ایک کے ذوق کے مطابق لذّتِ کام و دہن کا سامان (۵۵-۵۷/۳۶) سونے کے جڑاؤ کنگن اور ریشم کے ملبوسات (۲۳/۲۲). ایسے فرش جن کے ابرے تو ایک طرف' استر بھی ریشم کے ہوں گے. پھلوں میں اعلیٰ قسم کی کھجوریں اور انار شیریں' گراں بہا اور نادر قالین (۵۴-۷۵/۵۵). انگوروں کے باغات (تاکستان) (۳۲/۷۸).

---

[1] یہی تو جنّت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کے پھل ہر ایک کی دسترس کے اندر ہوں گے. ہر ایک کی ان تک رسائی ہوگی. بلکہ یوں کہیے کہ وہ ہر ایک کی جھولی میں خود آگریں گے. (ہر ایک کی خصوصیت قابلِ غور ہے). یہ ہے جنّتی معاشرہ کی خصوصیت!

ایسے پھل دار درخت جن میں کانٹے نہ ہوں۔ لمبے لمبے سائے۔ چشموں کا پانی جسے مشقت سے کھود کر نہ نکالنا پڑے۔ بڑی کثرت سے پھل جو سال بھر ملتے رہیں اور ہر ایک کے لئے یکساں طور پر موجود ہوں۔ کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہو۔ کوئی روکنے والا اور منع کرنے والا نہ ہو (۲۸-۳۳/۵۶)؛ (۴۱-۴۳/۷۷)۔

بلند صوفوں کی نشست؛ ان پر بیٹھنے والوں کے چہرے شگفتہ و شاداب؛ تروتازہ۔ پاکیزہ مشروبات جن پر مہریں لگی ہوں (یعنی جن میں خارجی آمیزش نہ ہو) اور وہ مہریں (SEALS) بھی مشک (و عنبر) کی (۲۸-۲۳/۲۳)۔

سامانِ زیست مسلسل و متواتر ملتا رہے گا (۶۲/۱۹) اور بڑی کثرت سے (۵۱/۳۸) اور اس کا ہر ایک کو علم ہوگا۔ یعنی اس میں رزق کے ذخائر چھپا کر نہیں رکھے جائیں گے اور ہر ایک کو یہ رزق نہایت عزت کے ساتھ ملے گا (۴۱-۴۲/۳۷)؛ (۱۹/۵۲)۔

(۲) مشروبات

(۱) صاف پانی کی نہریں جس کا مزہ نہیں بگڑے گا۔ دودھ کی نہریں جس کا ذائقہ تک خراب نہیں ہوگا۔ خمر کی نہریں جو بہت لذیذ ہوں گی۔ صاف کردہ شہد کی نہریں (۱۵/۴۷)۔

(۲) پاکیزہ پیالے (۳۴/۷۸)۔

(۳) سربمہر قرابوں میں بھرے ہوئے مشروب جن کی مہریں بھی مشک کی ہوں گی (۲۵-۲۶/۸۳)۔

(۴) ان مجلسوں میں ایسے پیالوں کا دور چلے گا جن میں ٹھنڈے اور جاری چشموں کا نہایت خوشگوار پانی ہوگا۔ ایسا مشروب جو دیکھنے میں برف کا سا سفید اور پینے میں بے حد لذیذ اور تاثیر ایسی لذیذ کہ نہ تو اس سے ہلاکت و سرگرانی ہو اور نہ ہی مدہوشی و بدمستی۔ نہ ہی اس کے کیف و سرور میں کمی ہوگی (۴۵-۴۷/۳۷)۔ (۲۳/۵۲)؛ (۱۹/۵۶)۔

اب ان مشروبات کی کیفیات و خصوصیات دیکھئے۔ سورۃ الدّھر میں ہے کہ

خدا کے آزاد بندے اس پیالے سے پئیں گے جس کا مزاج کافوری ہوگا؛ یہ اس چشمے سے حاصل کیا جائے گا جسے یہ لوگ (خود اپنے قلب کی گہرائیوں سے) نکال کر لائیں گے (۵-۶/۷۶)۔

اس سے ذرا آگے ہے۔

وہ اس پیالے سے پیئں گے جس کا مزاج "زنجبیلی" ہوگا. یہ اس چشمے سے حاصل کیا جائیگا
جسے سلسبیل کہتے ہیں (۱۶- ۱۸/ ۷۶).

"کافور" کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ وہ جسمِ انسانی کی بڑھی ہوئی حدت کو کم کرتا ہے اور "زنجبیل" کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حدت کی کمی کو دُور کرکے، جسم میں حرارت پیدا کر دیتی ہے. لہٰذا جنّت کے مشروب کی خاصیت یہ ہوگی کہ انسانی صلاحیتوں میں اعتدال پیدا کر دے گا ۔ جہاں حدت کی زیادتی ہوگی اسے کم کر دے گا جہاں کمی ہوگی اس میں اضافہ کر دے گا اور اس طرح (BALANCED PERSONALITY) وجود میں آجائے گی.

پھر اس چشمے کو (جو اس مشروب کا منبع ہے) سلسبیل کہا گیا ہے." سل ۔ سبیل' کے معنی ہیں راستہ پوچھتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا" (جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا) جنّت' ارتقائی سفر کا آخری مقام نہیں. وہ ان منازل میں سے ایک منزل ہے جہاں سے سفرِ حیات میں اور آگے بڑھنا ہے. اس لئے جنّت کے پانی کو آبِ رواں کہا گیا ہے اور اس میں جاری چشموں کا ذکر ہے (۸۸/۱۲). اسی کو سلسبیل کہہ کر پکارا گیا ہے. یعنی آگے بڑھتے چلے جانا ۔ بڑھتے چلے جانا.

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

ذرا آگے چل کر اس مشروب کو "شرابِ طہور" کہا گیا ہے (۷۶/۲۱). یعنی تمام آمیزشوں سے منزہ و پاکیزہ' خالص شرفِ انسانیت کا حامل اور احترامِ آدمیت کا ضامن.

سورۂ تطفیف میں کہا گیا ہے کہ وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۸۳/۲۷)." تسنیم" بلندیوں کو کہا جاتا ہے. یعنی جنّتی زندگی کے چشموں کا منبع بڑی بلندیوں پر ہوگا. ظاہر ہے کہ جس چشمے کا منبع بلندی پر ہو وہ اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھتا چلا جائے گا.

ان تشبیہات سے واضح ہے کہ جنّتی زندگی میں انسانی ذات میں صحیح صحیح اعتدال اور توازن ہوگا اور اس کی صلاحیتوں کا سرچشمہ اتنی بلندی پر ہوگا جس سے وہ (کسی خارجی سہارے کے بغیر، صرف) اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھتا چلا جائے گا." آگے بڑھنے" کا جذبہ انسان کے اندر ہے. کہا کہ وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ (۸۳/۲۵) جو آگے بڑھنا چاہے اسے چاہیئے کہ اس میدان میں آگے

بڑھے۔ اپنی ذات کی نشوونما کرے کہ وہ اعتدال و توازن کو ساتھ لئے ہوئے اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ زندگی کی تگ و تاز سے تو مقصود ہی یہ ہے کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷) "جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔"

"ایک دوسرے سے آگے بڑھنے" کے جذبہ سے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد پیدا ہوتا ہے لیکن جنّتی زندگی میں مسابقت (ایک دوسرے سے آگے نکل جانے) کا جذبہ محرّکہ حسد و رقابت نہیں ہوگا وہاں کیفیت یہ ہوگی کہ وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳؛ ۱۵/۴۷) ان کے دلوں میں کوئی ایسا جذبہ موجزن نہیں ہوگا۔

ازواجِ مطہّرات

"ازواج" کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی ہم آہنگ و یک رنگ رفقاء کے ہیں۔ ان رفقاء میں، میاں بیوی بھی شامل ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم کی رُو سے میاں بیوی کا رشتہ رفاقت کا ہوتا ہے۔ جنّتِ ارضی میں ازواج اور حورِ عین میں بیوی اور خاوند بھی شامل ہوں گے۔ جنّتِ اُخروی کے تمثیلی بیان کی رو سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کی رفاقت کی کنہ و حقیقت کیا ہوگی۔ یہی وہ ازواجِ مطہّرات (پاکیزہ رفقاء) ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جنّت کی زندگی کے متعلق کہا یہ ہے کہ اس میں یہ لوگ ہوں گے اور مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ (۱۳/۲۳) ان کے آباء اور ازواج اور اولاد میں سے بھی جو صالح ہوں گے (یعنی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر جنّت کے مستحق قرار پائیں گے) ان کے ساتھ ہوں گے۔ (نیز ۴۰/۸؛ ۵۲/۲۱)۔ انہی کو "ازواجِ مطہّرات" کہا گیا ہے (۲/۲۵؛ ۳/۱۴؛ ۴/۵۷)۔ کہیں صرف ازواج ہی کہا ہے (۴۳/۷۰)۔ اور کہیں حورِ عین۔ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ (۴۴/۵۴؛ ۵۶/۲۲؛ ۵۲/۲۰) ہم انہیں حورِ عین کا رفیق بنا دیں گے۔

عہدِ جاہلیت (زمانہ قبل از اسلام) میں عورت کی حالت یہ تھی کہ اسے سوسائٹی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا اور اسے اس قدر جاہل رکھا جاتا تھا کہ (قرآن کے الفاظ میں) وہ خود اپنا مقدمہ (کیس) بھی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتی تھی (۴۳/۱۸)۔ قرآنِ کریم نے عورت کو معاشرہ میں شرف و مجد کا بلند مقام عطا کر دیا۔

اور تعلیم و تربیت سے اس میں ایسا تغیر پیدا ہو گیا کہ وہ فصیح البیان ہو گئی۔ جنّتی معاشرہ میں عورتوں کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے متعلق کہا کہ وَ فُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ ؕ وہ بلند مرتبہ بیگمات ہیں۔ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ۙ فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡکَارًا ۔ ہم نے ان کی ایسی تعلیم و تربیت اور پرورش کی جس سے وہ گویا ایک نئی مخلوق میں تبدیل ہو گئی عُرُبًا اَتۡرَابًا ۙ (۵۶/۳۴-۳۷) وہ سب ایسی ہو گئیں گویا ان کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے اور وہ ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہیں۔ (نیز ۳۳/۷۸)۔ ہم گل، ہم مزاج، تربیت یافتہ، فصیح البیان، شرف و مجد کی حامل خواتین قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ (۳۸/۵۱) شرم و حیا کی مجسمہ۔ ایسی جنہوں نے کبھی اپنی نگاہوں کو بیباک نہیں ہونے دیا۔ (نیز ۳۷/۴۸)۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ۚ (۵۵/۵۶) ایسی پاکیزہ سیرت کہ شادی سے قبل، اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی نے انہیں چھوا تک نہیں۔ گہر تابدار جیسی پاکیزہ و شفاف (۵۵/۵۸)۔ سیرت و صورت دونوں اعتبار سے پاکیزہ و شاداب (۵۵/۷۰-۷۲)۔ ایسی پاکیزہ جیسے صدف میں موتی (۳۷/۴۸-۴۹)۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے کہ جس معاشرہ میں شادی کے وقت ہر نوجوان (لڑکے اور لڑکی) کو اس کا پورا پورا اطمینان ہو کہ اس کے ہونے والے رفیق نے اس سے قبل کسی کو غلط نگاہ سے دیکھا تک نہیں اور پھر یہ اطمینان اور یقین ساری عمر بدستور قائم رہے اس معاشرہ کے جنّتی ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے!

ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ ۚ

سورۃ الرحمٰن میں اس دنیا اور آخرت، دونوں کی جنّتوں کے متعلق ہے کہ وہ ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ ہیں۔ وَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ.... ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ ۚ (۵۵/۴۶-۴۸) یعنی یہ جنّتیں مختلف فنون پر مشتمل ہوں گی۔ انسانی زندگی تنوع چاہتی ہے اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کے اظہار اور استعمال کے متعدد گوشے ہیں۔ ان گوشوں کے لئے قرآن کریم نے جنّت کو ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ کہا ہے۔ (اس کے بعد اس سورۃ میں جنّتی زندگی کی آرائش و آسائش کے متعدد گوشے سامنے لائے گئے ہیں)۔ اس لئے جنّت کی زندگی ایسی نہیں کہ اس میں "کھایا پیا اور سو گئے" کی کیفیت ہو۔ وہ زندگی شاخ در شاخ علوم و فنون کی حامل ہو گی۔ چنانچہ اس زندگی کو فَرَوۡحٌ وَّ رَیۡحَانٌ ۙ۬ وَّ جَنَّتُ نَعِیۡمٍ ﴿۸۹﴾ (۵۶/۸۹) کی زندگی

کہا گیا ہے۔ ہر قسم کی آسائش و مسرت کا سامان. ہر قسم کی شادکامیاں اور کامرانیاں. حتیٰ کہ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ٥ (۳۰/۱۵؛ ۴۳/۷۰). اَ تُحْبَرَةٌ میں حسن وجمال اور زیبائی و رعنائی. نیز نشاط و مسرت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں خواہ وہ جنت نگاہ ہوں یا فردوس گوش. اس میں آرٹ کے شاہکار بھی شامل ہوتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کی موسیقی بھی.

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ

جنتی زندگی کی ان تمام تفاصیل کو قرآن کریم نے اس حسین اجمال میں سمٹا دیا ہے کہ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ (۱۶/۳۱) انہیں اس میں جو چاہیں گے ملے گا. (نیز ۲۵/۱۶؛ ۲۱/۱۰۲؛ ۴۲/۲۲). جو کچھ چاہیں گے وہ ہوگا' اور جو کچھ مانگیں گے وہ ملے گا۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (۳۰–۴۱/۳۱). مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ (۴۳/۷۱) ہر وہ چیز جسے وہ چاہیں اور جس سے ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں.

ایک مقام پر' بات اس سے بھی آگے چلی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ٥ (۵۰/۳۵) وہ جو کچھ چاہیں گے وہ ملے گا. بلکہ ہمارے پاس ان کے لئے اس سے بھی زیادہ ہے. اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے. زندگی کی موجودہ سطح پر' انسان کی آرزوئیں کتنی ہی وسیع اور بزعم خویش لا انتہا کیوں نہ ہوں' وہ بہرکیف اسی دنیا کے تصور تک محدود رہیں گی. لیکن اُخروی زندگی تو اس سے کہیں بلند ہوگی۔ اس زندگی میں انسان کی آرزوئیں کیا ہوں گی' ان کا ہم آج احساس و تصور بھی نہیں کر سکتے. اسی لئے کہا کہ وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں ملے گا اور اس سے بھی کہیں زیادہ! یعنی وہ کچھ بھی جس کی یہ لوگ آج آرزو تک نہیں کر سکتے. اسی لئے کہا کہ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ (۵۱/۱۶؛ ۵۲/۱۸) جو کچھ ان کا نشوونما دینے والا انہیں دے گا وہ اسے لے لیں گے.

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

جنتی زندگی میں' نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن (۶/۴۸؛ ۷/۴۹؛ ۴۱/۳۰؛ ۴۳/۶۸؛ ۴۶/۱۳).

خوف، خارجی خطرات سے ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی کا نام ہے۔ لہٰذا جنّتی معاشرہ میں نہ خارجی خطرات وجۂ اندیشہ ہوں گے، نہ دل میں حزن و ملال ہو گا۔ حتیٰ کہ بڑے سے بڑا جانکاہ حادثہ (فزع اکبر) بھی ان کے دل میں کسی قسم کا اندیشہ پیدا نہیں کر سکے گا (۲۱/۱۰۳)۔ ان کے چہرے نزہت و نظافت سے معمور (۸۳/۲۴) اور اپنی محنت و مساعی کا ماحصل اپنے سامنے دیکھ کر شاداب و مسرور ہوں گے (۸/۸۸؛ ۸۴/۹)۔ حزن و ملال سے محفوظ و مامون ہونے کی وجہ سے قلبی طمانیت حاصل ہو گی جس کے لئے وہ بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکرانہ بجالائیں گے (۳۴/۳۵)۔

اس میں نہ جگر پاش مشقتیں ہوں گی نہ تھکا دینے والی زحمتیں (۴۸/۱۵؛ ۳۵/۳۵)۔ نہ افسردگی نہ پژمردگی (۴۷/۳۷)۔ فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ الرَّاضِيَةٍ (۲۱/۶۹) زندگی کامیابیوں سے ہم کنار اور شادکامیوں سے ہمدوش (۱۰۱/۷)۔ ایک عظیم مملکت جس میں آسائشوں اور راحتوں کے ساتھ ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں بھی حاصل ہوں (۲۰/۷۶)۔

امن و سلامتی کا معاشرہ

ان تمام آسائشوں اور توانائیوں کے باوجود، معاشرہ ایسا جس میں کوئی لغویات کہیں سے سنائی نہ دے۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۚ (۱۹/۶۲) نیز ۲۵۱ـ ۲۶/۵۶)۔ اس میں ہر طرف سے امن و سلامتی کی آوازیں فردوسِ گوش ہوں گی۔ کہیں سے کوئی لغویات کان میں نہیں پڑے گی۔ (نیز ۸۸/۱۱؛ ۳۵/۷۸)۔ ملائکہ سلامتی کی تہنیت آمیز دعاؤں سے ان کا استقبال کریں گے (۱۴/۲۴؛ ۳۲/۱۴؛ ۳۹/۷۳)۔ ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کی سلامتی کا آرزو مند اور خدا کے نظامِ ربوبیتِ عالمینی کو وجۂ حمد و ستائش بنانے کا داعی ہو گا (۱۰/۲۰)۔ سلامتی اور اس کے ساتھ امن (۱۵/۴۵)۔ جنت ہے ہی مقام امین (۵۱ ـ ۴۴/۵۵) اور دارالسلام (۶/۱۲۸)۔ جس میں ہر ایک کے لئے سلامتی کی حیات بخش آرزوئیں وجۂ شادابیٔ قلب و دماغ ہوں گی (۱۴/۲۳؛ ۷۵/۲۵)۔

رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ

ان تمام نعماء کے ساتھ (اور ان سب سے بڑھ کر) رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ (۳/۱۴) یعنی زندگی قوانینِ خداوندی کے ساتھ یکسر ہم آہنگ اور (حدودِ بشریت کے اندر) صفاتِ خداوندی کی ہم رنگ۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ (۵/۱۱۹؛ ۹/۱۰۰؛ ۵۸/۲۲)۔ اور یہ سب سے بڑی کامیابی و کامرانی — فَوْزُ الْعَظِیْمِ — ہے، جسے نصیب ہو جائے (۹/۷۲)۔ یہ ہے وہ جنّت جو ارض و سما میں پھیلی ہوئی ہے (۳/۱۳۲؛ ۵۷/۲۱) اور جو بہترین مستقر اور جائے قیام ہے (۲۵/۲۴؛ ۲۵/۷۶)۔

جزائے اعمال

وَ نُوْدُوْٓا۔ آواز آئے گی،

اَنْ تِلْکُمُ الْجَنَّۃُ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۷/۴۳)

یہ ہے وہ جنّت جس کے تم، خود اپنے اعمال کے بدلے میں، مالک بنائے گئے ہو۔

یہ جنّت نہ مانگے سے ملتی ہے نہ بطور بخشش۔ نہ کسی کی سفارش سے ملتی ہے نہ بطور انعام۔ یہ انسان کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ اس کے اپنے خونِ جگر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا

آسائشوں اور راحتوں کی زندگی سے انسان تساہل پسند اور کم کوش ہو جاتا ہے۔ اس لئے تقدیرِ امم یہ ہے کہ

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

لیکن جنّت کی زندگی کے سلسلہ میں قرآنِ کریم ایک ایسی حقیقت سامنے لایا ہے جس سے اس کی آسائشوں اور راحتوں کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے — سورۂ کہف میں پہلے جہنّم کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ (۱۸/۲۹)۔ مرتفق اس شے کو کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی اوپر کو اٹھے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ غیر قرآنی معاشرہ (جہنّم) میں جو آسائشیں میسر ہوتی ہیں ان سے

انسانیت اوپر کو نہیں اُٹھ سکتی' اس کے برعکس جنت کے متعلق کہا کہ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ٥ (۱۸/۳۱) یہ خوشگواریاں' انسانوں کے اوپر اٹھنے کا نہایت متوازن سہارا بنیں گی. یعنی ان سے ان لوگوں کی زندگی حیوانی پستیوں کی طرف نہیں جائے گی بلکہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے مائل بعروج ہو گی.

کس قدر مبارک و مسعود ہیں وہ آسائشیں جو انسانی زندگی کو بلندیوں کی طرف لے جائیں! یہ جنّتی معاشرہ کی خصوصیت ہے ـــــــــ اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی.

جنّت کس کیلئے ہے

ایک شخص ہر روز، صبح کے وقت سیر کرتا ہے. رفتہ رفتہ اس کی صحت اچھی ہوتی چلی جاتی ہے. اس کی یہ صحت کس بات کا نتیجہ ہے؟ اس کے عملِ مسلسل کا. یہی صورت جنّت کی ہے. جب ایک جماعت خدا کے ابدی قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے (کہ جسے ایمان کہا جاتا ہے) ان کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس سے اس دنیا میں جنّت کی نمود ہو جاتی ہے اور اس کوشش سے ہر فرد کی ذات پر جو صلاحیت بخش اثر مرتب ہوتا ہے اس کے مجموعی اثر سے اُخروی جنّت ظہور پذیر ہو جاتی ہے. لہٰذا جنّت نام ہے صحیح خطوط پر عملِ پیہم کے نتائج کا. قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔

جنّت تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے

سورۂ نحل میں ہے کہ ملائکہ مومنین سے کہیں گے کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (۱۶/۳۲) "تم اپنے اعمال کے بدلے جنّت میں داخل ہو جاؤ." دوسری جگہ ہے کہ جنّت جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ (۵۶/۲۴) ان کے اپنے کاموں کا نتیجہ یا بدلہ ـــ سورۂ زخرف میں ہے کہ اہلِ جنّت سے کہا جائے گا کہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (۱)(۴۳/۷۲)

یہ ہے وہ جنّت جس کا تمہیں، تمہارے اعمال کے عوض، وارث بنایا گیا ہے.

---

[۱] بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یا اسی انداز کے اور الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں. مثلاً (۵۲/۱۹؛ ۴۶/۱۴؛ ۶/۱۲۸؛ ۴۳/۷۲).

ایک مقام پر جنّت کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝ (۳۷/۶۱) کام کرنے والوں کو چاہیئے کہ ایسی چیز کے لئے کام کریں. سورۃ آلِ عمران میں ہے. وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (۳/۱۳۵) کام کرنے والوں کا یہ اجر کس قدر عمدہ ہے؟ (نیز ۲۹/۵۸). ایک جگہ اہلِ جنّت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسنِ عمل کو شرفِ پذیرائی حاصل ہوگیا (۴۶/۱۶). دوسرے مقام پر ہے بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ (۶۹/۲۴) جو کچھ تم نے ایامِ سابقہ میں کیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے. کہیں کہا کہ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (۷۶/۲۲) تمہاری کوششیں یوں نتیجہ خیز ہوئیں. اور کہیں یہ کہ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ (۸۸/۹) اہلِ جنّت اپنی کوششوں کے نتائج دیکھ کر خوش ہوں گے.

ایمان واعمالِ صالح کا نتیجہ

قرآنِ کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے. "ایمان واعمالِ صالح" مومن کی بنیادی خصوصیت بتائی گئی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ جنّت. اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۴۷/۱۲) یہ حقیقت ہے کہ خدا' ان لوگوں کو جو ایمان اور اعمالِ صالح کے حامل ہوں گے جنّت میں داخل کرے گا. اکثر مقامات پر مومنین کی خصوصیات بتا کر کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ (۲۳/۱۰-۱۱) یہ لوگ جنّت الفردوس کے وارث ہیں. یہ مقامات (جن میں جنّت کو ایمان وعملِ صالح کا نتیجہ بتایا گیا ہے) اتنے کثیر التعداد ہیں کہ ان سب کا درج کرنا مشکل ہے.

مُتَّقِيْن کے لئے جنّت

قرآنِ کریم کی ایک اصطلاح "مُتَّقِيْن" ہے. اس سے مراد ہیں وہ لوگ جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے کے لئے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں. انہیں بھی جنّت کا وارث قرار دیا گیا ہے. اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ (۶۸/۳۴) یہ حقیقت ہے کہ متقیوں کے لئے خدا کے ہاں خوشگواریوں کے باغات (جنّت) ہیں. کہیں ان کی خصوصیات بتا کر کہا گیا ہے کہ ان کا مقام جنّت ہے (۵۱/۱۵—۵۱/۱۹). اس قسم کی آیات بھی کثیر التعداد ہیں اس لئے ہم انہیں

بالاستیعاب بیان نہیں کرتے۔

مُحسِنِیْن کے لئے جنّت

کہیں انہیں مُحْسِنِیْن کہا گیا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق، حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ (۵۱/۱۶)۔ کہیں انہیں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا کہا گیا ہے (۱۰/۲۶)۔ یعنی وہ لوگ جو حسنِ عمل کے حامل ہیں۔ سورۃ مرسلٰت میں متقین اور محسنین، دونوں کے لئے جنّت کا ذکر ہے (۷۷/۴۱-۴۴)۔ یہ سب مومنین ہی کی مختلف صفات ہیں۔ یعنی خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے (۷/۴۳)۔ انہی کو بعض مقامات پر ابرار بھی کہا گیا ہے۔ یعنی حسنِ عمل سے جن کی ذات میں وسعت اور کشادگی پیدا ہو گئی ہو۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۸۲/۱۳ ؛ ۸۳/۱۸-۲۲)۔

اہلِ جنّت کو اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ بھی کہا گیا ہے۔ یعنی یُمن و سعادت کے مالک (۷۴/۳۹ ؛ ۶۹/۱۹ ؛ ۵۶/۲۷-۳۸ ، ۹۰)۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر یُمن و سعادت اور کیا ہو گی کہ انسان کی اس دنیا کی زندگی بھی خوشگواریوں اور سربلندیوں کی ہو اور اُخروی زندگی بھی شادابیوں اور سرفرازیوں کی۔

جنّت جہادِ مسلسل سے حاصل ہوتی ہے

جو شخص اسلام لاتا ہے (یعنی مسلمان ہوتا ہے) وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرتا ہے جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ اس نے اپنا مال اور جان سب خدا کے ہاتھ بیچ دیئے ہیں بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱) اور خدا اس کے عوض انہیں جنّت عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف (۹/۱۱۱) وہ عندالضرورت خدا کی راہ میں لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں اُتر آتے ہیں، پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں یا اپنی جان دے دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں جنّت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کو اس سے ذرا پہلے جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ سے تعبیر کیا گیا ہے (۹/۸۸)۔ یعنی اپنے مال اور جان سے، اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہنے والے (نیز ۶۱/۱۱-۱۲)۔ اسی لئے، ان لوگوں سے، جو اپنے معیاروں کے مطابق جنّت کے دعویدار بنتے ہیں، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جنّت یوں بیٹھے بٹھائے نہیں مل جایا کرتی۔ اس کے لئے

بڑے بڑے صبر آزما اور ہمت شکن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے (۲/۲۱۴ ؛ ۳/۱۴۱). جو ان جانکاہ مراحل میں ثابت قدم رہے وہ نعمائے جنّت سے ہمکنار ہوتا ہے (۴ ـ ۴۷/۶). اس کے لئے وہ سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جسے چھوڑ دینے کی ضرورت لاحق ہو، حتّٰی کہ اپنا گھر بار تک بھی. اور ہر قسم کی اذیت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہوتا ہے (۳/۱۹۴) ــ ایمان اور اس کے ساتھ استقامت، یہ حصول جنّت کے لئے لازمی شرائط ہیں ــ اس دنیا کی جنّت کے لئے بھی اور اُخروی جنّت کے لئے بھی (۴۱/۳۰ ؛ ۱۳ ــ ۴۶/۱۴).
اس کا عملی طریق یہ ہے کہ اس نظام کی اطاعت کی جائے جسے قوانینِ خداوندی کے مطابق سب سے پہلے حضور نبیٔ اکرمؐ نے قائم فرمایا اور آپؐ کے بعد آپؐ کے متبعین نے اسے جاری رکھا (اور جو اسے بارِ دیگر متشکل کریں) اسے "خدا اور رسول" کی اطاعت کہا جاتا ہے جو حصولِ جنّت کے لئے بنیادی شرط ہے (۴/۱۳ ؛ ۴۸/۱۷).
لہٰذا، حصولِ جنّت، انفرادی چیز نہیں. یہ ایک اجتماعی پروگرام ہے جس کے لئے ایک جماعت کی تشکیل ضروری ہے. اسی لئے کہا گیا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۚ (۲۹ ــ ۸۹/۳۰) میرے بندوں میں شامل ہو جا اور (یوں) جنّت میں داخل ہو جا. "اس کے بندوں میں شامل ہونے" کے لئے ضروری ہے کہ انسان ذاتی مفادات سے بلند ہو جائے اور اپنے جذبات کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھے (۴۰ ــ ۷۹/۴۱). اس راہ میں اگر کہیں غلط قدم اٹھ جائے تو اس سے فوراً پیچھے ہٹ کر صحیح راستہ پر آجائے. اسے توبہ کہتے ہیں (۸/۶۶). یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہوتے ہیں اور یہی جنّت کے مستحق قرار پاتے ہیں (۵/۱۱۹). اس لئے کہ اس پروگرام سے ان کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر لیتی ہے جس سے وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے. تزکیۂ نفس سے یہی مراد ہے. یہ خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا، جنّتی معاشرہ میں حاصل ہوتا ہے (۲۰/۷۶). یہی وہ معاشرہ تھا جسے نبیٔ اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاء نے جہدِ مسلسل سے قائم کیا تھا (۹/۱۰۰). یہ لوگ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتے تھے جو نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتے تھے (۵۸/۲۲). یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اصحابِ رسول اللہؐ (مہاجرین و انصار اور ان کا اتباع کرنے والوں) کے متعلق خصوصیت سے کہا کہ اہل الجنّت ہیں (۹/۱۰۰).

عالمگیر انسانیت کے لئے جنّت

اس جنّت کے دروازے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں. جو بھی اس جماعتِ مومنین

کے زمرے میں شامل ہوگیا، جنّت کا مستحق بن گیا خواہ وہ پیدائش یا سابقہ مذہب کے اعتبار سے کوئی بھی ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ (۲/۱۱۱) یہ کہتے ہیں کہ جنّت میں صرف یہودی اور نصاریٰ داخل ہو سکیں گے، یہ ان کی خوش فہمی ہے جس کی ان کے پاس کوئی سند و دلیل نہیں۔ بَلٰی۔ بات یوں نہیں جس طرح یہ کہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۱۱۲) جو شخص بھی اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دے اور حسن کارانہ انداز سے (قرآن کے مطابق) زندگی بسر کرے، اس کا اجر اس کے رب کے ہاں سے ضرور ملے گا۔ ان لوگوں پر نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ یہ دعوت اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب سب کے لئے عام تھی (اور عام ہے) (۵/۶۵ ؛ ۵/۸۵)۔

مردوں اور عورتوں سب کے لئے جنّت

اور اس میں مردوں اور عورتوں کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ جنّت کے دروازے ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (۴/۱۲۴ ؛ ۴۰/۴۰ ؛ ۳/۱۹۴) جو بھی عملِ صالح کرے اور وہ مومن ہو ۔ خواہ مرد ہو یا عورت ۔ وہ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کے اعمال کے نتائج میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ جنّت کا وعدہ مومنین اور مومنات دونوں سے ہے (۹/۷۲ ؛ ۴۸/۵)۔ دونوں کے لئے ارتقاء کی راہیں یکساں طور پر کشادہ اور روشن ہیں (۵۷/۱۲)۔

یہی وہ جنّت ہے جس کی آرزو ہر مومن کے دل میں مچلتی ہے۔ حتّٰی کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے قلبِ مطہر میں بھی (۲۶/۸۵) اور غلط ماحول میں گھرے ہوئے اربابِ ایمان کے دل میں بھی (۶۶/۱۱)۔

متفرقات

(۱) جو شرک کرتا ہے ۔ یعنی خدا کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اقتدار بناتا اور ان کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے ۔ (اور اس حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے) اس پر جنّت حرام ہو جاتی ہے (۵/۷۲)۔

(۲) جو لوگ زبان سے قوانینِ خداوندی کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً ان کی تکذیب کرتے ہیں، نیز وہ جو ان سے سرکشی برتتے ہیں، جنّت میں نہیں جا سکتے (۷/۴۰)۔

(۳) انسان دو ہی گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک جنّت کا مستحق، دوسرا مستوجبِ جہنّم (۷/۴۲) اور یہ دونوں گروہ کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے (۵۹/۲۰)۔ اہلِ جنّت کی زندگی کامیاب و کامران ہوتی ہے (۵۹/۲۰؛ ۳/۱۸۴)۔ یہ بہت بڑی (ACHIEVEMENT) ہے۔ یعنی جنّت صرف عذاب سے محفوظ رہنے کا نام نہیں جسے نجات کہتے ہیں یہ تو ایک منفی خصوصیت ہوتی ہے۔ جنّت، مثبت طور پر بہترین نتائج حاصل کرنے کا نام ہے۔ یہ، موجودہ زندگی سے بہتر زندگی گذارنا' اور جو کچھ انسان اس وقت ہے' اس سے بہتر بن جانا ہے۔ یہ موجودہ سطحِ زندگی سے' بلند سطح پر پہنچ جانا ہے۔

(۴) اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے درمیان بس ایک پردہ سا حائل ہوتا ہے — یعنی قلبی کیفیت اور انسانی ذات کی تفریق کا پردہ — (۷/۴۶)۔ یہ ایک ایسی دیوار ہوتی ہے جس کے اندر کی طرف رحمت ہوتی ہے اور باہر عذاب (۵۷/۱۳)۔

(۵) قرآنِ کریم میں اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے باہمی مکالمات کا بھی ذکر آیا ہے اس کی تفصیل "جہنّم" کے عنوان میں گذر چکی ہے۔ (دیکھئے ۷/۴۴؛ ۷/۵۰؛ ۵۰ — ۳۷/۵۱؛ ۱۳ — ۵۷/۱۴؛ ۴۰ — ۴۲/۴۶)۔

اَبَدِی جَنّت

ایک جنّت "آدم" کی تھی جو اس کے اپنے کاموں (اعمال) کا نتیجہ نہیں تھی ـــ محض فطرت کی بخشائش تھی ـــ نتیجہ یہ کہ آدمؑ سے ایک لغزش ہوئی اور وہ وہاں سے نکال دیا گیا۔

اور ایک جنّت وہ ہے جسے ابنِ آدم اپنے خونِ جگر کے عوض خریدتا ہے (یعنی وہ اس کے اپنے حسنِ عمل کا فطری نتیجہ ہوتی ہے)۔ اس سے اُسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ وَ مَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ٥ (۱۵/۴۸) وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ یہ فرق ہے "بخشش کے طور پر ملی ہوئی جنّت" اور اپنی محنت سے حاصل کردہ جنّت میں۔ اقبالؒ کے (شوخ) الفاظ میں:

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست، جناں چیزے ہست

کوئی شخص انسان کی صحت، قابلیت، صلاحیت کو اس سے چھین نہیں سکتا ـــ وہ خود ہی اسے ضائع کر دے تو اور بات ہے۔ جو کچھ "انسان کا ہے" اسے دوسرا چھین سکتا یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جو کچھ انسان خود ہے اسے نہ کوئی دوسرا نقصان پہنچا سکتا ہے نہ اس سے چھین سکتا ہے۔ انسان جو کچھ خود ہے، اس کا نام جہنّم اور جنّت ہے۔ اس لئے، اس طرح حاصل کردہ جنّت سے انسان کو کوئی نکال نہیں سکتا۔ اسی لئے کہا کہ اہلِ جنّت اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ٥ (۹۸/۸)[1] وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ٥ (۴/۱۲۲) یہ خدا کا پکا اور سچا وعدہ ہے اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟ وہ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ہے (۴۱/۸؛ ۸۴/۲۵؛ ۹۵/۶)۔ یعنی جو کبھی منقطع نہ ہو۔ نہ وہ خود وہاں سے نکلنا چاہیں گے۔

---

[1] قرآن کریم کی متعدد آیات میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا کہا گیا ہے۔ مثلاً (۵/۱۱۹؛ ۹/۲۲؛ ۹/۱۰۰؛ ۶۴/۹؛ ۶۵/۱۱)۔

اور نہ ہی وہاں کسی کو موت آئے گی (۵۸ ۔ ۵۹/۳۷ ؛ ۵۶/۴۴)۔

یہ تو اہلِ جنّت کے متعلق ہے (کہ وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے)۔ خود جنّت کے متعلق بھی کہا گیا کہ اس کی بہاریں ابدیت درکنار ہیں۔ قرآنِ کریم میں جنّت کی اوّلیں خصوصیت یہ بتائی ہے کہ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲/۲۵)[1] باغ، پانی نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہوتا ہے۔ جس باغ کے درختوں کے نیچے آبِ رواں ہر وقت موجود رہے اس کی تازگی اور شادابی میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ یہ تو وہاں کے درختوں کی سدابہار تر و تازگی کا عالم ہوگا۔ ان درختوں کے پھلوں کے متعلق کہا کہ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) وہ موسموں کی تبدیلی کے اثرات سے ناآشنا ہوں گے اس لئے ہر موسم میں پھل دیتے چلے جائیں گے۔ (نیز ۱۴/۲۵)۔ اعمالِ انسانی کے یہ وہ بلند و بالا اشجارِ طیّب ہیں جن کی جڑیں پاتال میں ہیں اور ان کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہیں (۱۴/۲۴)۔ اس لئے اہلِ جنّت کے رزق میں نہ کبھی ناغہ ہوگا نہ اس میں کمی واقع ہوگی (۱۹/۶۲؛ ۳۸/۵۴)۔ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۙ (۳۲ ۔ ۵۶/۳۳) بکثرت پھل، جن میں نہ تو خود انقطاع ہو اور نہ ہی ان سے کوئی رد کے۔

ابدیتِ جنّت سے مُراد

لیکن، جیسا کہ سابقہ عنوان میں وضاحت سے بتایا گیا ہے اُخروی زندگی کی ابدیت، خدا کی ابدیت جیسی لامتناہی نہیں ـــــ لامتناہیت تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے ہے کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرَةُ۔ اسی لئے جنّت کے متعلق بھی کہا کہ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ (۱۱/۱۰۸)۔

اہلِ جنّت اس میں رہیں گے جب تک ارض و سما کا سلسلہ قائم ہے۔ بالضرور ایسا ہی ہوگا۔ یہ خدا کا عطیہ ایسا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

یہی الفاظ جہنّم کے متعلق بھی آئے ہیں (۱۱/۱۰۷)۔ لیکن آخری الفاظ (عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ) اُس سلسلہ میں نہیں کہے گئے۔ اس سے ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ

---

[1] قرآنِ کریم میں یہ الفاظ بے شمار مقامات پر آتے ہیں۔

جنت بھی مقامِ راہ ہے ـــ منتہیٰ نہیں

جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں، زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، پیکرِ انسانیت تک پہنچی ہے. اس کے بعد اس نے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے ہیں. اب یہ ارتقاء انسانی ذات کا ہوگا. جس شخص کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر چکی ہوگی کہ وہ اس زندگی سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل قرار پا جائے، اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ جنت میں داخل ہوگیا (جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ رک جائے گا. اسے جہنم کی زندگی کہہ کر پکارا گیا ہے). رُکنے والے تو ایک مقام پر رُک جاتے ہیں، لیکن آگے بڑھنے والوں کے لئے میدان وسیع ہوگا. اس لئے اہلِ جنت کے لئے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے مواقع ہوں گے. یہ وجہ ہے کہ اہلِ جنت کے مختلف مدارج بتائے گئے ہیں ـــ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ (۵۶/۱۱-۱۰) سب سے آگے، سب سے زیادہ مقرب. ان کے بعد اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ (۵۶/۲۷) اربابِ یُمن و سعادت صفِ دوم میں.

پھر اہلِ جنت کے متعلق کہا گیا کہ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ (۶۶/۸)؛ (۵۷/۱۹) ان (کی پیشانی) کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں (بائیں) ان کے راستے روشن کئے جا رہا ہوگا اور ان کی آرزو یہ ہوگی کہ ان کا نور تکمیل تک پہنچ جائے ـ انہیں خدا کی طرف سے جنات کی خوشخبری دی جائے گی (۵۷/۱۲). یہاں جنّت (واحد) کی جگہ جنات (جمع) کا لفظ آیا ہے. اہلِ جنت کے حسنِ عمل کا نور، ان کے راستے روشن کرتا جائے گا اور اس طرح وہ ایک جنت سے آگے بڑھ کر دوسری جنت میں پہنچ جائیں گے. سورۂ زمر میں ہے. لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝ (۳۹/۲۰) ان کے لئے "غرف بالائے غرف" ہوگا. "غرف" کا لفظ بڑا وسیع المعنیٰ ہے. اس میں رفتار کی تیزی، ندی میں پانی کی کثرت اور روانی اور بالاخانہ کے اوپر بالاخانہ کی بلندی سب آجاتی ہے. لہٰذا اہلِ جنت کے متعلق کہا کہ ان کے لئے زندگی کی کشادگیاں اور فراوانیاں، سربلندیاں اور سرفرازیاں اور مدارج بالائے مدارج ہیں. وہ جوں جوں ارتقائی منازل طے کرتے جائیں گے، ان کا مقام بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا. لہٰذا جنت کی زندگی جمود اور تعطّل کی زندگی نہیں. وہ خود ایک میدانِ عمل ہے اس فرق کے ساتھ کہ اِس دنیا کی (جہنم کی) زندگی میں انسان کی ساری

توانائیاں اور صلاحیتیں، جسم کے لئے سامانِ پرورش کے حصول کی نذر ہو جاتی ہیں۔ جنّت کی زندگی میں انسان اس طرف سے یکسر مطمئن اور مامون ہوگا، اس لئے اس کی ساری صلاحیتیں، انسانی زندگی کے ارتقاء کی کوششوں میں صرف ہوں گی۔ کارگہ حیات کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ۝ (۷۴/۳۷)

یہ جہانِ عمل ہے جس میں انسان کو مختلف صلاحیتیں دے کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ "جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے، جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے"۔ اور جنّتِ اخروی کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ (۸۳/۲۶)

جس کے دل میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے، وہ اس میں آگے بڑھے۔

یوں انسانی زندگی آگے بڑھتی ـــ اور آگے بڑھتی ـــ اور طبقاً طبقاً بلند ہوتی چلی جائے گی (۸۴/۱۹)۔ اس کا منتہیٰ کیا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے ـــ نہ ہی شعور کی موجودہ سطح پر ہم اس کا ادراک ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کی ابتدا اسی موجودہ زندگی سے ہوگی۔ خوش بخت ہیں وہ جو اس نادر موقعہ کو غنیمت سمجھیں اور اپنے قصرِ جنّت کی بنیاد کی اینٹ اپنے حسنِ عمل کے ہاتھوں، بلاتوقف و بلاتاخیر رکھ دیں کہ یہ موقعہ دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں کہ اُخروی زندگی اسی کی سنورے گی جس کی اس دنیا کی زندگی سنوری ہوئی ہوگی۔ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (۱۷/۷۲) جو یہاں اندھا ہوگا وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا، بلکہ اس سے بھی گیا گذرا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے